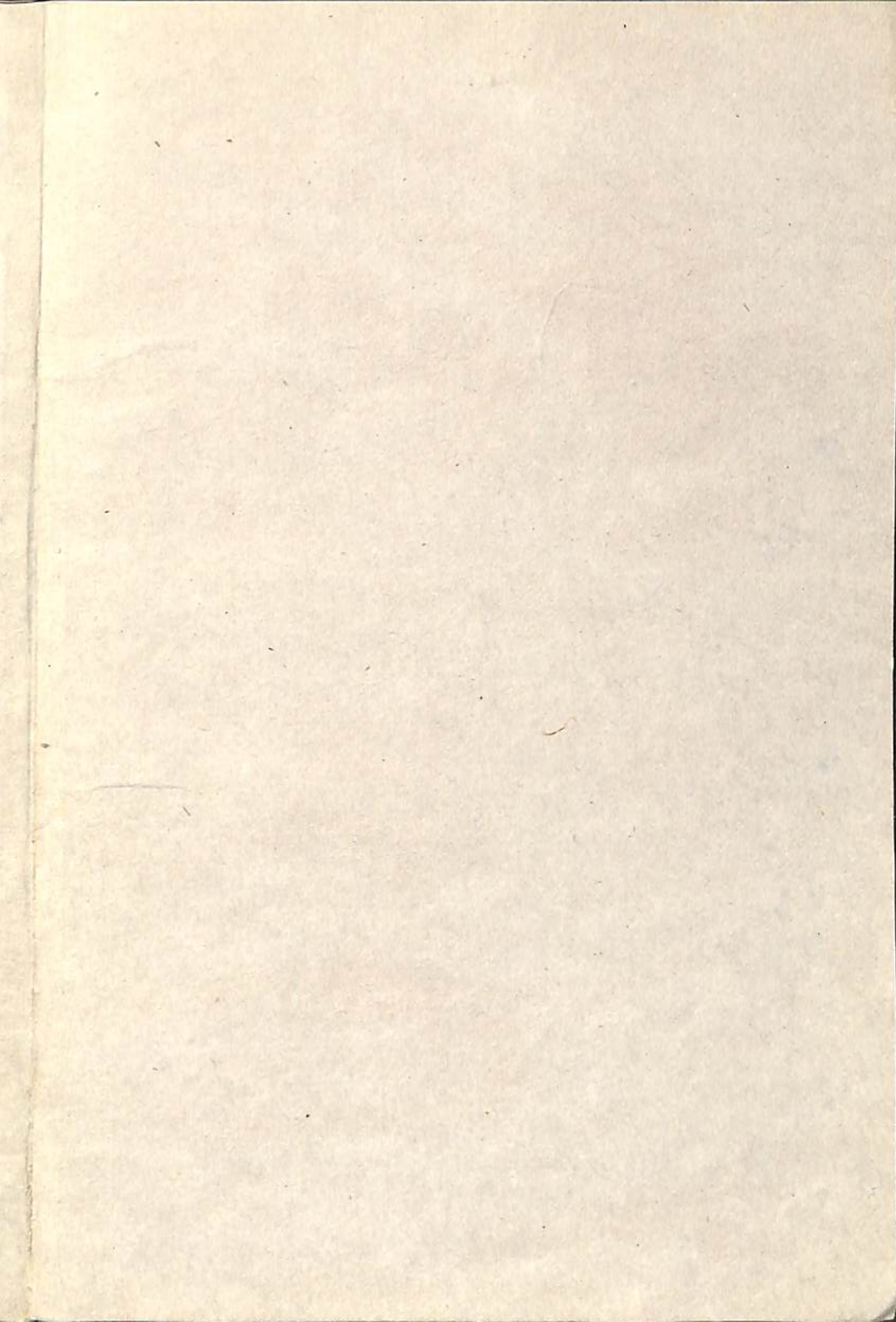


گنگوا گنگا مائی

شنکر موکاشی پُنیکر



گنگوا گنگا مائی



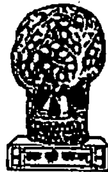
ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

گنگوا گنگا مائی

شنکر موکاشی پنیکر

مترجم

عبدالحیٔ



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
نئی دلی

(1900) 1979

قیمت :- 14/-

Original Title: GANGWA GANGAMAI (Kannada)
Urdu Translation: GANGWA GANGAMAI

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا A/5 گرین پارک نئی دہلی 110016 نے
برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج نئی دہلی 110002 سے چھپوا کر شائع کیا۔

پیش لفظ

یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ کنڑ میں ناول کا چلن انیسویں صدی کے آغاز میں ہوا، لیکن اس سوال کا جواب قطعی طور پر دینا مشکل ہے کہ ناول کا آغاز کب ہوا۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ 1823 میں تحریر کیا گیا کیمپوناراین کا "مُدرامنجوش" کنڑ کا پہلا ناول ہے۔ اس نثری داستان کا انداز ناول سے ملتا جلتا ہے لیکن ناول نے آگے چل کر جو شکل اختیار کی اس کا تصور کیمپوناراین کو نہ تھا۔ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نثر کو سنوارنے اور اس میں ناول کی تخلیق کی صلاحیت پیدا کرنے کا فخر اسی مصنف کو حاصل ہے آسان نثر میں " راماشومیدھ" کے مصنف مُٹنا (1870 — 1901) نے "گوداوری" نامی ناول نصف لکھا۔ وینکٹاچاریہ کی تخلیقات کو مُٹنا بڑی دلچسپی اور استعجاب سے پڑھتے تھے اسی سے انھیں ناول لکھنے کی ترغیب ہوئی۔

بی وینکٹاچاریہ (1846 — 1914) نے بنکم چندر اور دوسرے بنگالی ادیبوں کی تصانیف کا ترجمہ کر کے کنڑ کے پڑھنے والوں کو ناول سے متعارف کرایا۔ روایت پرستی کے حامی بنکم چندر کے زہر کا پودا، دیوی چودھرانی، کرشن کانت کا وصیت نامہ وغیرہ جیسے سماجی ناول اور راج سنگھ، درگیش نندنی، آنند مٹھ، تاریخی ناول کنڑ میں بے حد مقبول ہوئے۔ بنگالی ناولوں کی زبان پر سنسکرت کا غلبہ تھا۔ اس اسلوب کو ترجموں میں اپنانے کی وجہ سے کنڑ زبان بھی مشکل بن گئی۔ شیورام کارنت کا یہ قول قابل تعریف ہے کہ اسلوب سے ہماری دلچسپی بنگالی ناولوں کے کنڑ ترجموں کو پڑھنے سے بھی بڑھی ہے۔

میسور کے وینکٹاچاریہ نے جہاں بنگالی ناولوں کا کنڑ میں ترجمہ کیا وہیں مراٹھی ادیبوں

خصوصاً ہری نارائن آپٹے کے ناولوں کا ترجمہ کنڑ زبان میں شمالی کرناٹک کے بی۔ٹی گلگ ناتھ (1869 ۔ 1942) نے کیا۔ رانا راج سنگھ لکشمی بائی اور بھگوتی کا تیابنی وغیرہ ناولوں کے متن کی زبان وینکٹاچاریہ کی کنڑ کے مقابلہ میں زیادہ سلیس اور فطری ہے۔ اس کی وجہ مراٹھی زبان کا غیر سنسکرت آمیز ہونا بھی ہے۔ گلگ ناتھ نے شمالی کرناٹک کے مروجہ اسلوب کو ہی نکھارا ہے۔ اس صوبہ کے کئی ناول نگاروں نے گلگ ناتھ کے اسلوب کی پیروی کی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان بہت زیادہ متاثر کن تھی۔ مشہور سورماؤں کے دل ہلا دینے والے بہادرانہ کارناموں کی تصویر کشی، جمہور کی بیداری کی آرزو، زبان کی سلاست اور مہاراشٹر کے جغرافیائی قرب کی وجہ سے وہ شمالی کرناٹک کے مقبول عام مترجم ہوئے۔

وینکٹاچاریہ اور گلگ ناتھ کے عہد کو ترجموں کا عہد کہا جاسکتا ہے۔ ان مترجمین کے ذریعہ ناول عوام تک پہونچ گیا۔ پڑھنے والوں کو ادب کی تمام اصناف میں ناول سب سے زیادہ پسند آنے لگا۔ ملک میں تہذیبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں یہ تخلیقات معاون ثابت ہوئیں۔ خاص طور پر ترجمے کے اس کام سے کنڑ میں ناول کے ارتقا میں خاص مدد ملی۔ گلگ ناتھ نے وجے نگر سامراجیہ کی بنیاد پر 'مادھو کرن ولاس'، اور 'کمدنی' نام کے دو طبعزاد ناول بھی لکھے۔ ان تصانیف میں وطن پرستی، مذہبی تفاخر، اور دیوبھگتی کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ ان میں کنڑ کے ماضی کی شان وشوکت کو نمایاں کرنے کا رجحان بھی کارفرما ہے لیکن چھوت چھات کے انسداد جیسے عصری مسائل کے ساتھ تاریخی صداقت کا امتزاج گلگ ناتھ کی طبعزاد تصانیف میں صحیح طرح نہیں ہوا ہے۔

گلگ ناتھ کے ناولوں کی اشاعت سے پہلے جنوبی کرناٹک میں بھی طبعزاد ناول لکھے جارہے تھے۔ گل واڈی وینکٹ رائے کا 'اندرابائی' (1899) کنڑ کا پہلا معاشرتی ناول ہے۔ شاید یہ پہلا طبعزاد ناول بھی ہے۔ بہرحال یہ بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ کنڑ میں اُنیسویں صدی کے آخر تک ناول کا آغاز ہوچکا تھا۔ 'باگ دیوی' (1905) کے مصنف بولار بابوراؤ اور 'روہنی' (1907) کے خالق گل واڑی انا جی رائے کرناٹک میں ناول کو آگے بڑھا رہے تھے۔ کنڑ زبان کا علاقہ انتظامی نقطۂ نظر سے مہاراشٹر مدراس اور پرانے میسور میں بٹا ہوا ہونے پر بھی بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ختم ہونے تک اس میں اچھی خاصی تعداد میں ترجمہ شدہ اور طبعزاد ناول تصنیف ہونا شروع ہوگئے تھے۔

1915ء میں شایع ہونے والا ”ماڈ دو نو ہاراے“ کنڑ ناول کے ارتقا کے نقطۂ نظر سے ایک اہم تصنیف ہے۔ پرانے میسور کا سادہ اسلوب ایم ایس پٹنا نے اس میں استعمال کیا ہے۔ انھوں نے پہلی بار جہاں تک ممکن تھا، مروجہ زبان میں ہی مکالمات لکھے۔ ان کا خیال تھا کہ ناول میں اقدار اور کردار کی پیش کش کے لیے پرانوں کا پیش کردہ آدرش سامنے رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کا پلاٹ عام زندگی سے حاصل کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی تحریر طلب ہے کہ 'راماین درشن' کے شاعر کے، وی پٹ ٹپا نے اپنے ناولوں کا پلاٹ عام زندگی سے ہی لیا ہے۔

پٹ ٹپا کے 'کانورو سودما ہیگڑتی'، ملیّا للی مدومکل، نامی ناولوں کی اشاعت کے درمیان تین دہائیوں کا فاصلہ ہے۔ پٹ ٹپا نے اپنا بچپن اور جوانی ملے ناڈ میں گزارا تھا، ان دونوں ناولوں میں مصنف کا یہ تجربہ خاص طور پر ظاہر ہوا ہے۔ حسن کے پجاری پٹ ٹپا کے ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان سے کنڑ ناولوں کو شاعرانہ لب و لہجہ ملا ہے۔

افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ماستی وینکٹیش آینگر کا خیال ہے کہ کردار کے حقیقی تجربے کی بنیاد پر ہی ناول کی تعمیر ہونی چاہیے۔ ماستی مسلسل لکھ رہے ہیں انھوں نے ”سوونا“ نامی ایک بہت ہی خوبصورت ناول کئی سال پہلے تصنیف کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے ملے ناڈ کے تاریخی پس منظر میں 'چین بسو نایک' لکھا۔ ان کے ایک اور ناول 'چک ویرراجیندر' کا پلاٹ کوڈگ کی تاریخ سے لیا گیا ہے۔ کرناٹک کی تہذیب اور اس کی عظمت کی پیش کش ماستی کے ناولوں کی خصوصیت ہے۔ کنڑ کے ممتاز ناول نگار شِورام کارنت کا راسخ عقیدہ ہے کہ زندگی کے تجربات کو ہی ادب کی تخلیق کی بنیاد ہونا چاہیے۔ حقیقت نگاری اور تصنع سے عاری اسلوب کارنت کے ناولوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ معاشرتی اصلاح کے مقصد سے تصنیف کیے گئے ناولوں میں بھی اُن کی تخلیقی قوت بیدار رہی ہے۔ تجربات کی پیش کش موضوع کے مطابق ہے۔ معاشرتی مطالعہ کارنت کے ناولوں کو ایک متانت عطا کرتا ہے۔ افسانوی اندازِ بیان اُن کے فن کی دوسری خصوصیت ہے۔ اُنھوں نے کوئی نیا اسلوب ایجاد نہیں کیا اور نہ ہی اُن کا کوئی پیرو یا مقلد ہمیں نظر آتا ہے۔ ان کے اکثر ناولوں میں جنوبی کرناٹک کی عام زندگی کے مرقعے بکھرے پڑے ہیں۔ وہاں کی زمین، پانی، جانور، پرندے، پیڑ پودے، ان کی تخلیقات میں

زندہ ہوگئے ہیں۔ کارنت کے بہترین ناولوں میں پٹ ٹپا کے ناولوں کی طرح علامات اور راست بیانی ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ نئے تجربات اُن کے ہاں پائے جاتے ہیں لیکن یہ اُن کے فن کی خصوصیت نہیں۔

نئی تکنیکوں اور تجربوں کے ذریعہ کنڑ ادب میں جدّت پیدا کرنے والے فنکار ہماری نئی نسل کے ادیب ہی ہیں۔ لیکن اس سے قبل کے ادب کو موڑ دے کر اُسے آگے بڑھانے والے ترقی پسند ادیبوں کے بارے میں بھی دو ایک باتیں کہنی ضروری ہیں۔ ایم' ایم پٹ ٹپا کے زمانے تک کے ناولوں کو کنڑ میں ناول نگاری کا دورِ اوّل کہا جا سکتا ہے۔ کے، وی، پٹ ٹپا' ماستی جیسے اہم ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت کے بعد، علی الخصوص 1930ء کے بعد سے' کنڑ ناول کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ ناول کے ارتقاء میں ترقی پسند ادیبوں کا جو حصہ رہا ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"سندھیا راگ"، اور "نٹ بہار و بھوم" کے مصنّف اے این کرشن راؤ کی وجہ سے ناول کی مقبولیت اتنی بڑھ گئی کہ اس سے پہلے اتنی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تنقیدی نقطۂ نگاہ سے پڑھنے والوں اور محض دلچسپی کے لیے پڑھنے والوں، دونوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ کرشن راؤ اور چند دوسرے ادیبوں نے، طوائف کی زندگی، فنکار کی دنیا، سرمایہ داری کے تباہ کن اثرات جیسے موضوعات کو اپنے ناولوں کے لیے منتخب کیا۔ ادب کے موضوع کے بارے میں اب تک جو ایک پاکیزگی کی روایت چلی آتی تھی، نئے ادیبوں کے ہاتھ اُسے بدل دینے کے نتیجہ میں، جس شدید مخالفت کا امکان پیدا ہو گیا تھا اُسے ترقی پسند ادیبوں نے کم کیا۔ ناول کو عوامی مقبولیت عطا کرنے کے لیے انھوں نے راست بیان، عوامی زبان، کہانی کی دلچسپی کو قایم رکھنے، قاری میں اشتیاق اور ہیجان پیدا کرنے پر خاص زور دیا۔ اِسی وجہ سے کرشن راؤ، سبا راؤ، بسوراج، کٹی منی نرنجن، کرشن مورتی پرانک کے ناول صحافت کی سطح سے بلند نہیں ہو سکے۔

1960ء کے لگ بھگ شایع ہونے والے ناولوں میں راؤ بہادر کا "گراماین" ایک اہم تخلیق ہے۔ ایک گاؤں میں ہونے والے واقعات میں ناانصافی کا پلڑا بھاری ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں لوگوں کے مزاج کا فطری پن ختم ہو جاتا ہے۔ اس الم انگیز تجربہ کو بڑے پُر اثر انداز میں اس ناول میں پیش کیا گیا ہے اور اس میں علاقائیت، ایمائیت اور آفاقیت کو نہایت

کامیابی سے ہم آہنگ کردیا گیا ہے۔

موجودہ صدی کی چھٹی دہائی میں جدید رجحان کے فنکارانہ استعمال کو فروغ دینے والے ادیب کنڑ کے مشہور شاعر گوپال کرشن اڈیگا ہیں۔ لیکن کسی بھی رجحان کے زیر اثر زیادہ عرصہ تک رہنا جدیدیت کے منافی ہے اسی لیے یو۔آر۔ اننت مورتی، پی لنکیش، تے جسوی، گری وغیرہ نے اس میدان میں بہت جلد اپنا مخصوص مقام بنا لیا۔ یہ سب ماستی کی طرح افسانہ نگاری سے ناول نگاری کی طرف رجوع ہوئے۔ نئے ادیبوں میں سب سے زیادہ باثر ناول نگار اننت مورتی ہیں جن کا ناول "سنسکار" ہے جو زندگی کے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر ایک تجربہ کار شخص کے ذریعہ تہذیبی انحطاط کو نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اننت مورتی کا دوسرا ناول "بھارتی پور" ابھی حال میں شایع ہوا ہے۔ اے کے رامانوجن کا "ہلدی مینو" شاری کے غیر مطبوعہ انگریزی ناول کا ترجمہ ہوتے ہوئے بھی تکنیک اور لاشعور کے مطالعہ کی پیش کش کی وجہ سے کنڑ ادب میں ایک مخصوص مقام کا حامل ہے۔ پی لنکیش کا "برکو" تے جسوی کا "سوروپ" گری کا "گتی استھتی" یشونت چتال کا "مرودار گلو" اور شانتی ناتھ ڈیسائی کا "مکتی" نئے ادیبوں کے رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ نیا ادب انسان کی سماجی حد بندیوں اور ذاتی تجربوں میں پوشیدہ حقیقتوں کو لطیف لیکن تیکھے انداز اور پر جوش الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ عورت مرد، فرد، سماج اور تہذیب، جب ان رشتوں میں عدم توازن بڑھنے لگتا ہے تو انسان اپنے اور دنیا کے درمیان واقع خلا کو محسوس کرتا ہے جس سے اُسے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ اگر جدید دور سے پہلے کے ناولوں میں زندگی کے بامعنی اور بامقصد ہونے پر زور دیا جاتا تھا تو جدید ناولوں میں زندگی کا لاابالی پن اور تہذیب کا مردہ پن پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ جدید ادیبوں میں زندگی سے اس بیزاری اور مایوسی کے احساس کا سبب یورپ کے اثرات ہیں۔ ان میں خصوصی حیثیت 'وجودیت' اور 'لاتعلقی' کے فلسفہ کو حاصل ہے جو کافکا اور کامو کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے۔ لیکن جو لوگ نئے ادب کے خلوص پر شبہ کرتے ہیں، اُن کو یہ سوچنا چاہیے کہ ہماری زندگی پر یورپی تہذیب کا کتنا اثر ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اب تک شایع ہونے والے ناولوں کو دیکھ کر فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے کہ کنڑ کے بہترین ادیبوں میں زیادہ تر جدید لکھنے والے ہی ہیں۔

یہاں کنڑ ناول کے ارتقا کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ایسا کرتے وقت قدیم ناول،

سیاسی ناول، معاشرتی ناول، تاریخی ناول وغیرہ کے عنوانات الگ الگ قایم نہیں کیے گئے ہیں۔ اب تک جن ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کے علاوہ کچھ ادیب اور بھی ایسے ہیں جنھوں نے اس شعبے میں قابل قدر کام کیا ہے۔ مثلاً دیوڈو، گوکاک، شری رنگ، بھیتر پا، کے۔ وی۔ ایئر، انعام دار، مرجی اناراؤ، آر شری مگل، ویرکیسری، سیتارام شاستری، کورنٹی شری نواس راؤ، چدورنگ، ویاس رائے بلاّل، ایس اننت نارائن، رام مورتی، تروینی، ایم کے اندیرا وغیرہ۔ کنڑ کا افسانوی ادب بہت زیادہ متنوع ہے لیکن اس کی قدر وقیمت کا تعین ہونا ابھی باقی ہے۔

کنڑ اور انگریزی کے ادیب شری شنکر موکاشی صرف صوبائی سطح پر ہی نہیں قومی سطح پر بھی زبردست شہرت کے مالک ہیں "گنگوا گنگا مائی" کے علاوہ "ماں کے تین مکھ" کے نام سے اُن کا ایک شعری مجموعہ اور "برہندے کی کاویہ می مانسا" کے نام سے ایک تنقیدی کتاب بھی شایع ہو چکی ہے۔ اُنھوں نے کچھ تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں۔ اپنی تنقیدی تحریروں میں اُنھوں نے جدید لکھنے والوں کی مذمت کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ تنقید کا خاص منصب حصول انبساط ہے، جانچ پڑتال نہیں، اس لیے نئے کنڑ ادب کی تنقید میں عمل جراحی کی بجائے جوش اور جذبے کو جگہ ملنی چاہیے۔

موکاشی نے کنڑ میں ایک ہی ناول لکھا ہے "گنگوا گنگا مائی" پھر بھی اس ناول کا ایک مخصوص مرتبہ اور مقام ہے۔ اس میں روایات کی پیدا کردہ فرض شناسی، گھر کے رشتوں سے وابستہ انسانی وقار، اپنے حدود کے اندر اور باہر کے واقعات کا بیان نہایت جوش اور جذبہ سے کیا گیا ہے۔ کہانی کے آخر میں تقریباً تمام کردار اپنی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہو کر اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانی کمزوریوں سے موکاشی اچھی طرح واقف ہیں۔ خردمندانہ اخذ وقبول، روایت زدگی کے عناصر، فن سے وابستگی کے سبب زندگی میں پیدا ہونے والے لطیف ارتعاشات اور شدید الجھنوں کی کامیاب تصویر کشی کے سبب "گنگوا گنگا مائی" کو کنڑ ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

موکاشی نے جو نظریہ پیش کیا ہے اُس کی بنیاد یہ ہے کہ تخریبی عناصر خود سماج کے سہارے پرورش پاتے ہیں۔ ناول نگار کو چاہیے کہ قاری کو برابر اس بات کا احساس رہے۔ "گنگوا گنگا مائی" کی تصنیف کا بھی خاص مقصد یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں المیہ کیفیت کی موجودگی کے باوجود اس کا مجموعی تاثر طربیہ ہے۔

اس نظریہ کو خصوصی اہمیت دے کر تخلیق پانے والے فن پارہ میں تجربات کے فشار سے جو آلودگی نمودار ہوتی ہے اُسے پوری طرح انگیز کرنے کے لیے کسی خصوصی قوت و صلاحیت کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ تہذیبی اور ذہنی دونوں سطحوں پر وہ روایت کی شکل میں حاصل رہتی ہے۔ اس ناول کی ایک امتیازی خصوصیت اور کامیابی یہ بھی ہے کہ اس میں کسی جگہ بھی 'مقصدیت' ناول کی 'افسانویت' پر غالب نہیں آسکی ہے۔

اس زاویہ سے 'گنگوا گنگا مائی' ایک 'گھریلو' ناول ہے۔ اس کے پلاٹ کا میدان محدود ہے۔ خاص طور پر دھارواڑ کے 'گنگوا'، 'راگھپا اور دیسائی'، ان تین گھرانوں کے گرد جو واقعات رونما ہوتے ہیں اُنھیں کے سہارے ناول کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے لیکن اس ناول کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں اپنی حد سے آگے کی طرف دیکھنے کا رجحان بھی موجود ہے۔ اس طرح ناول کے حدود میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ وسنت کا گاؤں چلا جانا اور اچیوت کا بمبئی میں مقیم ہونا ان کے ذریعہ واقعات کے مرکز یعنی دھارواڑ کے پس منظر میں گاؤں کی زندگی اور ایک بڑے شہر کی جھلک ہمیں نظر آتی ہے، پھر گاؤں، یا دھارواڑ یا بمبئی کو بذات خود کوئی اہمیت ناول میں نہیں دی گئی ہے لیکن دھارواڑ اور بمبئی کا تعلق یوں ہی دکھایا نہیں گیا ہے۔ تین گھرانوں پر پڑنے والی مصیبتوں سے یا ان کے آپسی رشتوں سے دھارواڑ کی شہری زندگی متاثر نہیں ہوتی ہے لیکن دیسائی جی سمجھتے ہیں کہ وسنت کے کرتوتوں سے گاؤں کی پُرسکون فضا میں بےچینی پیدا ہوتی ہے۔

بمبئی میں اچیوت کا ستیہ گرہ میں حصہ لینا اور دھارواڑ کے اسکول کے جلوس میں شانتا کی قیادت، ان دونوں واقعات اور ان کے نتائج کو ایک ساتھ ملا کر دیکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی کے جمود کو بدلنے والی قوت کو اس ناول میں تسلیم کیا گیا ہے۔ رتنا جو آزادی تصور میں بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی وہ شانتا کو سیاسی اندولن کی وجہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک نسل سے دوسری نسل تک ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے پیدا کردہ مسائل پر بھی تبصرہ موجود ہے (ہر نسل کے سامنے اپنے مخصوص مسائل ہوتے ہیں، پرانی عورتیں نئی نسل کے مسایل کو نہیں سمجھ سکتیں۔ آگے چل کر تمہیں جو بننا ہے اس کی طرف دیکھو) روایت سے وابستگی موکاشی کو ہر لمحہ منقلب ہونے والی زندگی سے منھ موڑنے نہیں دیتی۔ شانتا کی شادی اور اس کی ماں کی شادی مماثل حالات کا نتیجہ ہیں۔ اس جز کا ذکر بھی ہمارے اس خیال کی تائید

کرتا ہے۔ روایت پر خامی تنقید ہونے کی وجہ سے واقعات کے بیان میں جو طنز پیدا ہو گیا ہے وہ بھی لطافت سے خالی نہیں۔

اس ناول میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ زندگی سے منھ موڑنا کہاں تک ممکن اور مناسب ہے۔ زندگی سے اُکتا جانے پر گنگوا گنگا مائی کی پناہ حاصل کرنے کے متعلق سوچتی ہے لیکن اُس کا فرض ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ کٹّی کو شادی کرکے اپنا گھر بسانے تک ماں کی سرپرستی کی ضرورت ہے ـــــ یہ خیال آتے ہی وہ بیٹے کے لیے فکرمند ہو جاتی ہے۔ گنگا کے بلاوے کو نظرانداز کرکے وہ گھر کی جانب توجہ کرتی ہے۔ ریل کے ڈبے سے گنگا جل کو بہا دینے کا گناہ بھی وہ کر ڈالتی ہے۔ گنگا کو ترک کر دینے سے اُس کی شخصیت اور اُبھر آتی ہے۔ گنگوا فرض سے منھ نہیں موڑتی ہے لیکن وہ گناہ سے بری بھی نہیں ہے۔ اپنے بھائی کی بے انصافیوں کو وہ بھولتی نہیں ہے۔ ماضی کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا دل غمگین اور سخت ہو جاتا ہے۔ اُس کی زبان سے طنز کے تیروں کی بارش ہوتی ہے۔ راگھپا اور چمپکا کی المناک موت کے بعد ہی اُس کا دل بالیدہ ہوتا ہے۔ اس وقت تک دل کی ساری محبت اور فکرمندی صرف کٹّی کی ذات تک محدود تھی زندگی سے متصادم ہو کر اس پر فتح پانے کا جوہر کٹّی کی شخصیت میں نہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ متلون مزاج ہے۔ آخر تک وہ طفلی کی منزل سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ اس کی اپنی شخصیت پوری طرح سے بالیدہ نہیں ہو سکی اس لیے اس میں ایک کمزوری راہ پاگئی ہے۔ اُس خاص کردار کو ایک یک رخا ہیرو بنایا گیا ہے۔ موکاشی انسانی سرشت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے وہ کسی بھی کردار کو تکمیل کی منزل تک نہیں پہونچاتے۔ انسان کی کمزوری کو ظاہر کرنے کی وجہ سے ناول میں ایک بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے۔ انسان کے تفاخر، فریب کاریاں، جہالت، غم اور تصادم گنگوا اور راگھپا کے درمیان حائل ہیں۔ گنگوا کی طرح کنارہ کشی کی کوشش کرکے حالات کے تقاضے پر تال ٹھوک کر اکھاڑہ میں کود پڑنے والی دوسری شخصیت دیسائی ہیں۔ وہ کئی بار سوچتا ہے کہ دوسروں کے جھگڑوں میں دخل نہیں دینا چاہیے لیکن گنگوا کی تکلیفوں کو دیکھ کر راگھپا سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کٹّی راگھپا کے جال میں پھنس کر ضد کرکے رتنا سے شادی کرتا ہے اور دوسری طرف وسنت شانتا کے پیچھے پڑتا ہے آخر میں بے شمار نشیب و فراز کے بعد سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اس میں خاص طور پر براہِ راست متصادم ہونے والے تین بزرگ ہیں جو زبردست قوت اور فراست کے مالک ہیں۔ راگھپا کی اپنی شخصیت گنگوا اور

دیسائی دونوں سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ وہ زیادہ تجربہ کار بھی ہے اور اپنے فائدہ کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر خود ہی زیورات اٹھا کر لے جاتا ہے اور پھر چوری کا بہانہ کرکے ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ہچکچاتا لیکن وہ کسی ویلن کی طرح یکسر ظالم بھی نہیں۔ اس کی بیٹی کے بیاہ کے دن اس کی عزت کو بچانے کی خاطر محبوب جان اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے لیے روپیہ فراہم کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا دل مسوس اٹھتا ہے۔ وہ شخص جس نے زندگی میں کبھی ہار نہ ماننے کا عہد کیا تھا اسی لمحے سے شکست کی جانب دیکھنے لگتا ہے لیکن اسی لمحے سے اس میں انسانیت اور فرض شناسی پیدا ہوتی ہے۔ ایک نئے زاویے سے حق اور باطل کے عرفان کے بعد راگھپا زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور بالآخر خودکشی کر لیتا ہے۔ راگھپا کے کردار کی تعمیر گنگوا اور دیسائی کے کرداروں کی تعمیر و تشکیل سے مختلف طرز پر ہوتی ہے۔ خیر اور شر کا شعور ان دونوں کو زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔

ان واقعات کے ارتقا میں کوئی خاص مقام نہ رکھنے کے باوجود جارج پلاٹ کا ایک اہم نقطہ ہے۔ فرض شناسی کا احساس اس کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہے وہ ہر قسم کی صورتحال میں پُرسکون رہ سکتا ہے۔ اس کی شخصیت میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے۔ اس کی قناعت پسندی کٹی کے تلون کے لیے معاون نہیں ہوئی، یہی نہیں اس کا سکون ناول کے اندر چلنے والی سکون کی زیریں لہر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ حالات کا علم ہونے پر بھی ان کی جانب نہ کھنچتے ہوئے مضبوط طریقہ پر کھڑے ہو کر پُرسکون رہنے کی قوت اس میں موجود ہے، حقیقت نگاری کے سہارے ناول کی اصلی اہمیت کو خراب کرنے کی ہمت موکاشی کی تحریر میں نہیں ہے۔

گنگوا گنگا مائی کے پہلے دو باب پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ اس میں علامت نگاری کا خاصا استعمال کیا گیا ہے۔ زندگی کی تکمیل، موت کا بلاوا قبول کرنا گنگا مائی کے کردار کا ایک پہلو ہے۔ لیکن پھر بھی وہ گنگوا میں غیر مرئی طور پر موجود رہ جاتی ہے۔ یہ حالت کچھ دنوں تک پوشیدہ رہتی ہے۔ قاری کی توجہ منتشر واقعات کی کڑیاں ملانے اور کرداروں کے ارتقا کی طرف لگی رہتی ہے لیکن ساس بہو کے تصادم اور جھگڑے کے درمیان کسی غیر مرئی ہستی کی طرح بہنے والی ندی میں زہر کی ملاوٹ کا اشارہ ملتا ہے۔ آخر میں گنگوا کے احساس کا سوتا خشک ہو جاتا ہے۔ گنگا جل کا برتن گنگوا کے پاس آتا ہے۔ اس وقت موت اور زندگی کی کش مکش میں گنگوا گنگا مائی میں باہمی اختلاف کا نقطۂ نظر پوشیدہ ہونے کی صدا سنائی دیتی ہے۔

گنگامائی میں الوہیت کا جو عنصر موجود ہے وہ شالگ رام میں تکمیل کے درجہ پر پہونچ جاتا ہے۔ شالگ رام کے واقعہ سے گنگوا کو اس وقت تھوڑی سی عقل آجاتی ہے جس سے گھر کی بدامنی کسی حد تک کم ہوجاتی ہے۔ گنگا ندی کی طرح گرجنے والی گنگوا کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی ہے: سکون۔ گمبھیر خاموشی! شالگ رام اور گنگوا کے ساتھ علامتی سطح پر جارج کے تعلقات کا تصور بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شالگ رام کی خاموش سرپرستی کو موکاشی نے بیان کیا ہے۔ گنگا مائی اور شالگ رام کا علامتی استعمال ناول کے آخر تک یکساں طور پر نہیں کیا گیا ہے۔ ابہام، نشتر زنی، رہنمائی وغیرہ کا روایتی معنی میں استعمال بیکار ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیان میں چستی آنے کے بعد بھی وہ آخر تک نبھ نہیں پاتے ہیں۔

اس ناول میں خاندانی زندگی کی پیش کش کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے لیے روایتی تکنیک کو اپنایا گیا ہے، جیسے ابواب کے عنوانات قایم کرنا، سنسکرت اشلوکوں کا استعمال، ڈکنس کی طرح ڈرامائی انداز میں مزاح پیدا کرنا، ساتھ ہی اٹھارویں صدی کے انگریزی ناولوں کی طرح قصہ کو آگے بڑھانے کے لیے خطوط کو استعمال کرنا۔ ناول کے آخری حصہ میں قصہ کے الگ الگ سروں کو جوڑنے کے لیے خطوط کے استعمال سے دھکا سا لگتا ہے۔ موکاشی کا نظریہ ہے کہ ناول کو عام تکنیک کے ذریعہ ہی تکمیل تک پہونچانا چاہیے۔ گنگوا گنگامائی اس بات کا ایک کامیاب نمونہ ہے کہ روایتی نظریات کے متعارف چوکھٹے میں رہتے ہوئے انسانی صلاحیت اور امکانات کا ہمدردانہ جائزہ لے کر کبھی کبھار روایتی حدوں کو توڑ کر بھی کسی ادبی شاہکار کو تخلیق کیا جا سکتا ہے۔

بی۔ دامودر راؤ

1

گنگوا

گنگوا سے سب ہی واقف ہیں۔ چالیس سال کی عمر میں ہی وہ اپنے شوہر کو کھو بیٹھی لیکن اس نے اپنی زندگی کو اپنے اکلوتے بیٹے کٹی (کرشن) کے لیے وقف کر دیا۔ گھر میں پہلے ہی سے غریبی تھی اس پر گھر کا کماؤ آدمی اُٹھ جانے سے تو گھر کی حالت کا بھگوان ہی مالک تھا۔ اب کٹی اٹھارہ سال کا ہو گیا ہے۔ گنگوا نے پچھلے آٹھ سال میں کیا کیا تکلیفیں نہیں جھیلیں، لیکن اپنے کٹی کے لیے اس نے یہ سب خوشی خوشی برداشت کیا۔ اس نے خود آدھا پیٹ کھا کر کٹی کو بھرپیٹ کھلایا۔ دوسروں کے یہاں جھاڑو برتن کرکے اُسے پڑھایا لکھایا۔ بہرحال کٹی نے اب میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا اور تحصیلدار کے دفتر میں نوکر ہو گیا تھا۔ اپنی کوششوں کی اس کامیابی سے گنگوا بہت مطمئن تھی۔ آرزوؤں کی بھی کہیں کوئی انتہا ہوتی ہے؟ اس کے دل میں اب بھی ایک آرزو باقی تھی کہ کٹی کی ایک چاندسی دلہن گھر میں لانے کے بعد ہی اس کی آنکھیں بند ہوں۔ جب وہ اپنا گھر خود چلانے لگے گا تب ہی وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گی۔

ان ہی دنوں پڑوس کے دیسائی صاحب کی بیوی کاشی یاترا کے لیے جا رہی تھیں گنگوا بھی اسے ایک اچھا موقع سمجھ کر ان کے ساتھ ہولی۔ بھگوان وشو ناتھ سے اپنی آخری مراد مانگنے کے لیے کٹی کو ساتھ لے کر جانا تو ممکن نہ تھا اس لیے وہ اکیلی ہی ان کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

کاشی پہونچ کر اس نے گنگا جی میں اشنان کیا اور وشویشور، کال بھیرو، گھنڈی راج، نند مادھو وغیرہ سبھی دیوتاؤں کے درشن کیے۔ ہریش چندر گھاٹ پر اس نے چراغ جلائے، پنچ آرتی، گوپُر آرتی، کپور آرتی وغیرہ سب ہی آرتیاں کرا کر پرشاد دیا۔ ہر جگہ گنگوا نے آنکھیں بند کرکے نہایت عقیدت سے سر جھکایا اور دعا کی کہ اے بھگوان! کرشنا کی شادی ہو جائے، اس کا گھر بھرا پرا ہو جائے، بس اتنا ہی دکھا دو بھگوان! کٹی دولت مند بنے انسان بنے، اُس کا جیون سکھی رہے، اس کی یہی تمنا تھی! اس کا دل مادرانہ شفقت سے لبریز ہو گیا، وشویشور کے سامنے آرتی ہوتے وقت وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بھگوان کے سامنے گڑگڑائی۔

کاشی سے گاؤں لوٹنے کا وقت بھی آگیا۔ سب نے اپنا اپنا سامان سنبھالنا شروع کیا۔ گنگوا نے بھی اپنی چھوٹی سی پوٹلی سنبھال لی۔ گذشتہ دن وہ بھی سب کی طرح بازار سے تانبے کی ڈھکن والی ایک گگری خرید لائی تھی۔ سب کی طرح اس نے بھی اپنی گگری گنگا جل سے بھر کر موم سے اس کا ڈھکن بند کر دیا۔ گگری کی گردن میں پکڑنے کے لیے ایک ڈوری بھی باندھ دی۔ گگری کچھ بھاری سی لگی۔ اٹھانے میں ذرا مشکل سی ہوئی لیکن کاشی آکر گنگا جل لیے بغیر بھی کہیں واپس جا یا جاتا ہے؟ مرتے وقت آخری سانسوں میں جب تک کٹی سرہانے بیٹھ کر اس کے حلق میں گنگا جل نہ ٹپکائے گا تب تک اس کی نجات کہاں!

ریل چھوٹنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی سب لوگ آکر ایک ڈبہ گھیر کر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ بیچ میں آڑے بیٹھے، اور کچھ اونگھنے لگے۔ گاڑی اسٹیشن سے کب چلی، صرف چند ہی لوگ جان پائے۔

گنگوا کھڑکی سے ٹیک لگائے اپنی گٹھری سنبھالے بیٹھی رہی۔ گاڑی کے ہچکولوں اور چار پانچ دن کی مستقل تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی جھپکنے لگیں۔ وہ دو تین گھنٹے سوتی رہی کہ گاڑی کی سیٹی سے اس کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ ڈبے کی سب کھڑکیاں بند تھیں، صرف گنگوا کے پاس کی کھڑکی کھلی تھی۔ سردی سے اُس کے ہاتھ کی نسیں سن پڑ گئی تھیں، بدن کانپ رہا تھا۔ اُس نے باہر دیکھا تو گاڑی دائیں طرف مڑ رہی تھی۔ اوپر انجن کا کالا دھواں چھا گیا تھا۔ پورا چاند سر پر تھا۔ چاروں طرف چمکتے تارے، دور دور تک پھیلے ہوئے ٹیلے دور افق کے قریب پیڑوں کے ہیولے، ان سب پر نگاہ ڈال کر گنگوا نے کھڑکی بند کر دی۔ اُسے فوراً نیند نہیں آئی۔ خیالات کا تانتا بندھ گیا۔ دیکھے ہوئے سب مندر مورتیاں، گنگا جی سب ایک ایک کرکے اُس کی آنکھوں میں گھومنے لگے۔ وہ اُن میں کھو گئی۔ اسے کاشی کا سفر ایک خواب سا لگنے لگا۔ وشوناتھ کے درشن کی یاد آتے ہی وہ جذبات کی رو میں بہنے لگی۔ اس نے اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھا۔

تمام مذہبی جذبات سے بڑھ کر انسان کے لیے ایک آخری سہارا اور بھی ہوتا ہے، شفقت اور محبت! اُسے اچانک کٹی کا خیال آیا: "شاید وہ اس وقت دھار واڑ میں سو رہا ہوگا، ہوسکتا ہے نیند میں مجھے ماں، کہہ کر بڑبڑا رہا ہو۔ بیچارا! ان دنوں اس نے اپنا کھانا بھی خود ہی تیار کیا ہوگا۔ اُسے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ اب تو اس کی ناک میں ایک نکیل ڈال دینے پر اپنا آخری کام نمٹا سمجھوں گی۔ اُس کے بعد ہی میں سکون سے مر سکوں گی۔" خیالات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر موت

کا خوفناک تصور اس کے دل کو بے چین کرنے لگا۔

موت انسان کی تمام تمناؤں کو روکنے کی دیوار ہے۔ بہو کا منہ دیکھنے کے بعد ہی کیا میرا مرجانا ٹھیک ہوگا۔ کیا صرف کٹی کا بیاہ کر دینے سے میرا کام ختم ہو جائے گا، اس کی زندگی کی تکمیل تو بعد میں ہوگی۔ بیٹے کی گرہستی تو بعد میں دیکھنے کی چیز ہوگی۔ اس کے لیے مجھے آگے بھی جینا ہوگا۔ دس آدمی جب اس کی تعریف کریں، وہ میرے کانوں میں پڑنا چاہیے۔ اس کے بچے دادی کے ہاتھ سے نوالہ کھائیں، میں ان کو کہانی اور لوری سنا کر سلاؤں۔ ان سب کے بغیر میں مرنہ پاؤں گی جہاں تک ہوسکے مجھے جینا ہوگا۔ جینے کی خواہش نے اس کے دل کو بڑھاوا دے کر ایک جوش سے بھر دیا۔

ریل کے ڈبے کے بلب کی مدھم روشنی میں گنگا جل کی گگری چم چم چمک رہی تھی۔ اس کی تیکھی چمک گنگوا کے دل میں تیر کی طرح چبھ گئی۔ گگری کے اندر گنگا جل چھلک چھلک کر آواز پیدا کر رہا تھا۔ یہ آواز اسے موت کے فرشتے کا بلاوا معلوم ہوئی۔ اس نے سوچا یہ گنگا جل کس لیے ہے؟ مرتے وقت حلق میں ٹپکانے کے لیے ہی نا؟ نہ۔ نہ۔ وہ ابھی نہیں مرے گی! اسے تو جینا ہے! اُسے تو کاشی کے وشویشور کا پرشاد ملا تھا۔

چاروں طرف سکوت تھا۔ گگری برابر چمک رہی تھی۔ گگری کے اندر پانی کے چھلکنے کی آواز اُسے موت کا پیغام دے رہی تھی۔ گنگوا بے قرار ہو گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک طرف زندہ رہنے کی خواہش، دوسری طرف موت کی پکار ان دونوں کے درمیان وہ گھبرا اٹھی اور ڈر گئی۔ یہ کش مکش اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ آخر جینے کی خواہش غالب آگئی — اس نے کھڑکی کھولی۔ آہستہ سے گگری اٹھائی، ناخن سے موم کھرچا، ڈھکن کھولا اور گگری کو اپنی آنکھوں سے چھواتے ہوئے "جے گنگا مائی" کہا، پھر اسے کھڑکی پر رکھ کر الٹ دیا۔ گنگا جل چھل چھل کرتا بہہ گیا!

آخری بوند گرنے تک وہ گگری کو اسی طرح پکڑے بیٹھی رہی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ اُس نے پھر سے گگری کا ڈھکن بند کر کے اُس میں موم لگایا۔ گگری کے نیچے رکھے جانے کی آہٹ پر کسی نے نیند بھری آواز میں پوچھا "کون ہے"؟

"کچھ نہیں" کہتے ہوئے گنگوا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

2

پرانے رشتے دار

کاشی یاترا سے لوٹی تو سب ہی لوگ گنگوا کی تعریف کرنے لگے۔ اڑوس پڑوس کے سب ہی لوگوں کو گنگوا نے اپنے سفر کے مختلف تجربات خوب مزے لے لے کر اور رنگین بنا کر سنائے لیکن "گنگا ماں" کو ریل کی کھڑکی سے بہا دینے کی بات سننے والوں کو کچھ اچھی نہیں لگی۔ پڑوسن کاشی کی ماں بولی "یہ کام تو نے غلط کیا گنگوا۔ گھر میں آتی ہوئی گنگا کو تو نے باہر نکال دیا۔ تجھے پھر سے جا کر ان کے درشن کرنے پڑیں گے۔" گنگوا نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ جو ہو گیا سو ہو گیا شاید دوبارہ کاشی یاترا کی توفیق ہو جائے۔

لیکن اپنا ایک تجربہ گنگوا نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ اس کے سرسری تذکرہ پر ہی اکتفا کرتی رہی۔ ایک سیدھی پہاڑی سے گنگا مائی نیچے بہتی ہے۔ یاتریوں کو ہزاروں فٹ کی اونچائی سے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ سامان ڈھونے والے مزدور یاتریوں کو آگاہ کرتے رہتے ہیں کہ نیچے کی ڈھلان کی طرف دیکھنے سے چکر آ جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس وجہ سے گر بھی جاتے ہیں۔ پر گنگوا اس طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔ دور اندھیری گہرائی میں گنگا ماں کا سفید دھارا چھلکتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے گنگا ماں اُسے اپنے پاس بلا رہی ہو۔ گنگوا نے فوراً آنکھیں پھیر لیں اور پھر اُس طرف نہیں دیکھا۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ عجب تجربہ تھا وہ بھی ـــ ایسی کوئی خاص بات نہ تھی پھر بھی اس کا تصور ـــ اس منظر سے پیدا ہونے والے شدید احساسات، خوف، امید، یہ سب مل کر ایک خواب کی طرح گنگوا کے دل میں بیٹھ گئے تھے۔ یہ تجربہ اُس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا جسے وضاحت کے ساتھ بیان کرنا بھی مشکل تھا اور چھپانا بھی ناممکن۔

زندگی کا چکر آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ کٹی کے لیے ماں کے بغیر تنہا رہنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ کٹی کوئی دودھ پیتا بچہ تو تھا نہیں پھر بھی اکیلا رہنا اُسے اچھا نہ لگا۔ اوّل تو کھانا پکانے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا اور ماں کی غیر حاضری بھی بہت اکھری۔ دوسرے دفتر کے تلخ تجربوں

کو ہمدردی سے سن کر تسلی دینے والی کی کمی بھی اُسے بہت کھٹکی۔ کٹی کو اور بھی پریشانیاں تھیں۔ نئی نئی نوکری تھی اور کسی نے اسے صلاح دی تھی کہ انکم ٹیکس کے محکمے میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کسی دوسرے سے پوچھے بغیر جتنا سمجھ میں آتا اسی کے مطابق کام کرتا۔ نتیجے میں بڑے افسروں سے ڈانٹ کھاتا اور ساتھیوں سے ہنسی اڑواتا۔ اس کو نوکری دلانے والے تحصیلدار صاحب شروع شروع میں ازراہ ہمدردی اس کی غلطیوں کی اصلاح کر دیتے تھے لیکن دو ماہ گذر جانے پر بھی جب کٹی کو ٹھیک سے کام کرنا نہ آیا اور اپنی مشکل بھی بیان نہ کر سکا اور اس کے غلط سلط کاغذات دیکھنے پر تحصیلدار کو پتہ لگا کہ وہ اب بھی کورا ہے تو انہوں نے اس سے صاف کہہ دیا "تمھیں نوکری ہی دلانے والا میں مورکھ تھا" یہ سن کر کٹی ان سے اور بھی دور رہنے لگا۔ دھیرے دھیرے ایک کلرک جوشی رام رائے سے دوستی کر کے اس کی صلاح سے کچھ کام کرنے لگا پر تب بھی کچھ غلطیاں رہ ہی جاتیں۔ رام رائے کی صلاح سے اس نے ایک بار مسودہ تحصیلدار صاحب کے پاس بھیجا۔ انھوں نے کٹی کو بلا کر خوب ڈانٹا اور رام رائے کو مسودہ ٹھیک کرنے کو کہا۔ اس طرح کے حالات میں ماں اس کی صلاح کار تھی۔ ماں کے سامنے ایک بار ہنس کر ایک بار چڑ کر جب تک وہ سب کچھ نہ سنا لیتا اُسے چین نہ آتا تھا۔

کٹی جو رعب دفتر میں نہ دکھا پاتا وہ کبھی کبھی گھر میں آسانی سے جما لیتا تھا۔ ان پڑھ ماں کی سیدھی سادی باتوں کا مذاق اڑا کر یا اس کے فرسودہ مشوروں میں کیڑے نکال کر اُسے ایک قسم کا سکون ملتا تھا۔ ماں کے ساتھ چھوٹے موٹے جھگڑے اس کا روز کا معمول تھے۔ ماں کے جانے سے کٹی کی طاقت گھٹ گئی تھی ڈیڑھ ماہ تک کٹی تنہا رہا۔

گنگوا کی واپسی کے بعد کچھ دن کٹی نے بڑے جوش و خروش سے گذارے۔ ماں کی عدم موجودگی میں پیش آنے والی دفتر کی بہت سی باتیں اُسے بتائیں۔ ماں نے جب آنکھوں میں آنسو بھر کر اُسے یہ بتایا کہ کاشی میں وہ اس کو کتنا یاد آتا تھا تو وہ یہ سن کر کچھ شرمایا۔ اُس نے ماں کی تمام باتیں بڑی توجہ سے سنیں۔ گنگوا نے جب گنگا جل کو پھینک دینے کی بات بڑے دُکھ اور پچھتاوے کے ساتھ بتائی تو کٹی نے اس کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا "ماں، تم فکر نہ کرو ایک بار پھر کاشی ہو آنا!"

کچھ دن بعد زندگی کا وہی پرانا معمول پھر شروع ہو گیا۔ بیچ بیچ میں چھوٹے موٹے جھگڑے زندگی میں رنگ آمیزی کرتے رہے۔ کٹی کے دو سگے ماموں تھے۔ ایک کا نام وینکٹ رائے تھا اور دوسرے کا راگھپا۔ کٹی نے ابھی تک اُن کا نام ہی سنا تھا۔ شاید بچپن میں انھیں دیکھا بھی ہو

لیکن اب اسے کچھ یاد نہ تھا۔ پر جب گنگوا کاشی یاترا پر گئی تو ایک ماموں نمودار ہوئے۔ ایک بار دفتر میں کسی کام سے راگھپا آیا تھا تب وہ کٹی کو تلاش کر کے اُس سے ملا اور اسے اپنا رشتہ بتایا۔ رشتہ داروں سے ناواقفیت کے سبب کٹی کو زری کی پگڑی پہنے گندمی رنگ اور دراز قد کے سگے ماموں کی طرف کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوئی۔ راگھپا نے گنگوا کی صحت اور اس کے روزانہ کے معمولات کے بارے میں دریافت کیا۔ بعد میں اس نے اپنے بارے میں بھی بتایا کہ دھارواڑ کے اپنے گھر میں تقریباً چھ ماہ پہلے آیا ہے۔ کسی لین بازار کا پتہ دے کر اس نے کٹی کو اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اب تک وہ اپنے گاؤں بند گوڑہ میں تھا۔ ابھی حال میں اس کی بڑی لڑکی نے ملکی امتحان پاس کر لیا ہے۔ دو درجہ انگریزی پڑھانے کے خیال سے اب وہ اپنے گھر والوں کو دھارواڑ لے آیا ہے۔ کٹی یہ سب بے دلی سے سنتا رہا اور یہ بات وہیں بھلا بھی دی تھی کہ گنگوا کے آنے کے دو ماہ بعد راگھپا پھر اس کے گھر پر وارد ہوا۔

3

غیر متوقع ملاقات

گنگوا نے خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کی اپنے چھوٹے بھائی سے بھی کبھی ملاقات ہوگی۔ کٹی بھی دفتر میں راگھپا سے ملاقات کی بات بھول گیا تھا اس لیے اس نے گنگوا سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو وہ راگھپا سے ملاقات کے لیے تیار رہتی۔ لیکن دس برس کے بعد راگھو گنگوا کے گھر میں سیدھا گھسا چلا آیا۔ گنگوا کو اپنے جذبات ظاہر کرنے کا موقع نہ دیتے ہوئے صحن میں پلنگ پر بیٹھ کر وہ دس سال کے اپنے دکھ سکھ کے دکھڑے رونے لگا۔ اول تو گنگوا کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ بھائی سے کیا بات کرے۔ اُسے بھائی سے نفرت بھی تھی اور اس کا ڈر بھی تھا۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو وہ اپنی زبان کو سان پر چڑھا رکھتی۔ اس کی زبان دس سال میں اپنی تیزی کھو بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی ان دس سال میں بھائی کے حالات کو جاننے کی خواہش بھی دل میں موجود تھی، اسی لیے اس کی ساری باتیں سن لیں۔ اس دن اتوار ہونے کی وجہ سے کٹی بھی گھر پر ہی تھا۔ وہ بھی حیران سا اس غیر متوقع مہمان کی باتیں سنتا رہا۔

راگھپا نے یہ سارے سال گاؤں میں ہی گزارے تھے۔ اس کی بیوی دوسری بچی کو جنم دینے کے بعد بیمار پڑ گئی تھی اور آج تک بیمار ہی ہے۔ بیچ بیچ میں سینے میں درد ہو جاتا تھا۔ سال میں تین چار مہینے بستر پر پڑی رہتی تھی۔ بند گوڑہ میں اُس نے چند سال تک ایک گئو شالہ چلایا۔ عمدہ قسم کی گائیں پالیں۔ ایک عرصہ تک یہی کاروبار کرتا رہا لیکن اس میں نفع دکھائی نہیں دیا تو چھوڑ دیا۔ گھر چلانا ہی تھا۔ اب ادھیڑ عمر ہو گئی تھی۔ سب چیزوں سے تنگ آ کر کھیت کو بٹائی پر اٹھا کر لڑکیوں کی پڑھائی کے لیے دھارواڑ آ کر پھر سے گھر جمایا۔ تین بازار میں مکان ملا تھا ہر قسم کا آرام حاصل تھا لیکن پرانے دن یاد کر کے دکھ بھی ہوتا تھا۔ کتنا بڑا کنبہ تھا، سب بکھر گیا ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب پچھلے جنم کا پھل ہے۔ پھر سب ایک ساتھ ملیں گے وغیرہ وغیرہ......گنگوا اس کی ساری باتیں چپ چاپ سنتی رہی اور منتظر رہی کہ راگھپا کب اپنی تقریر ختم کرے! دھیرے دھیرے اس کی باتیں ایک رخ اختیار کرنے لگیں۔ رشتہ داری، آپس کی ناانصافی، محبت وغیرہ کی تمہید باندھ کر کٹی کی ہوشیاری کی دل بھر کے تعریف کرنے کے بعد راگھپا نے اس کی طرف منھ کر کے پانسہ پھینکا۔

"کیٹنا، ہم لوگوں نے تو اپنی رتنا کو آپ کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ اس کے لیے ہم دوسرا بَر نہیں ڈھونڈیں گے.......ٹھیک بات ہے نا گنگوا؟"

راگھپا گھر میں مہمان کے روپ میں آیا تھا، بھائی کے روپ میں نہیں، گنگوا نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کٹی کیا تمہارے ہاتھ سے باہر ہے بھیّا۔"

کٹی کی نوکری لگنے کے بعد کئی بار یہ مرحلہ آیا تھا لیکن ایسے موقعوں پر کٹی نے ہمیشہ یہی جواب دیا تھا ابھی اس کا شادی کا ارادہ نہیں ہے لیکن راگھپا تو جونک کی طرح چپکنے والا آدمی تھا، آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔

"چاہے اب کر دو چاہے دو سال بعد......ہم نے تو رتنا تمہارے نام کر دی ہے یا یوں کہوں کہ وہ ہمارے گھر تمہارے ہی لیے پیدا ہوئی ہے۔ ایک بار تمہاری ماں نے کہا تھا کہ تیرے گھر سے میرے کٹی کے لیے ایک بہو چاہیے۔ اس کے تین ماہ بعد ہی رتنا پیدا ہوئی تھی۔ چاہو تو پوچھ لو اپنی ماں سے۔"

گنگوا نے بیچ میں ہی ٹوک دیا "ہاں بیٹا، راگھو نے میرے کہنے پر ہی شادی کی تھی۔ بچے بھی میرے کہنے سے پیدا کیے تھے۔ میرے کہے بغیر وہ کچھ کرنے والا نہیں تھا" راگھپا نے پسینہ

پونچھتے ہوئے بات کا رُخ بدل دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ گنگوا ابھی تک پچھلی باتوں کو نہیں بھولی ہے اور نا ہی اُسے معاف کیا ہے۔

"کِٹّنا ! ہماری رتنا خوبصورتی میں کسی سے کم نہیں ہے۔ رنگ گورا ہے۔ ... ہاں اگر تم فلمی ستاروں جیسا روپ چاہتے ہو تو شاید نہ ملے۔ سب کام کاج کرتی ہے۔ گھر میں آج تمہاری مامی سے تو کام ہوتا نہیں، رتنا ہی سب گرہستی دیکھتی ہے۔ گنگوا تمہیں وہ گدی پر بٹھا کر گرہستی چلائے گی۔"

"میرے لیے گدی کیوں؟ بستر کافی نہیں کیا؟" کہہ کر گنگوا طنز سے ہنس پڑی۔ راگھپا سمجھ گیا۔ باتوں سے ہی دنیا کو بس میں کرنے والے راگھپا کا زور بیان گنگوا کے ساتھ گفتگو کرتے وقت کچھ کمزور پڑنے لگا۔ اس کی باتوں میں ڈنک رہتا ہے۔ یہ راگھپا جانتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ گذشتہ دس سال میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اس کی موافقت میں نہیں ہیں اس لیے راگھپا نے یہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے بہن کی بات اس نے سنی ہی نہیں کِٹّی کی طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے اپنے دوسرے حربے آزمانا شروع کیے۔

"کِٹّنا، اب ہماری پنشن کا وقت آگیا ہے۔ تمہاری ماں کا بھی۔ ... اصل بات یہ ہے کہ اب نیا خون آگے بڑھے اور ہماری پرانی رنجش دور ہو جائے۔ ... تمہارے تحصیلدار سے میری پرانی دوستی ہے۔ کل ہی ان کی میری ملاقات ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی پہچان گئے۔ اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے بھی انہیں اپنے گھر بلایا ہے۔ انھوں نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ تمہیں اب کسی بات سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ..." اب تک کِٹّی ایسے بیٹھا تھا جیسے ان باتوں سے اسے کوئی علاقہ نہ ہو لیکن راگھپا کی آخری بات سن کر اس کے منھ میں پانی بھر آیا۔ وہ جب سے ملازم ہوا تھا سپاہی سے لے کر تحصیلدار تک سب ہی اپنے اپنے عہدے کے مطابق اس کا مذاق اڑاتے رہے تھے۔ بات یہ تھی کہ دفتر میں اس سے غلطیاں ہو جاتیں جس کی وجہ سے تحصیلدار اس پر بگڑتا تو شرمندگی میں وہ اور غلطیاں کر بیٹھتا۔ ناتجربہ کار کِٹّی پرانے کلرکوں کے مذاق کا خاص نشانہ تھا۔ اس نے بھی دل میں بہت سے منصوبے بنا رکھے تھے کہ کبھی وہ بھی تجربہ کار کلرک بن جائے گا اور نئے نوسیکھے کلرکوں کی غلطیاں پکڑ کر انھیں ڈانٹا کرے گا۔ کبھی کبھی ماں ہی ان منصوبوں کا نشانہ بن جاتی۔ کِٹّی کے چہرے پر فتحمندی کی پہلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

راگھپا نے یہ سوچ کر کہ ابھی شادی کی بات اٹھانے سے کوئی فائدہ نہیں تحصیلدار کی

بات ہی آگے بڑھائی۔ اس نے بتایا کہ وہ اور تحصیلدار ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے، ساتھ ساتھ فٹ بال کھیلتے تھے۔ تحصیلدار صاحب میٹرک پاس کر کے سرکاری ملازمت پر لگ گئے لیکن وہ خود ہی چوتھے ہی درجہ میں اسکول چھوڑ بیٹھا۔ اسی طرح کی اور باتیں نمک مرچ لگا کر سنانے کے بعد راگھیا نے کہا "بہت دیر ہو گئی۔ اب چلتا ہوں۔" اتنی دیر سے آنکھیں پھاڑے اور درمیان میں کبھی کبھی مسکراتے کٹی نے ماں سے کہا "ماں ذرا چائے تو بناؤ۔"

اگر آدھ گھنٹہ پہلے کٹی نے یہی بات کہی ہوتی تو گنگوا چائے بنا دیتی لیکن راگھیا کی باتوں کا انداز اور کٹی کے سننے کا ڈھنگ دیکھ کر عقلمند گنگوا نے محسوس کیا کہ ان باتوں کو آگے بڑھنے دینا ٹھیک نہیں۔ وہ سرد مہری سے بولی "بیٹا، راگھو چائے پینے والا آدمی نہیں ...."

کٹی نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ماں اتنی سنگدل ہے۔ ساتھ ہی اس کی بات بھی گئی۔ وہ نوکری والا آدمی ہے۔ اس کے ملنے والے اور وہ بھی تحصیلدار کے دوست کی یہ بے عزتی! راگھیا ہنستے ہوئے بولا "گنگوا عمر بڑھنے کے ساتھ ہماری قوت بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ جب پہلے تم کو دیکھا تھا اس میں اور اب میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ ایک چائے اور تمبا کو سدا ہی چاہیے۔ چائے پی کر آیا ہوں اب ضرورت نہیں۔ تم سے اور کٹنا سے ملاقات ہو گئی۔ یہ چائے سے بڑھ کر ہے۔"

وہ اتنے پر چھوڑنے والی نہ تھی۔ "لیکن اس سے بھی بڑی باتیں تھیں نا وہ رہ گئی ہیں کیا؟" راگھیا زور سے قہقہہ لگا کر بولا "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ ایک بار اپنی ماں کو لے کر ہمارے گھر ضرور آنا بھیا۔ غریبوں کو بھول مت جانا" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اپنے ماں کی ناشائستہ سلوک کی تلافی کی کوئی صورت ذہن میں نہ آئی تو کٹی پھر بولا۔

"چائے پی کر جاتے تو اچھا تھا" اور رما کو رخصت کرنے کے لیے اٹھا۔

دہلیز پار کرتے ہوئے راگھیا نے گنگوا کو تیز نظروں سے دیکھا۔ کٹی اسے دیکھ نہ سکا لیکن گنگوا نے یہ بات دیکھ لی۔ اتنے دن بعد بھائی کو دیکھنے سے جو تھوڑی بہت ممتا اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ ان تیکھی نظروں کو دیکھنے سے ختم ہو گئی اور اس نے اپنے دل پر پھر سے پتھر رکھ لیا۔

4

کٹی کا غصہ

کٹی راگھپا کو چھوڑ کر جب گلی سے واپس لوٹا تو ماموں کے دکھائے ہوئے سبز باغ کی فرحت اُسے اب بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے یاد آیا کہ ماں کی لاپروائی پر اسے کسی قدر غصہ کا اظہار بھی کرنا چاہیے چنانچہ وہ غصہ میں پاؤں پٹختا ہوا گھر میں گھسا دھوپ میں سے ایک دم اندھیرے گھر میں آنے سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ ٹٹولتا ٹٹولتا وہ آگے بڑھا اور ٹوٹی پھوٹی آرام کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ آرام کرسی اس کے اس طرح زور سے بیٹھنے سے اور بھی ٹوٹ گئی اور وہ اس میں الجھ گیا۔ اٹھتے اٹھتے اسے ہنسی آگئی لیکن اس نے سوچا اس وقت اسے ہنسنا نہیں چاہیے چنانچہ وہ تیوری چڑھا کر چٹائی پر لیٹ گیا۔ گنگوا چشمہ لگائے باورچی خانے میں بیٹھی "بھکتی وجے" کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ کٹی کی دھما چوکڑی سنی تو کتاب پر سے نظریں اٹھا کر اُدھر کان لگا دیے کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ گنگوا سمجھ گئی کہ کٹی غصہ میں ہے۔ کچھ کہتے ہی برس پڑے گا پھر بھی وہ خاموش نہ رہ سکی اور وہیں سے آواز لگائی "کٹی اندر تو آ"

"کیوں ؟"

"اندر آ تو بتاتی ہوں"

"وہیں سے بتا! یہاں آواز آ رہی ہے"

"اچھی بات ہے میرا صرف یہی کہنا ہے کہ اس راگھپا کے یہاں رشتہ مجھے پسند نہیں"

"ہوں"

"تم اس کے پھندے میں نہ پھنسنا"

"ہوں"

گنگوا کو محسوس ہوا کہ کٹی سے بات کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کٹی اُس سے باہر نہیں لیکن اس کو سمجھانے کے لیے یہ وقت مناسب نہیں۔ کٹی کے لیے بھی اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ اس کا ایک سگا ماموں ہے جس کی ایک لڑکی ہے۔ ماموں اس لڑکی کا بیاہ اس سے

کرنا چاہتا ہے۔ اُسے اس بات کا دکھ تھا کہ اپنے ہی گھر میں اس کی بات نہ مانی گئی۔ سرکاری نوکر ہوتے ہوئے بھی تحصیلدار کے دوست اور اپنے ماموں کو چائے پلائے بغیر رخصت کرنا پڑا۔ اس کی عزت کا خیال اگر گھر میں ماں ہی نہ کرے گی تو کیا دفتر کے سپاہی کریں گے؟ اس کے دماغ میں یہی خیالات چکر کاٹ رہے تھے اس لیے وہ تاک میں تھا کہ ماں بات کو آگے بڑھائے تو وہ اُسے کھری کھری سنائے۔ پندرہ منٹ گذر گئے لیکن گنگوا نے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر بعد ماں کے بولنے کی آواز آئی.... اس نے بھگتی وجے کا پاٹھ شروع کر دیا تھا۔ کٹی کا پارہ اور چڑھ گیا۔ ماں کا دھیان مزید ایک گھنٹہ تک کسی دوسری طرف نہ جائے گا لہٰذا اب اسے خود بات شروع کرنی چاہیے۔

"ماں..... ماں...... ماں...." وہ زور سے چلایا۔ کتاب میں محو گنگوا کو اُس کی آواز صاف سنائی نہ دی۔ اس نے پوچھا "کیا کہا"

"راگھپا کے آنے پر..... چائے کیوں نہ بنائی؟ سنا...."

"کیا بتاؤں بیٹا، جانے دو"

"گھر میں آنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو گی تو میری عزت کیا خاک باقی رہے گی۔ سمجھی کہ نہیں؟ میں سرکاری نوکر ہوں۔ اگر میرے گھر میں ہی میری بات نہ چلے تو لوگ کیا کہیں گے یہی کہیں گے نا کہ....." کٹی نے بات آگے بڑھائی۔

"بیٹا کٹنا، چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے۔ صبح ہی لانے کو کہا تو تھا۔"

ہاں۔ ہاں۔ ہاں بھول ہی گیا۔ ماں نے صبح ہی آخری بچی پتی ڈال کر ڈبہ جھاڑ کر دکھا دیا تھا۔ 'ابھی جاتا ہوں'، یہ کہہ کر دفتر کے کاغذات دیکھنے میں لگ گیا اور پھر چائے کی پتی لانا یاد نہ رہا۔ ارے، ارے، میری یادداشت! کٹی کا غصہ کافور ہو گیا۔ اسے ہنسی بھی آئی۔ دل میں بھگوان کا شکر کیا کہ اس وقت ماں سے چائے بنانے کے لیے زیادہ اصرار نہ کیا ورنہ تحصیلدار کے دوست اور اپنے ماموں کے سامنے سرکاری نوکر کے باورچی خانے کے خالی ڈبوں کی قلعی کھل جاتی اور آج جو لڑکی دینے آیا تھا وہ کل نہیں بھی کر سکتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔

ماں کے سامنے غصہ میں چڑھی تیوری پر اب اس طرح ہنسنے میں اُسے اپنی سُبکی محسوس ہوئی چنانچہ وہ اسی طرح منہ پھلائے کوٹ اور ٹوپی پہن کر گھومنے کے لیے باہر نکل گیا۔

گنگوا کو منظر کی اس تبدیلی کا پتہ ہی نہ چلا۔ اس نے اپنی ذہانت کو کام میں لا کر ایک راستہ نکالا

گذشتہ دن یعنی سنیچر کو ہنومان جی کے لیے جو ناریل اس نے توڑا تھا اس کی تھوڑی سی گری ابھی باقی تھی گنگوانے گری نکالی، اندر سے بھنے چنے کی ڈال لی اور کٹی کی واپسی سے پہلے ہی اس نے کٹی کے لیے گولے کی مزیدار چٹنی تیار کر کے رکھ دی۔ گھر لوٹ کر کٹی نے پوجا کی اور کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ دوپہر کو ماں سے اس کا جو جھگڑا ہوا تھا اس کے سمجھوتے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آتے دیکھ کر کٹی نے چٹنی کی خوب خوب تعریف کی اور اس طرح ماں سے صلح کرلی۔ گنگوانے بھی "کیا کروں بیٹا تم بہت غصہ میں آگئے تھے" کہہ کر امن کا سبق دوہرایا۔
ماں بیٹے میں بڑی رات تک خوب باتیں ہوئیں۔

5

پرانی یادیں

"کٹنا، آج دوپہر تم غصہ میں آگئے تھے۔ تمہیں اس راگھپا کی کسی بات کا پتہ نہیں۔ ہم سب نے اس کے ہاتھوں بڑی مصیبت اٹھائی ہے مجھے وہ اذیت کبھی نہیں بھولے گی۔ مجھے ناسمجھ جان کر جتنا جھوٹ بول سکے بولنے دو۔ میرے سامنے جتنی اچھل کود کر سکتا ہے کرنے دو پر اس کا دھیان رکھنا کہ وہ تمہیں دھوکا نہ دے دے۔ وہ کسی بات سے نہیں ہچکچاتا۔ کیا وہ دوچار جھوٹ بولنے میں اونچ نیچ دیکھے گا۔ اس کی چکنی چپڑی باتوں پر تم لٹو نہ ہو جانا۔
"بیٹا! اسی کی وجہ سے یہ غریبی ہمارے پلے پڑی ہے۔ کٹنا! کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم سدا سے غریب تھے۔ نہیں بیٹا۔ ایک سیر سونا ہمیشہ میرے جسم پر لدا رہتا تھا سارے گہنے پہن لیتی تو ہاتھ اٹھا نہ پاتی تھی۔ ہر سال لکشمی نارائن کے درشن کے لیے میں پودار لکشمی بائی کے ساتھ جاتی تھی۔ انھوں نے ہمارا وہ زمانہ دیکھا ہے۔ اسی لیے وہ آج تک میری اتنی عزت کرتی ہیں...... ان باتوں کو جانے دو۔ اب انھیں یاد کرنے سے کیا حاصل؟
"میرے دن جب اچھے تھے تب ہی ایک روز اس راگھپا نے آکر تمہارے باپ کے سامنے ناک رگڑی اور کہا "زمین گروی پڑی ہے۔ پانچ سو روپیہ دیجیے۔ تھوڑا حصہ چھڑا لوں۔" تمہارے باپ دل کے بہت سخی تھے۔ کیا کیا جاتا کٹنا؟ تو جب بالشت بھر کا تھا، وہ مجھے اکیلا چھوڑ

کر چلے گئے"...... ماں سسکیاں بھر کر بولی "اب اس بات کو بھول جاؤ میں ویسے رونے دھونے والی عورت نہیں ہوں پر جب تمھیں سامنے بیٹھا دیکھ کر ان کی یاد آجاتی ہے تو دکھی ہو جاتی ہوں۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو پتہ نہیں کتنے خوش ہوتے۔ تمہارے لیے بھو کھو جنے کہاں کہاں نہیں جاتے؟ جانے دو...... اس کمینے کو پانچ سو روپیہ دے کر کھیت چھڑوانے کے بعد اس کا گھمنڈ شروع ہوا۔ اس کی بیوی جپی آج اتنی شان دکھاتی ہے، اس وقت اسے نئی ساڑی تب ہی نصیب ہوتی جب تیرے باپ: "تو اپنی گھروالی کے لیے دو نئی ساڑیاں خرید لو" کہتے..... ایسے دن بھی کبھی تھے...... ہمارے اس احسان کا یہ پھل دیا اس نے۔ یہ بھائی ہے.. ارے، یہ تو جنم جنم کا بیری ہے ــــــ تمہارا ایک سگا ماموں اور ہے۔ اس راگھپا سے چھوٹا..... اس کا نام وینکاٹی ہے..... پتہ نہیں اب زندہ ہے یا مر گیا؟ دس گیارہ سال ہو گئے کہ اس کی کوئی خبر نہیں ملی...... کچھ نیم پاگل سا تھا پر دل کا اچھا تھا۔ بھگوان سے بڑی عقیدت تھی۔ دوسروں کا لاکھ روپیہ پڑا رہے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ ہمارے گھر میں دنیا بھر کی ساری برائیاں بس اسی راگھو میں ہیں۔ ہمارا وینکاٹو کچھ دیوانہ سا تھا۔ چار درجے تک پڑھا تھا۔ راگھو کی شادی کے بعد کسی نے مذاق میں کہا کہ اب تمہاری بھی شادی کر دیں گے۔ اتنا سنتے ہی گھر چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا۔ کافی دن تک پونا میں رہا۔ بے وقوف نے کسی کو کچھ بھی بتایا نہیں تھا۔ اس کا حصہ اپنے ہاتھ لگے گا، یہ سوچ کر اس راگھو نے اس کی خیر خبر نہ لی۔ خود دھارواڑ میں گھر بسا کر آئے دن نت نیا دھندا کرنے لگا۔

"پونا میں کسی گجراتی کے گھر میں وینکاٹی پوجا پاٹ کا کام کرتا تھا۔ وہ بڑے بھاری سیٹھ تھے وینکاٹی پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔ پتہ نہیں وینکاٹی کو کسی نے کیا پڑھا دیا کہ اس کے دل میں بھی دولت کی طمع پیدا ہو گئی۔ ایک دن دو ہزار کی ہنڈی پر جعلی دستخط بنا کر کسی بینک سے رقم ہتھیالی۔ وہ تو پہلے ہی آدھا پاگل تھا۔ اس لیے یہ اس کے اکیلے کی کرتوت نہیں ہو سکتی۔ اسی زمانے میں پونا میں اس کا پتہ لگا کر راگھو دو دن اس کے پاس رہ کر آیا تھا۔ ہو سکتا ہے راگھو ہی نے اسے پٹی پڑھائی ہو، دو چار دن میں بھید کھل گیا۔ سیٹھ نے پولیس میں رپٹ لکھا دی، بس ایک دم پولیس پہونچ گئی اور اس پگلے کو تھانے لے گئی۔ تب اس نے کسی سے راگھو کو تار دلوایا، مجھے جیل میں ڈال دیں گے، بچائیے۔ تار پاتے ہی راگھو بھاگا بھاگا ہمارے پاس آیا۔ اُن کے پاؤں پکڑ کر کہا "کسی طرح میرے بھیا کو چھڑا لیجیے۔ اگر لوگوں کو پتہ چل گیا کہ ہمارے گھرانے کے کسی فرد

کو جیل ہوگئی ہے تو اب میں جو چار پیسے کما رہا ہوں وہ بھی نہیں کما پاؤں گا" میرا دل رکھنے کے لیے انھوں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا۔ اسی رات وہ راگھو کو ساتھ لے کر ریل سے پونا پہونچے۔ راگھو کی ساری کھیتی گروی پڑی تھی۔ انھوں نے پانچ ہزار کی ضمانت دی اور وینکاٹی کو چھڑا کر دھاروا ڑلے آئے۔

"وہ بہت مصروف رہتے تھے پھر بھی سدا وینکاٹی پر نظر رکھتے تھے۔ پتہ نہیں اس کمینے راگھو نے کیا کیا۔ انھوں نے ایک دن وینکاٹی کو اس کے ساتھ سونے بھیجا۔ پتہ نہیں اس راگھو نے اس کے دماغ میں کیا بھر دیا کہ اسی رات وہ گاؤں سے بھاگ گیا اور تب سے آج تک اس پاگل کا پتہ نہیں

"آگے جو ہونا تھا ہوا۔ اس کی ضمانت لے کر جو غلطی انھوں نے کی تھی اس کے نتیجہ میں دولت گھر بار سب گنوا دیا۔ گھر کا سارا قیمتی سامان کوڑیوں کے مول نیلام ہوگیا...... سارا گھر برباد ہوگیا۔ تب آکر راگھو نے آنسو بہائے۔ بڑا ڈھونگ رچایا۔ یہ سب انھیں اچھا نہیں لگا۔ اسی غم میں انھیں دل کے دورے پڑنے لگے۔ اسی میں گھلتے رہے آخر میں وہ......" کہہ کر ماں سسکیاں بھرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پرسکون ہوکر وہ پھر بولی "جانے دو۔ اب رونے سے کیا حاصل۔ اس ساری رام کہانی کو دوہرانے سے کیا فائدہ' اگلے سال یہ راگھو دھاروا ڑ چھوڑ کر بند گوڑہ چلا گیا اور وہاں کھیتی رہن سے چھڑا کر امیر بن گیا۔ اب پھر ہمیں اپنی دولت دکھانے اور ہمارا مذاق اڑانے کے لیے آیا ہے۔

"کٹنا، کچھ باتیں بتانے کی ہوتی ہیں اور کچھ نہیں...... خلاصہ یہی ہے کہ یہ آدمی اعتماد کے لایق نہیں ہے اس کے کہنے میں تم نہ آجانا"

گنگوا نے اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں بتائیں۔ رات کے بارہ بجے تک ماں اور بیٹے کی باتیں ہوتی رہیں۔ نوکری لگنے کے بعد کٹنی نے ماں سے پہلی بار اتنی باتیں سنیں۔ ماضی کا وہ زمانہ اس نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے ذہن میں ان تمام واقعات کی واضح تصویریں بن گئی تھیں۔ ان واقعات کو سن کر اس کے دل میں ماں کا احترام اور بڑھ گیا۔

6
کشمکش

ماں پرانی پیڑھی کی ہے، وہ نئی پیڑھی کا ہے۔ ہر پیڑھی کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔

ماں کے فیصلے کے خلاف چلنا کٹی کے لیے ناممکن تھا۔ اس میں شادی کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ہمارے سماج میں ایک لڑکا جب اٹھارہ بیس سال کی عمر تک پہونچتا ہے اس وقت تک لڑکیوں کے والدین اسے گھیر گھار کر یہ احساس اس کے دل میں پیدا کر ہی دیتے ہیں کہ شادی زندگی کے لیے ضروری ہے جن لڑکوں کے پاس مستقبل کا کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں ہوتا وہ اس اصول کے سامنے اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ کٹی بیاہ کے نام سے ڈرتا تھا لیکن وہ اس رائے کا ضرور ہو گیا تھا کہ آج نہیں تو کل بیاہ کرنا ہی پڑے گا۔ ساتھ ہی دفتر میں روزانہ اُسے کوئی نہ کوئی تلخ تجربہ ضرور ہوتا تھا۔

اس دن سڑک پر رخصت ہوتے وقت راگھپا نے جو باتیں کہی تھیں دفتر میں وہ بھی کٹی کے کانوں میں گونجتی رہیں: 'کٹا' ہم اور تمھاری ماں پنشن لینے کی عمر کو پہونچ گئے ہیں۔ ہماری باتیں اپنے حسب حال ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں تم اپنی ماں پر غصہ نہ کرنا۔ پرانے زمانے کی عورتیں اس نئی پیڑھی کی باتیں نہیں سمجھتیں۔ ہمارے جھگڑے اور میل ملاپ چلتے ہی رہتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کو ماضی کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔ آگے چل کر تم لوگوں کو جو بننا ہے اس کی طرف توجہ دو۔ . . . ."

راگھپا کی یہ باتیں اسے ٹھیک ہی معلوم ہوئی تھیں۔

کٹی کے سامنے بے شمار مسائل تھے۔ اس میں نئی انسانیت پیدا ہو رہی تھی ماضی کے ساتھ تعلق قایم رکھنا روز بروز مشکل ہوتا تھا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں وہ جن کے گھر 'بار بھوجن'[1] کرتا تھا۔ ان کے سامنے پڑ جانے پر کٹی کے سامنے یہ اخلاقی مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا کہ ان کو سلام کرے یا نہیں۔ کٹی کے یہ محسن گاؤں بھر میں تھے۔ اس نے نیکر چھوڑ کر پاجامہ پہننا شروع کر دیا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ اس وجہ سے ایسے لوگ اس پر ہنسیں گے۔ اُس کے بال لمبے ہونے لگے تھے چوٹی پتلی ہونے لگی تھی۔ اس نے آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر مانگ سنوارنا شروع کر دیا تھا۔ چوٹی کو چھپانے کے لیے وہ کالی ٹوپی پہنتا تھا۔ کبھی کبھی چوٹی کے بال ٹوپی کے باہر نظر آ جاتے تھے۔ اُس کے دوست اس پر اسے چھیڑتے۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچنے لگتا کہ ان سے کہہ دے "میرے کپڑے، میرے بال میرا نجی معاملہ ہیں تمھیں ان سے کیا واسطہ" لیکن اتنا کہنے کے لیے اُسے اپنے سے بڑے کلرک کی صلاح کی ضرورت تھی ۔۔۔! وہ سوچتا تھا کہ آج نہیں تو کل یہ لوگ اس کے کام آئیں گے۔ پھر وہ کسی سے ذرا بھی سختی

---

[1] کھاتے پیتے گھروں میں غریب طالب علم باری باری کھانا کھاتے تھے۔ اب یہ رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔

سے بول نہیں سکتا تھا۔

خوف کا یہ احساس کٹی کے ذہن پر طاری رہتا تھا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایسے تکلیف دہ موقعوں پر وہ اپنے کو یہ کہہ کر سمجھا لیتا تھا کہ میں بار بھوجن پانے والا لڑکا ہوں۔ غصہ کرنے سے کیسے کام چلے گا۔ اپنے کو اس طرح دبا لینا اس کی عادت بن گئی تھی۔ اسی لیے اب وہ غصہ کر ہی نہ پاتا تھا۔ اگر کبھی غصہ ہوتا تھا تو صرف گھر میں اپنی ماں پر۔ غصہ کو مارنے کی اس کی عادت کا ایک اثر یہ ہوا کہ اب اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے والدین اور بھگوان تک پر لعنت بھیج دے۔ ماں نے اب تک کئی بار اپنی دولت مندی کے زمانے کا ذکر کیا تھا۔ وہ سب ہوتا تو آج وہ احساس کمتری کا کیوں شکار ہوتا!

یوں تو وہ بہت بیزار تھا لیکن اس کے دل میں ماں کے لیے بے پناہ محبت اور رحم تھا۔ کٹی نوکر ہوا تو پڑوسی دیسائی جی نے اسے کھانے پر بلایا اور کہا "کٹی، تمہاری ماں نے بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ اس نے تمہیں کس طرح پرورش کیا ہے، یہ ہم جانتے ہیں۔ اسے سکھ دینا۔" نوکری ملنے کی خوشی میں اس نے کہا تھا "ان ہی کی وجہ سے مجھے نوکری ملی"۔ کہنے کو تو اس نے یہ کہہ دیا لیکن اسے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ یہی نہیں کھانا دینے کے لیے اندر آتی ہوئی دیسائی جی کی بھتیجی بھی تو اس کی یہ بات سن کر حقارت سے ہنس پڑی تھی۔ دیسائی جی کی بیوی ونو بائی بولی تھی "پگلے ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں۔ اب تو شادی کر کے گھر بسانے کے قابل ہو گیا ہے۔ کسی کی باتوں میں نہ آنا، دھیان رہے" کٹی یہ سن کر ایک عجب طرح کی توہین اور بے چارگی محسوس کرتا تھا۔

پھر ایک دن کچہری میں اس کو دوسری جگہ تبدیل کر دیا گیا۔

کٹی کو پیادہ حسین سے بہت ڈر لگتا تھا۔ حسین کے بارے میں دفتر میں یہ مشہور تھا کہ وہ بڑا ہوشیار آدمی ہے اور لوگوں کو خوب فائدہ پہونچاتا ہے۔ اب تک کٹی کا حسین سے صرف غائبانہ تعارف تھا۔ کچہری میں حاضر ہونے سے پہلے کٹی صابن سے دھلی سفید قمیض، خاکی نیکر اور ٹوپی پہن کر وہاں پہونچا تو حسین نے اُسے بڑی چبھتی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ تب سے کٹی کا چال چلن، پہناوا اور بات چیت بھلے ہی کسی اور کی نگاہ سے بچ جائے لیکن حسین کی تیکھی نظروں سے نہ بچ سکتا تھا۔ راستہ میں ملنے پر جب حسین اسے سلام کرتا تو کٹی کو لگتا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ پر آج حسین نے خود آکر اُسے سلام کیا۔ کٹی نے اس تبدیلی کو دیکھا تو متعجب ہو کر پوچھا "کیا بات ہے؟" حسین نے کہا

"باہر کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

کٹی چپ چاپ باہر آیا۔ وہاں تہمد پہنے کالا چشمہ لگائے ایک شخص اس کا منتظر تھا۔ حسین بھی تھوڑی دور پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے وہ بھی ان کی باتوں میں شریک ہو۔ کٹی سمجھ گیا یہ سب کرسی کا اثر ہے۔ اب تک کٹی نے اپنی نئی جگہ کا چارج نہیں لیا تھا۔ ایک روز قبل ہی اسے تبادلہ کا حکم ملا تھا۔ کٹی کو یہ امید نہ تھی کہ اتنی جلد اس کے تبادلہ کی خبر دفتر سے باہر بھی پھیل جائے گی۔

کالے چشمے والے شخص نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "میرا نام کی ٹی کھنا ہے۔ میرا ایک جھگڑے کا معاملہ آپ کے پاس آئے گا یہ کیس بالکل کلیر ہو چکا ہے۔ اب تک فیصلہ ہمارے حق میں ہو جاتا آپ کی جگہ پہلے جو صاحب تھے انہوں نے کہا تھا کہ کیس کا نوٹ تیار کر لیا ہے لیکن ان کے تبادلے سے ہمیں تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ کیس بالکل صاف ہے۔ اگر آپ ان کے لکھے ہوئے نوٹ کو ہی پیش کر دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ کیس کلیر ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " یہ باتیں سن کر کٹی نے اتنا ہی کہا:

"میں نے ابھی چارج نہیں لیا۔ بعد میں دیکھیں گے۔"

حسین کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ کٹی کے جواب سے اس کے دل میں کٹی کی عزت بڑھ گئی۔ "دیکھیں گے" ایسے آسان لفظ کا حسین ایک ہی مطلب نکالتا تھا "دیکھیں گے" کہنے والا صاحب ہی اصلی صاحب ہے۔ حسین کو کرسی پر زبردست اعتماد تھا۔ جیسے وکرماجیت کے تخت پر بیٹھ کر ایک بچہ بھی انصاف کر سکتا ہے ویسے ہی اچھی کرسی ملنے پر ایک بے وقوف بھی اصلی صاحب بن سکتا ہے۔ حسین کے تجربات کے خزانہ میں کٹی کا حالیہ تجربہ ایک اور اضافہ تھا۔ کٹی اپنی نئی جگہ کا چارج لیے بغیر اگر 'دیکھیں گے،' کہہ سکتا ہے تو یہ اس کرسی کی عظمت کے سوا اور کس کا اثر ہے۔ کٹی کے لیے جو نیا احترام حسین کے دل میں جاگا تھا اس کے جوش میں وہ اس کالے چشمے والے پر ٹوٹ پڑا۔ "کیس کلیر... کیس کلیر..... کیا بک رہا ہے۔ کرسی کی بھی عزت کرو نا۔" کالے چشمے والے اپنی انٹی سے دو تین روپے نکالے اور پھر مین میخ کرنے لگا۔ حسین نے اسے پھر ڈانٹ بتائی "نئے صاحب ہیں اسی لیے یہ ڈول دکھا رہا ہے،" پھر کٹی سے بولا "صاحب، آپ اندر چلیں، میں اس سے نپٹتا ہوں۔"

اگلے پندرہ منٹ میں کٹی کے ہاتھ میں پانچ روپیہ کا ایک نوٹ پہونچ چکا تھا، حسین کی جیب میں بھی ایک دو روپیہ کا نوٹ داخل ہو گیا تھا۔ اب تک کٹی کو اس قسم کی آمد کا تجربہ نہ تھا۔ حسین کی دوستی کا مطلب کیا ہے ابھی تک اس نے صرف سن رکھا تھا۔ کٹی کے اس نئی جگہ پر تبادلہ ہونے سے بہت سے لوگوں کو اس سے جلن ہونے لگی تھی۔ ہیڈ کلرک جوشی رام رائے کو پتہ تھا کہ تحصیلدار نے

اس کالے چشمے والے کے سبب سے ہی یہ جگہ کٹی جیسے نوسیکھے کو دی تھی۔۔۔۔۔ لیکن کٹی کو پہلے ہی دن پانچ روپیہ کی آمد اور حسین کی دوستی سے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ حسین کی دوڑ دھوپ پر نظر رکھنے والے کچھ کلرک دفتر سے چھوٹتے ہی کٹی کو پکڑ کر چائے کی دکان میں گھسیٹ لے گئے کٹی ابھی تک چائے کی دکان پر نہیں گیا تھا لیکن اس دن حسین سے دوستی کا افتتاحی جشن منانے کے لیے چائے کی دکان میں جانا ہی پڑا۔

چھوت چھات کے ڈر سے کٹی نے صرف ایک پیالہ دودھ پر ہی اکتفا کیا۔ اس نے دوستوں پر پندرہ آنے خرچ کر دیے۔ رام رائے نے کٹی کے کھلائے ناشتہ کا لطف لیتے ہوئے آدھے گھنٹے تک اس پر تبصرہ کیا۔ پھر کٹی کے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "تمہیں چائے نہیں چاہیے، سگریٹ نہیں چاہیے، تمباکو نہیں چاہیے، گپ بازی نہیں چاہیے، بیوی نہیں چاہیے تو تم نوکری کیوں کرتے ہو کرشن جی!" کٹی ان سوالات کا جواب نہ دے سکا۔ پارٹی ختم ہوتے وقت رام رائے نے کہا: "یہ پیسہ اسی مصرف میں لینا چاہیے، یہ کسی اور کام نہیں آسکتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم سب مالدار بن جاتے،" رام رائے کی ان ناصحانہ باتوں کی سب ہی لوگوں نے پرزور تائید کی۔

کٹی پر اس نصیحت کا اثر صرف ایک لمحہ کے لیے ہوا تھا۔ جیب میں سے ریزگاری کی چھن چھن کی آواز آرہی تھی، چور بلی کی طرح کٹی گھر کی سمت روانہ ہوگیا۔ راستہ میں سامنے سے پودار لکشمی بائی آتی دکھائی دی مگر وہ اس سے نظر بچا کر بات کیے بغیر گھر کی طرف بڑھ گیا۔

ہیڈ کلرک جوشی رام رائے کو معلوم تھا کہ تحصیلدار صاحب اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ کٹی نے اپنی ساری میز چھان ماری کہ اس کے پیشرو کلرک نے کوئی نوٹ بنا کر رکھا ہے یا نہیں لیکن اسے کچھ نہ ملا۔ وہ رام رائے سے مشورہ کرنے اس کے پاس گیا۔ جوشی رام رائے کو لوگ شنی رام رائے بھی کہا کرتے تھے۔ کٹی کی چائے کی دعوت والے دن ہی اس نے سوچا تھا کہ اسے چوٹ دینا چاہیے چنانچہ کٹی کے لائے ہوئے کاغذات کو دیکھ کر "کیس تو سارا کلیر ہے" کہہ کر چشمے والے کی ٹلی بھینا کی موافقت میں نوٹ لکھ دیا۔ اسی نوٹ کو کٹی نے اپنے ہاتھ سے خوش خط نقل کرکے تحصیلدار صاحب کے پاس دستخطوں کے لیے بھیج دیا۔

دس منٹ بعد تحصیلدار صاحب کا بلاوا آیا۔ کٹی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ رام رائے کے پاس جاکر پوچھا اس کا کیا جواب دینا ہوگا۔ رام رائے نے اسے جوش دلاتے ہوئے کہا "تحصیلدار کو پتہ ہی کیا ہے، اپنا سر، اگر وہ کچھ کہے تو کہہ دینا میں نے تو سب قاعدے کے مطابق کر رکھا ہے

کیس تو کلیر ہے۔ اگر اب تم نے ڈھیل دی تو وہ تمہارے سر پر کالی مرچ پیسے گا۔"

کٹی تحصیلدار صاحب کے کمرہ میں داخل ہوا تحصیلدار بھرا بیٹھا تھا۔ کٹی نے اس کی میز پر ہاتھ ٹیک کر پوچھا۔

"کیا ہے صاحب؟"

"پہلے میز پر سے ہاتھ اٹھاؤ" صاحب زور سے چلایا۔ کٹی جھٹ سے میز پر سے ہاتھ ہٹا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

تحصیلدار نے اس سے سیدھے ہی پوچھا "کتنی رشوت لی؟"

"نہیں صاحب....."

"صاحب کے بچے۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

کٹی ہکا بکا ہو کر چپ چاپ کھڑا رہا۔

"نوٹ لکھا ہے نوٹ! تجھے کس نے میٹرک میں پاس کر دیا۔ کس نے تجھے نوکری پر لگایا۔ جاؤ، جا کر گدھے چراؤ۔"

"کیوں صاحب، مجھ سے کوئی غلطی...."

"غلطی نہیں گدھے، رشوت لی یا نہیں؛ اس پارٹی کا وہ پوائنٹ اپنے نوٹ میں کیوں نہیں لکھا" کٹی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ نادم ہو کر بولا "غلطی ہوئی صاحب"

تحصیلدار کا غصہ کچھ کم ہوا۔ "کرشنا جی، تم نئے ہو، دوسروں کو وہ جگہ دینے دو ں تو ستیا ناس مار دیں گے یہی سوچ کر یہ جگہ تمہیں دی۔ اس جگہ کو سنبھالنے ابھی تمہیں دو دن بھی نہیں ہوئے کہ تم بھی وہی سیکھنے لگے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پیسہ مت کھاؤ۔ پر قانون کے مطابق چلو۔ اتنا کھاؤ کہ ہضم کر سکو۔ جو آج کھایا ہے اسے کل اگلنا پڑے تو فائدہ کیا۔ پہلے نوکری سنبھا لنا چاہیے اس کے بعد جو چاہو سو کرو۔"

رام رائے کی سکھائی ہوئی باتیں بھگوان کے کرم سے صاحب کے غصہ کے سبب فراموش ہو گئیں۔ مزید کچھ کہے بغیر جیسا صاحب نے بتایا ویسا نوٹ لکھ کر صاحب کے سامنے رکھا۔ صاحب نے اس کی ہجوں کی غلطیوں پر نا راضگی ظاہر کرتے ہوئے نوٹ پر دستخط کر دئے۔

کٹی کا چہرہ اس توہین پر شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ اپنی میز کی طرف واپس گیا۔ رام رائے کو اپنا منھ دکھانے کو اس کا دل نہ چاہا۔ اس کی بتائی باتیں ایک طرف، اپنے منھ سے غلطی کا اعتراف،

صاحب کے کہنے کے مطابق نوٹ لکھنا، صاحب کا غصہ اترتے دیکھ کر اطمینان ہونا: اس کی یہ کمزوریاں اس کے سامنے ناچ ناچ کر اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ سب ہی کلرک اپنے کاغذوں میں محو ہونے کا دکھاوا کرتے ہوئے سر جھکائے بیٹھے رہے۔

اس شام کو کٹی کا سارا گھمنڈ چور چور ہو گیا۔

اس نے سوچا، ہاں، یہ صحیح ہے کہ کام اگر ٹھیک نہ ہو اتب بھی ان غلطیوں سے بچنا چاہیے آخر میں میری بردباری اور عاجزی سے کام چل سکتا ہے لیکن ایسی غلطیوں کو ظاہر نہ ہونا چاہیے۔ غلطیاں سوئی کی طرح چبھتی ہیں۔

7

گنگوا کی پریشانی

گنگوا اس دن شام کے چھ بجے دیسائی کے گھر گئی۔ دیسائی کا بڑا لڑکا اچیت جب سے کامرس پڑھنے کے لیے بمبئی گیا تھا تب سے ان کے منجھلے لڑکے وسنت راؤ کو گھر کے معاملات میں بڑی دلچسپی اور لگن پیدا ہو گئی تھی۔ وسنت راؤ کو گنگوا اور اس کا بیٹا ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کٹی ہر سال امتحان میں پاس ہو جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے پہلی ہی کوشش میں میٹرک پاس کر لیا اور وسنت راؤ سے آگے نکل گیا۔ جب دیسائی کٹی سے یہ کہتے تھے کہ ہمارے لیے کٹی اور وسنت میں کوئی فرق نہیں تو وسنت سمجھتا کہ اس کے باپ کی شفقت کٹی پر زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً دو مہینے پہلے اُسے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ کٹی کی ماں کبھی کبھی پوشیدہ طور پر دس پندرہ روپیہ لے جاتی رہتی ہے۔ وسنت راؤ کو مار دھاڑ کی فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا لیکن اس دن پتاجی نے اسے پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ اس غم میں وسنت راؤ کو اپنی زندگی ہی بیکار سی لگنے لگی۔ وہ آنگن میں چٹائی پر مکھیاں اڑاتا بیٹھا رہا۔ اسی وقت گنگوا گھر میں داخل ہوئی۔ وسنت راؤ نے جھلاہٹ سے کہا "آئیے، کتنا روپیہ چاہیے، پوچھو اڑے ہم لوگوں نے پیسے کے پیڑ لگوا رکھے ہیں۔"

گنگوا کو بات چبھ گئی۔ وہ تیز تیز اندر گئی۔ دیسائی جی آرام سے پان چبا رہے تھے! ان کے

سامنے کھڑی ہو کر وہ زور سے بولی "کیوں گوپنا، یہ تو سچ ہے کہ ہم آپ کے احسان مند ہیں لیکن میرے مانگنے پر جو تم پیسے دیتے ہو، وہ کس کے ہیں۔ یہ ذرا اپنے بیٹے کو بتا دو۔"

دیسائی جی کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ اُسے بلا کر ڈانٹا۔ سینما دیکھنے کے لیے تین آنے نہ ملنے پر وہ بڑ بڑاتا ہوا چلا گیا۔ گنگوا کی کہی ہوئی بات اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کس کے پیسے؟ سوال کے مطلب کے بارے میں وہ سوچنے لگا۔

دیسائی جی یہ جانتے تھے کہ گنگوا کے اس وقت آنے کا کوئی خاص سبب ہوگا۔ دیوار سے پیٹھ لگا کر انہوں نے گنگوا کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں۔ وہ گنگوا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن بلا وجہ وہ اس خاندان کے معاملات میں دخل اندازی کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ انھیں اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ ہَوَن کرتے کرتے ہاتھ جلا ڈالنے والی کہاوت کہیں ان پر بھی صادق نہ آجائے۔ گنگوا اپنے تمام مسائل ان کے سامنے رکھتی تھی لیکن وہ صرف بہت ضروری معاملات میں ہی کچھ کرتے تھے۔ وہ گنگوا کی اس قسم کی چھوٹی موٹی باتیں سننا پسند نہیں کرتے تھے جیسے کٹی مجھ سے پہلے جیسی بات نہیں کرتا۔ کٹی بہت پیسے خرچ کرتا ہے۔ کٹی رات کو بہت دیر سے گھر آتا ہے۔ اس کے علاوہ دیسائی جی جس کام کو ہاتھ میں لیتے تھے اسے پورا کر کے ہی دم لیتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا کسی کام میں ہاتھ نہ ڈالتے تھے۔ دوسرے لوگوں کے معاملات میں غیر ضروری دلچسپی لینا مناسب نہ جانتے ہوئے وہ جہاں تک ممکن ہوتا دور ہی رہتے۔ لیکن گنگوا ان کے نہ چاہنے پر بھی ہمیشہ اپنی مشکلات ان کے سر پر ہی ڈالتی جاتی تھی۔

"گوپنا، کٹی نے اس مہینے کتنے روپیہ دیے؟"

"کوٹ سلانے کو کہہ رہا تھا۔ پانچ روپے دیے ہوں گے۔"

"تم بہت خرچ کرنے لگے ہو ایسا ایک بار اسے سمجھا دو نا۔ وہ بہت فضول خرچی کرنے لگا ہے"

دیسائی جو مردوں کے معاملات ہی سے واقف تھے جھنجھلا کر بولے "تمہارا بیٹا کوئی احمق گنوار ہے؟ اچھی نوکری کرتا ہے، پیسے کماتا ہے، اب بڑا بھی ہو گیا ہے، ایسی باتیں تمھیں کہنی نہیں چاہئیں اگر تم کہہ دو تو بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ ہمیں تو ایسی باتیں منہ نکالنا بھی نہیں چاہئیں۔"

گومگو کا سلسلہ گنگوا کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کسمسا کر بولی "تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے چپ چاپ دیکھتی رہوں۔" اسے ہچکی آگئی۔

اس کے اس ڈھنگ سے دیسائی جی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں کوئی اور

ہی بات ہے۔اس خاندان کے نجی معاملات میں دخل نہ دینے کے خیال سے دیسائی جی کچھ دیر خاموش رہے لیکن گنگوا کے آنچل میں منھ چھپا لینے سے وہ چپ نہ رہ سکے اور پوچھا "کیوں کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے؟ روزانہ کی طرح غصہ میں بھرا کچہری سے گھر آیا، پھر بولا، رات کو گانا سننے کے لیے جاؤں گا، جانے کہاں ..... " آگے گنگوا نہ بول سکی۔

دیسائی جی نے اسے تسلی دے کر تمام باتیں پوچھیں۔

گانے کی محفل کا انتظام گنگوا کے بھائی راگھپا کے گھر میں تھا۔

بات یہ ہوئی کہ راگھپا نے دفتر میں آکر جب کٹی کو مدعو کیا تو اسے اچھا نہ لگا۔ گانے کے نام سے کٹی کو اور رنگ زیب جیسا پیار تھا۔ لیکن راگھپا نے جاتے جاتے کہا تھا کہ تحصیلدار صاحب بھی گانے کی محفل میں آرہے ہیں، وہاں میں ذاتی طور پر تمہارا تعارف ان سے کرادوں گا اس لیے کٹی کے دل میں وہاں جانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ کٹی نے سوچا: گالی دینے کے فن میں طاق تحصیلدار سے تعارف ہو جائے تو شاید گالیوں کی توپ سے بچاؤ ہو سکے۔ راگھپا ماما اس کے لیے بھگوان کی طرح آئے تھے۔

نئی جگہ پر تبادلہ ہونے کے بعد سے کٹی کا رویہ گھر میں بھی بدل گیا تھا۔ صبح دیر سے اٹھتا، شام کو گھومنے جاتا تو دیر سے لوٹتا۔ آتے ہی بھوک نہ ہونے کا بہانہ کرتا اور اصرار پر دو نوالے زہر مار کرکے بستر پر پڑ جاتا۔ اس نے یہ سب حرکتیں شروع کردی تھیں۔ چار پیسہ کی بالائی آمدنی کی وجہ سے چپ سادھتا چلا جارہا تھا۔ گھر میں بات چیت کرنا کم کردیا تھا۔ پہلے کا سا بچپنا اب ختم ہو گیا تھا اس وجہ سے گھر میں خاموشی چھائی رہتی تھی۔ پہلے کی طرح کھانے کے وقت وہ ماں سے کچھ چھپا رہا ہو۔ گھر پر کٹی کے بات نہ کرنے کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اس کی بالائی آمدنی کی خبر اگر ماں کو ہو گئی تو کہیں وہ اس سے پیسے نہ مانگ بیٹھے یا...... یا... شرم سے۔ اس سے گنگوا کو دلی صدمہ ہوا۔ کچھ دن یہ سوچ کر چپ رہی کہ شاید زیادہ کام کرنے سے تھک جاتا ہے۔ آخر ایک روز اپنے مادرانہ اختیار سے بولی:

"کٹی تحصیلدار صاحب تمہارے کام کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ان کی مرضی کا دھیان رکھنا بھیا۔ آج کے انارس کتنے اچھے بنے ہیں۔ دو چار گرم گرم تیار کرکے دیتی ہوں۔ ان کے یہاں دے آنا۔"

کٹی کو اس طرح کی بیکار باتوں سے چڑھ تھی۔ جو بات اس کی ماں کی سمجھ سے باہر ہے اس میں کیوں دخل دیتی ہے، یہ سوچ کر اس پر برس پڑتا۔ اُسے اس بات کا غصہ تھا کہ آخر ماں کی

سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ ماں جب تحصیلدار کا نام لیتی تو اسے ایسا لگتا جیسے وہ یہ جتا رہی ہے کہ اُسے نوکری ماں کی کوشش سے ملی ہے۔ اسی سے وہ توہین محسوس کرکے طیش میں آجاتا اور اس پر چلاّ پڑتا۔ بیٹے کا دفتر سے جل بھن کر آنا گنگوا کے لیے روز کا تجربہ ہو گیا تھا۔

گنگوا اسے برداشت کر لیتی لیکن جس پودے کو اس نے دس سال تک سینچا تھا اس پر پھل لگنے کا وقت آتے ہی راگھپا اسے چرانے آگیا، یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت اور ناقابل معافی تھی۔ صرف اس دن کٹی ماں کو دھوکا دے کر فتح مند ہوا۔

اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے یہ کہتے ہی کہ وہ راگھپا کے گھر جا رہا ہے، ماں ابل پڑے گی۔ اس لیے اس کا غصہ اترنے تک چپ ہی رہا۔ آخر میں کپڑوں کا صندوق الٹتے پلٹتے ہوئے کچھ بے اطمینانی کے لہجے میں بولا "تحصیلدار صاحب بھی گانا سننے آئیں گے۔ وہاں اس سے تعارف ہو جائے گا اس لیے ہاں کر دی تھی۔ تمہارے راگھو کی بیٹی کے گلے میں ورمالا ڈالنے نہیں جا رہا ہوں۔ گھر آتے ہی تمہارا یہ سنگیت۔ صبح بھی تمہاری یہی چیخ پکار تھی۔ پہننے کو ایک بھی استری کیا ہوا کوٹ نہیں۔ کیا پہن کر جاؤں۔ اچھا ہی میلا کوٹ پہن کر تحصیلدار کے سامنے جا رہا ہوں۔"

گنگوا کچھ دیر کو بے وقوف بن گئی۔ اس طرح کامیابی کے ساتھ ماں کو دھوکا دینے میں کٹی کو بڑا لطف آیا۔ نئی جگہ پہونچ کر وہ باتیں بنانا سیکھ گیا تھا۔ اسے غصہ دلا کر پھر اس کا منھ بند کرنا کوئی معمولی کامیابی ہے؟ لیکن اتنے میں گنگوا سنبھل گئی:

"تحصیلدار سے تعارف کے لیے اس راگھو کی کیا ضرورت ہے۔ بیکنٹھ جانے کے لیے لنگڑے واستپا[1] کی مدد درکار ہے۔ میں اتنے دن سے کہہ رہی ہوں کٹی بیٹا، تحصیلدار کے گھر ایک بار ہو آ انھیں کچھ چاہیے تو نہیں پوچھ کر آ۔ پرانی جان پہچان چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ میری سننے والا کون ہے؟ اب تحصیلدار سے پہچان کرانے کے لیے راگھپا ماما ضروری ہو گیا!"

"ماں تجھے جس بات کا پتہ نہیں اس میں کیوں بولتی ہے۔ اب دوسرے تحصیلدار ہیں۔ اُنگڑی تحصیلدار کا تبادلہ ہوئے پانچ مہینے ہو گئے۔"

گنگوا کو ایسا لگا جیسے وہ گر پڑے گی۔ اُس کے منھ سے ایک بھی لفظ نہ نکلا۔

---

[1] بھیک مانگ کر گزارہ کرنے والے۔

انگڑی تحصیلدار گنگوا کے شوہر کے دوست تھے۔ اپنے شوہر کی زندگی میں بڑے آدمی کی بیوی ہونے کے ناتے وہ تحصیلدار کی بیوی سے برابری کا نہیں، بلکہ ذرا بڑے پن کا رویہ رکھتی تھی اس وقت یہ تحصیلدار نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں جب وہ کئی بار تبادلہ ہو ہو کر دھارواڑ آئے تو اسے ان کے سامنے جانا ٹھیک نہ لگا کیونکہ اب اس کا وقت بگڑ گیا تھا۔ کٹی کے میٹرک پاس ہونے کے بعد اس کی نوکری کے لیے اپنی آن بان کو بالائے طاق رکھ کر پرانے تعلقات کی یاد دلانے دس سال بعد وہ تحصیلدار صاحب کی چوکھٹ پر گئی تھی۔ انھوں نے بھی پرانی جان پہچان کو یاد کر کے اس کا کام خوشی خوشی کر دیا تھا۔ گنگوا ان کی بہت شکر گزار تھی۔ ان ہی دنوں تحصیلدار صاحب کی بارہ سالہ لڑکی نیلوا کے لیے لڑکے کی تلاش ہو رہی تھی۔ جب یہ لڑکی پیدا ہونے والی تھی تب گنگوا کے شوہر نے دوڑ دھوپ کر کے اپنے خرچ سے سول سرجن کو گھر بلایا تھا۔ تحصیلدار صاحب کی بیوی نے گنگوا کو وہ بات یاد دلاتے ہوئے اپنی ممنونیت کا اظہار کیا۔ گنگوا کو اس بچی سے خصوصی اُنسیت تھی۔ اس کی یہ بڑی خواہش تھی کہ نیلوا کا رشتہ طے ہوتے ہی اس کے لیے اچھا سا جوڑا تیار کرے اس نے کٹی سے کہہ رکھا تھا کہ اس کی شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی اُسے بتائے۔ دو ایک بار پوچھنے پر کٹی بڑبڑا دیا تھا کہ ابھی معلوم نہیں اور بعد میں یہ کہہ کر یقین دہانی کرائی تھی کہ پتہ لگتے ہی تجھے فوراً بتا دوں گا، تو مجھ سے پوچھا مت کر لیکن اس نے تو تبادلہ کا ذکر بھی نہیں کیا۔ کم سے کم اس موقع پر گنگوا گھی میں انارس تل کر ان کے گھر بھیج سکتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ عزت نفس کے احساس سے وہ اس دن کے بعد سے ان کے گھر نہیں گئی تھی لیکن تبادلے کے بہانے ان کے گھر جا کر تھوڑی مٹھائی وغیرہ دے کر آتی تو اچھا ہوتا۔ پر کیا اسے تبادلے کی خبر ہی نہ دینی چاہیے تھی اس فریب کے سبب گنگوا آگے کچھ نہ بول پائی۔ اس کا جی جل گیا۔ ادھر ماں سے جھگڑا کر کے اس کا منھ بند کرنے میں کٹی کے دل کو بڑی خوشی ہوئی۔

دیسائی جی کے سامنے گنگوا نے ساری بات اپنے نقطۂ نظر سے بتائی اور راگھیا کے بارے میں اپنے دو خاص اندیشوں کا بھی ذکر کیا۔ اگر اس نے کٹی کو بری عادتیں ڈال دیں تو کیا ہوگا۔ کٹی کے کان بھر کر وہ اپنی بیٹی اس سے بیاہ دے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔

گنگوا یہاں تک کہہ پائی تھی کہ وینو بائی نوکرانی سے کچھ کہنے کے لیے پچھواڑے گئی۔ موقع دیکھ کر گنگوا نے دیسائی جی سے کہا۔ ''گوپنا، ایک بات بتاتی ہوں، کسی سے مت کہیے گا۔ یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہی رہے راگھیا کا نام لیتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔

پھر بھی اس کی لڑکی کی شادی ہو جانی چاہیے بھگوان کے کرم سے اس کی شادی ہو جائے لیکن میرے گھر میں نہ ہو۔ یہی میری خواہش ہے۔ تم پوچھوگے کیوں؟ اتنے دنوں سے جو بات میں نے چھپا رکھی تھی وہ بتادوں، کیونکہ نوبت ہمارے گھر تک آپہونچی ہے۔ ہمارے راگھو کی شادی کے بارے میں تمہیں معلوم نہیں۔ شادی سے پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بعد میں جب شادی کی بات چلی تو وہ انکار کرنے لگا۔ تب اس لڑکی کی ماں میرے شوہر کے پاؤں پکڑ کر کہنے لگی 'میری بیٹی کی عزت بچا لیجیے'۔ یہ سنتے ہی وہ گئے اور راگھو کو پکڑ کر کہا "چپ چاپ شادی کرلے ورنہ ہنٹروں سے کھال ادھیڑ دوں گا۔ گدھے پر بٹھا کر سواری نکلوادوں گا، ان کی اس دھمکی سے وہ اس لڑکی سے شادی کرنے کو تیار ہوا۔ ایسے آدمی کی بیٹی کو میں اپنے گھر میں نہیں چاہتی بھیا" یہ سن کر دیسائی جی نے یہی کہا "گنگوا اتنے دنوں تک تم نے یہ بات اپنے پیٹ میں رکھی۔ آئندہ بھی کسی سے نہ کہنا، اپنے تک ہی رکھنا"

دیسائی جی نے محسوس کیا کہ وہ جتنا دور رہنا چاہتے تھے اتنا ہی وہ دلدل میں پھنستے چلے جارہے تھے۔ وہ سوچنے لگے، جتنی جلد ممکن ہو اس گھر کے معاملات سے چھٹکارا پالینا چاہیے اتنے میں وینو بائی اندر آئی اس لیے وہ بات وہیں ختم ہوگئی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرکے گنگوا اپنے گھر چلی آئی

8

سنگیت سبھا

کٹی کو سنگیت سبھا میں بغیر استری کا کوٹ پہن کر جانا پڑا۔ اس نے سوچا کہ اس کوٹ کے حسب حال وہ تحصیلدار صاحب سے انکسار کے ساتھ پیش آئے گا۔ کٹی یہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ سنگیت سبھا کیسی ہوتی ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں اس کی جو تصویر بنائی وہ یہ تھی کہ ایک کمرے میں وہ اور راگھیا ماما، تحصیلدار صاحب کے روبرو بیٹھیں گے۔ راگھیا اس کی تعریف کرے گا۔ تحصیلدار صاحب پر تائیدی مسکراہٹ کے ساتھ سنیں گے اور وہ خود سر جھکا کر نیازمندی سے ان کی باتیں سنتا رہے گا۔ سنگیت سبھا میں ایک گویا بھی ہونا چاہیے، لیکن کٹی کی خیالی تصویر میں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ سات بجے جب کٹی ماما کے یہاں پہونچا تو اسے پہلے ہی مایوسی ہوئی۔ اس کے

پہونچنے پر اس کا استقبال کرنے کے لیے راگھپا ماما گھر میں موجود نہیں تھا۔ تحصیلدار بھی ابھی نہیں آئے تھے کسی نے بھی اس سے اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔ مجبوراً چپل باہر اتار کر وہ گھر میں داخل ہوا۔ پورے صحن میں ایک سرخ جاجم بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں جہاں جاجم نہیں تھا ایک پیٹرومیکس رکھا تھا جس کے چاروں طرف کیڑے جمع تھے۔ ریشمی پگڑیاں اور اونی کوٹ پہنے ہوئے چھ سات گھریلو قسم کے مہذب لوگ جاجم کی جانب رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے گرمی کی گرمی سے ان کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ جاجم کے دوسرے سرے پر سات سے بارہ سال تک کی عمر کے بچے ایک گھیرا بنا کر ماسٹروں، کھیلوں اور اسی قسم کی دوسری باتوں پر دھیمی آوازیں تبصرہ کر رہے تھے۔

کٹی کو داخل ہوتے، اپنے خیالات میں مگن، حیرت زدہ اور سیر چشم ان لوگوں نے ایک بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس پر نظریں جمائے ہوئے اپنی باتوں میں مصروف رہے۔ بچوں نے تو اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ دوڑ کر بانہیں پھیلا کر استقبال کرنے والا اس کا ماما کہیں غائب ہو گیا تھا۔ آخر کٹی نے دیکھا کہ بڑوں میں سب ہی عمر میں اس سے بڑے تھے اور اس سے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس لیے اس نے اسکول کے ان بچوں میں بیٹھنا ہی مناسب سمجھا۔ بچوں کے مجمع میں جا کر اس نے ایک کو ایک طرف ڈھکیلا، دوسرے کے سینے پر کہنی ماری، تیسرے کے ہاتھ پر پاؤں رکھ دیا اور چوتھے کی گود میں دھم سے گر پڑا۔ اس ہنگامے میں جس بچے کا ہاتھ کچل گیا تھا وہ سات سال کا تھا۔ وہ ایک دم زور سے چلایا۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دیوتاؤں نے ایک رحم بھری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر اپنی باتوں میں محو ہو گئے۔ کٹی کا جی چاہا کہ زمین اس کو نگل جائے تو اچھا ہے۔ بچوں کے جھنڈ میں وہی سب سے لمبا تھا۔ اس لیے بھیگی بلی کی طرح سکڑ کر ان بچوں جتنا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی وجہ سے بچوں کو جو تکلیف ہوئی تھی اس کے لیے تھوڑی دیر تک ان کی ملامت کھا کر اس نے اپنی جگہ بنا لی۔ آرام سے بیٹھ کر اس نے صحن میں چاروں طرف دیکھا، دیواروں پر لگی تصویروں اور چھت سے لٹکے شمع دانوں کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر بڑی حیرت اور تجسس سے کونے میں رکھے طبلے اور طنبورے کا جائزہ لیا: "ارے طنبورا اتنا بڑا ہوتا ہے!" اس نے اپنے دل میں کہا۔ آنگن کے دو جانب دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں میں ہلکی سی روشنی تھی اس لیے پیٹرومیکس کی چوندھیا دینے والی روشنی کے سبب پہلے وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ دس منٹ آنگن میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد تھک کر کٹی نے جب کمرے کے اندر نظر ڈالی تو اسے ایک عجیب

منظر دکھائی دیا۔

اس کمرے میں ایک حسینہ بیٹھی تھی۔ دیوار کا سایہ ہونے کے باوجود اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا کٹی نے اساطیری قصوں میں اُروشی، رمبھا، چترا، گدا وغیرہ خوبصورت عورتوں کا نام صرف سن رکھا تھا۔ اُسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ وہ سچ مچ سندری تھی!

..... یہ اپسرا تو نہیں۔ اس کا حسن کٹی کے تصور سے ماورا تھا۔ کٹی نے اس کی طرف دیکھا وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کٹی کو اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا لیکن ذرا دیر بعد پھر اس حور کو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی، وہ بار بار اس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا اور پھر جھکا لیتا۔ اب تک اس نے ایسے حسن کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کٹی کو کسی کے حسن نے اتنا متاثر نہیں کیا تھا۔ اس کی آنکھیں بس سے باہر ہونے لگیں اور آہستہ آہستہ ایک ایسی ہمت اس میں پیدا ہونے لگی جو اس سے قبل کبھی نہ تھی، وہ بھی اس کی جانب دیکھ رہی تھی وہ حسینہ ہبلی کی رہنے والی مشہور گلوکارہ محبوب جان تھی جو شائستگی اور فن میں اپنی مثال آپ تھی۔ راگھپا کا انتخاب کہیں معمولی ہو سکتا ہے؟ گزشتہ دس بارہ سال سے وہ راگھپا کے سایۂ عاطفت میں تھی۔ موسیقی میں اس نے خاص نام پیدا کیا تھا۔ شِشانی ناٹک کمپنی نے اس کے نام پر بہت پیسہ کمایا تھا۔ اس کے کمپنی سے الگ ہونے کے بعد نئے نئے فنکاروں اور ساز و سامان کے باوجود کمپنی کبھی اتنا پیسہ نہ کما سکی۔ پونا کی گندھروناٹک کمپنی کے باعث اس کے مداحوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا۔ یہ لوگ محبوب جان کے سنگیت میں بہت دلچسپی لیتے تھے لیکن پچھلے چار سال سے محبوب جان نے ناٹکوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ اسے کئی کمپنیوں نے تین سو روپیہ ماہوار تک معاوضہ دیا تھا۔ ایک بار ایک تقریب پر ناٹک کرتے وقت محبوب جان کو بہت محنت کرنا پڑی جس سے وہ بیمار پڑ گئی تب اس کے "سرپرست" نے اسے قسم دلا کر ناٹک میں حصہ لینے سے منع کر دیا۔ اس وقت سے وہ راگھپا پر تکیہ کر کے اس کا حکم مان کر اسی کی سرپرستی میں دن گزار رہی تھی۔ اب وہ ادھیڑ ہو چلی تھی۔ ہچکیوں کی بیماری ہو جانے کے سبب گانا بھی اس نے کم کر دیا تھا۔ آج راگھپا کے گھر میں سنگیت سبھا ہونے کی وجہ سے صبح سے الائچی، ملیٹھی کھا کر گلا سدھا کر گانا گانے آئی تھی۔ تحصیلدار کو بلانے کے لیے گیا ہوا گھر کا مالک ایک گھنٹہ گزر جانے پر بھی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ بہت اکتا گئی تھی۔ گانا سننے آئے ہوئے لوگ محبوب جان سے دو ایک باتیں کرنا چاہتے تھے مگر راگھپا کی غیر حاضری کے سبب انھوں نے کسی خاص اشتیاق

کا مظاہرہ نہیں کیا اور آپس میں ہی گپ کرتے رہے۔ اس سے بات کرنے والا کوئی نہ تھا۔ راگھپا نے اس کو بتایا تھا کہ اس شام کو بڑے افسران محفل میں آئیں گے اس لیے محبوب جان نے ریشمین لباس زیب تن کیا تھا۔ چہرہ پر خوب میک اپ کیا تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر کے ساتھ سیوتنی کے پھولوں کا ہار پہن کر خوب سج دھج کر آئی تھی بالکل اسی طرح جیسے اپنی جوانی کے زمانے میں بن ٹھن کر بڑی بڑی محفلوں میں جایا کرتی تھی۔ مشق چھوٹ جانے کے سبب اسے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ اسی اکتاہٹ کی حالت میں کیٹّی اندر آیا۔ اس کی آمد سے محبوب جان کی کوفت کچھ کم ہوئی۔ اداکاری میں ماہر محبوب جان کو کیٹّی کا ہچکچاتے ہوئے بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈنا، بچوں میں گھس کر بیٹھنے کے وقت ہنگامہ کرنا پھر اس کا جسم چرا کر بیٹھنا، منھ پھاڑ کر طنبورہ کی طرف دیکھنا۔ کیٹّی کی یہ حرکتیں اُسے ناٹک کے جوکر کی اداکاری کی یاد دلا رہی تھیں اس لیے وہ اس جیتے جاگتے ناٹک کو محویت سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں راگھپا تحصیلدار اور اس کے ایک دوست کو لے کر پہنچ گیا۔ تحصیلدار کے آتے ہی تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے سب ہی لوگ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور ان کو خوش آمدید کہا۔ تحصیلدار نے بڑا تکیہ اپنے دوست کی طرف بڑھا دیا اور خود بھی ایک تکیہ سے ٹک کر بیٹھ گئے۔ راگھپا بھی ان کے پاس بیٹھ گیا اور حاضرین کا ان سے تعارف کرایا۔ جن لوگوں سے تحصیلدار واقف تھے ان سے انھوں نے ہلکا سا مذاق بھی کیا۔ اسی دوران اکتا کر کیٹّی نے بھی اپنا سر ذرا اونچا کیا۔ وہ اپنے ماما کی طرف بڑی عاجزانہ اور قابل رحم نظروں سے یہ سوچ کر دیکھ رہا تھا کہ شاید وہ لوگ اس کی جانب دیکھ لیں لیکن نہ تو تحصیلدار نے اور نہ اس تک پہونچانے والے ماما نے کیچڑ میں پھنسے اس کنول کی جانب نظر اٹھائی۔ راگھپا نے کمرے میں بیٹھی ہوئی حسینہ سے ذرا بلند آواز میں کہا "محبوب، تمھارا گانا سننے کے لیے تحصیلدار صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ وہ بہت دن سے تمھارا گانا سننے کی فرمائش کر رہے تھے۔ تم آج اپنا سب سے عمدہ گانا سنانا۔" محبوب جان نے روشنی کی جانب کھسکتے ہوئے تکیہ پر براجمان تحصیلدار کے دوست کو بڑی نزاکت سے مجرا کیا۔ اس پر تحصیلدار نے اپنا حق جتاتے ہوئے کہ تحصیلدار یہ نہیں ہیں، میں ہوں، بڑی گمبھیرتا سے پوچھا "گندھرو راگ آتا ہے؟"

محبوب جان نے کہا "جی ہاں"۔ (محفلوں میں وہ ہندوستانی زبان میں ہی گفتگو کرتی تھی) اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر آئی اور اس دری پر بیٹھ گئی جو خاص طور پر اسی کے لیے بچھائی گئی تھی۔ پھر اس نے سر کا پلو ٹھیک کیا۔ اس کے روشنی میں آجانے سے کیٹّی کے لیے

اس کے حسن کی کشش کم ہوگئی۔ گیس کی روشنی میں گہرے میک اپ کے باوجود اُس کے چہرہ پر پڑی ہوئی جھریاں صاف نظر آرہی تھیں۔ زیادہ عمر کے لوگوں کے لیے شاید اب بھی وہ خوبصورت رہی ہو لیکن حسن کی دہلیز پر کھڑے ہوئے اور اندر جاؤں یا نہ جاؤں سوچتے ہوئے کٹی کو محبوب جان کا یہ روپ بھیانک ہی لگا۔ اگرچہ تھوڑے موٹاپے کے باوجود اس کے اعضا گٹھے ہوئے تھے مگر اس کے چہرے کو قریب سے دیکھنے پر کٹی کو مکمل مایوسی ہوئی اگرچہ پانچ منٹ پہلے اس نیم تاریک کمرے کی نظر فریب تصویر کے سبب کٹی کا بچپن اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا یہ مایوسی بھی اس کا بچپن واپس نہ لاسکی۔ بیٹھک کے باہری برآمدہ میں بنچ پر بیٹھا ہوا ایک بوڑھا اندر آیا اور وہاں رکھے طنبورے اور طبلے کا سُر جانچ کر دیکھا۔ طبلہ ٹھیک کرتے کرتے دیش پانڈے نے دیکھا کہ تمباکو کے ڈبہ میں تمباکو ختم ہوگیا ہے۔ اس نے ہانک لگائی۔ "راگھپا، تمباکو ختم ہوگیا ہے"۔

"اوہ" کہہ کر راگھپا نے انٹی سے دو آنے نکالے اور چھوٹے بچوں کی جانب گھوم کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا "ارے تم میں سے جس کی مونچھیں نکل آئی ہیں وہ جائے اور دو آنے کا تمباکو لے آئے"۔ ادھر سے سُر تھاپ کی آواز آنی شروع ہوگئی تھی اس لیے بچے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہوئے کٹی کی طرف اشارہ کرکے بولے۔ "اس کی مونچھیں نکل آئی ہیں" کٹی ہکا بکا ہو کر جھٹ سے اٹھا اور ماما کے ہاتھ سے دونی لینے آگے بڑھا۔ تب ہی راگھپا نے اسے دیکھا۔

"اوہ..... ہو..... تم آگئے؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو"؟ کہتے ہوئے تھوڑا سا کھسک کر جگہ بنائی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ محبوب جان کے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ تحصیلدار نے بھی اسے تمباکو لانے کے لیے اٹھتے دیکھا تھا یا نہیں یہ معلوم کرنے کو بھی کٹی کی نظر تحصیلدار کی جانب اٹھنے کی ہمت نہ کرسکی۔ پھر بھی وہ یہ سوچ کر کہ حال ہی میں ملی ترقی کافی ہے، خوش خوش وہیں بیٹھ گیا اس نے اپنی جانب گھورتے ہوئے صاحب کو نمسکار کیا۔ راگھپا نے اس کا صرف اتنا ہی تعارف کرایا: "یہ ہمارا لڑکا ہے۔ آپ کی کچہری میں کام کرتا ہے" صاحب نے سر ہلا دیا۔ اپنے ماتحت کو اپنے اس قدر قریب بیٹھا دیکھ کر صاحب ذرا ہچکچائے۔ اِدھر کٹی اس تذبذب میں تھا کہ ان کے قریب بیٹھتے وقت تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھنا چاہیے یا نہیں۔ اتنے میں گانا شروع ہوا۔ تھوڑی دیر میں آرام سے بیٹھ کر صاحب اپنے دوست سے باتیں کرنے لگے۔ کٹی پھر تذبذب میں پڑ گیا کہ وہ ان کی باتیں سنے یا سنگیت۔ ماما تو سنگیت میں محو تھے۔ کٹی کو اس گانے کا مطلب ذرا سمجھ میں نہ آیا پھر بھی یہ سوچ کر کہ چھٹکارا ملنا مشکل ہے وہ بیٹھا رہا۔ تکیہ سے ٹیک لگا کر نہ بیٹھنے کے سبب کچھ ہی دیر میں اس کی

کمر دکھنے لگی۔ ساتھ ہی یہ سمع خراشی! موسیقی کی ماہر محبوب جان عجب سروں میں کوئی راگ الاپ رہی تھی۔ شاستریہ سنگیت اور طوائف کا یہ انوکھا سنجوگ دیکھ کر کٹی دل ہی دل میں ہنسا۔ اس کے بعد محبوب جان نے کچھ مراٹھی اور کنٹر گیت گائے۔ ان میں بھی کٹی کو کوئی خاص لطف نہ آیا لیکن تحصیلدار سے لے کر بچوں تک سب ہی کو سر ہلاتا دیکھ کر وہ خود بھی سر ہلانے لگا۔ اس نے دھیمے سے "واہ وا" بھی کہا لیکن اتنے دھیمے کہ کوئی سن نہ پائے۔ اس ڈھائی گھنٹے میں ماما نے صرف ایک ہی بار اس سے بات کی اور تحصیلدار صاحب صرف دو بار اس کی موجودگی کو تسلیم کرکے رہ گئے۔ ایک بار تمبا کو لانے کی بات پر اور دوبارہ اس وقت جب اس نے ان کے قریب کے تکیہ پر قبضہ جمایا۔ کٹی کو یہ محسوس ہونے لگا گویا اس کا وہاں آنا بیکار رہا ہو۔ راگھپا کی فرمائش پر "نہ مارو پچکاری" ٹھمری اداکاری کے ساتھ گائی گئی اور اس کے بعد محفل موسیقی ختم ہو گئی۔ محبوب جان کی اداکاری اور نزاکت کٹی کو ذرا نہ بھائی۔ اس نے سوچا آج اپنے حصہ میں تو بس ستم ہی ستم آیا۔

محفل کے اختتام پر تحصیلدار صاحب محبوب جان سے دو ایک باتیں کرکے اور دوسرے حاضرین کا آداب قبول کرکے جانے لگے تو کٹی نے سلام کرکے پوچھا "تانگہ لے آؤں صاحب؟"

صاحب نے کہا "راگھپا نے لڑکی کو بھیج دیا ہے۔" کٹی کو یہ دیکھ کر ڈھارس ہوئی کہ صاحب گالی کے بغیر بھی بات کر سکتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کٹی نے اس پرانے کیس کی بات اٹھائی اتنے میں تانگہ آ گیا۔ لیکن تحصیلدار صاحب کے دل میں کٹی سے بات کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی اس لیے وہیں کھڑے کھڑے کٹی سے بہت سنجیدگی سے بولے "دیکھو کلکرنی، تمہارے جیسے لوگ اگر محکمۂ مال میں ٹکے رہنا چاہتے ہیں تو ایک بات سمجھ لینا چاہیے۔ تم جس جگہ پر کام کر رہے ہو اس کے لیے تمام قاعدے قانون اور دفتری ضابطوں کو جاننا ضروری ہے۔ کسی دوسرے کی باتوں میں آنے کی ضرورت نہیں تمہارا کام ٹھیک رہنا چاہیے تب ہی تم کامیاب ہو سکتے ہو۔ تم کو پرسوں نوٹ کس نے لکھوایا؟ کیا مجھے نہیں معلوم؟"

کٹی بولا "نہیں صاحب ان کا کیس کلیر تھا، یہی کہا تھا۔"

"بہر حال، تمہیں ان پر اتنا انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ ضروری قواعد وضوابط کی جو فائل کچہری میں ہے تم اسے گھر لے جا کر کئی کئی بار پڑھو، تب تمہیں اپنا کام سمجھ میں آئے گا۔ محکمۂ مال میں کام کرتے وقت کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی تم جونیئر ہو اس لیے چار آدمی تمہیں بجھاتے ہیں۔ کل اگر کوئی چالاک لڑکا تمہارے نیچے کام کرنے لگے تو دس یا پندرہ دن میں کوئی معاملہ تمہارے

گلے ڈال کر تمہارا چانس چھین لے جائے گا۔ تم سیدھے ہو ابھی اس محکمہ کا رنگ ڈھنگ تمہیں معلوم نہیں۔ کل شام قانون کی فائل کو گھر لیتے جانا اور دوسرے دن صبح واپس لے آنا۔ اگر تمہیں فائل دینے سے کوئی منع کرے تو میرے پاس آنا، میں دلوا دوں گا۔ دوسروں پر تکیہ کر کے کب تک کام چلا سکو گے اپنا ہاتھ جلا بیٹھنے سے پہلے ہی اس بات سے آگاہ ہو جانا ضروری ہے" اتنا کہہ کر صاحب تانگہ میں بیٹھ گئے۔ انہیں پہونچانے کے لیے راگھیا بھی تانگہ میں بیٹھ گیا۔ احساس تشکر سے کٹی کا دل لبریز ہو گیا۔

تانگہ کے جانے کے بعد کٹی نے سوچا کہ اب گھر چلنا چاہیے۔ اتنے میں وہی بچہ جس کا ہاتھ کچل گیا تھا اس کے پاس آیا اور اس کی قمیض پکڑ کر بولا "تمہیں مامی بلا رہی ہے۔"

کٹی نے پوچھا "کون مامی؟"

"ہماری مامی"

"تم کون ہو"؟

"میں بھیم سین"

کٹی نے سوچا اس فضول بات چیت سے کوئی فائدہ نہیں، اس لیے چپ چاپ کسی ہمزاد کی طرح اس بچے کے پیچھے چل پڑا۔ بچہ نے گھر کے ایک کمرے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا، "وہاں لیٹی ہیں" اور خود بھاگ گیا۔ راگھیا کی بیوی سارے محلہ میں مامی کہی جاتی تھی۔ کٹی کو خوف اور حجاب دونوں محسوس ہوئے۔ اسے یاد آیا کہ راگھیا نے ایک بار بتایا تھا کہ اس کی بیوی بہت دنوں سے سل کی بیماری میں مبتلا ہے اور سال بھر میں تین چار مہینے بستر پر پڑی رہتی ہے یہ یاد کر کے اسے ذرا تسلی ہوئی اور وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دروازے کے پاس آیا تو اسے یہ گفتگو صاف سنائی دی۔

"بہن محبوب، تو میری چھوٹی بہن ہے، میں تجھ سے بڑی ہوں، تو یہ روپیہ چھوڑ مت دینا، تو میرے لیے بھگوان کی طرح ہے۔"

کٹی سوچتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اس کے سایہ کو دیکھ کر محبوب جھٹ سے اٹھی اور ایک طرف کو کھسک گئی۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں ادھیڑ عمر کی ایک تھکی تھکی کمزور عورت جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے ماتھے پر لمبی سی پتلی بندی لگی ہوئی تھی۔ اس کا جسم لیمو کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اپنی عمر سے کچھ زیادہ دکھائی دینے پر بھی یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی جوانی میں بہت خوبصورت رہی ہو گی۔ اس کے رخسار لٹک آئے تھے جو اس بات کی غمازی کر رہے

تھے کہ وہ برسوں سے کھانسی کی مریض ہے پھر بھی اس کے چہرے پر اب بھی ایک نور سا تھا۔ وہ کٹی کی طرف مڑی اور کسی قسم کی حیرت کا اظہار کیے بغیر اور اس کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی نہ کرتے ہوئے کہا۔
"آؤ، کٹنا آؤ" پھر محبوب جان سے بولی "محبوب بہن، ادھر چٹائی بچھا دو" کٹی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ محبوب جان اٹھتے ہوئے بولی "اچھا بہن اب میں چلتی ہوں۔ گاڑی ساڑھے دس بجے تک ملتی ہے" محبوب کا یہ ہمیشہ کا اصول تھا کہ جہاں تک ممکن ہوتا وہ راگھپا کے گھر میں سونے سے گریز کرتی تھی البتہ جب کوئی چارہ کار ہی نہ ہوتا تو سوتی لیکن راگھپا سے عہد لے کر۔
چمپکا کے یہ کہتے ہی "دودھ پی کر جانا بہن" محبوب جان پھر بیٹھ گئی۔ چمپکا کی کمزوری نے اس کے لہجہ میں تحکم پیدا کر دیا تھا۔ وہ کمزوری کی وجہ سے غصّہ بھی نہ کر سکتی تھی۔ لوگ اس کی حالت دیکھ کر مجبوراً اس کی ہر خواہش پوری کر دیتے تھے۔
اتنے میں چمپکا نے دروازے کے پاس سے گزرتی ہوئی رتنا کو پکار کر کہا "رتنا، باہر آنگن سے گیس بتی اٹھا لا" گیس آ گیا۔ وہ دہلیز پر گیس رکھ کر باہر سے ہی کھسک گئی۔
"تم جب اتنے سے بچے تھے تب تمھیں دیکھا تھا۔ تمھاری ہماری رنجش کو دس سال ہو گئے بہرحال اب تم بڑے ہو گئے ہو۔" یہ کہہ کر چمپکا نے محبوب جان سے اپنا اور کٹی کا رشتہ بتایا۔ محبوب نے بھی بیچ بیچ میں سوال کیے جس سے اسے کٹی کے متعلق سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اسی سوال وجواب کے دوران چمپکا گنگوا کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کرتی رہی۔ اس نے بار بار کٹی سے سوال کر کے یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی کہ گنگوا اب بھی ان لوگوں سے ناراض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنی ناراض ہے؟ چمپکا نے اسے بتایا کہ کٹی کے باپ جب زندہ تھے تو اس کے باپ سے کتنی محبت کرتے تھے اپنی بیماری کے بارے میں بھی بہت رقت انگیز طور پر بتایا۔ ان عورتوں کے قرب سے کٹی کا دل نرم پڑ گیا۔ اسی وقت موقع پا کر چمپکا نے کٹی کو ایک بات بہت آہستہ سے بتائی "اس درد میں میرا جینا اور مرنا دونوں ہی برابر ہیں۔ آج جو میں زندہ ہوں تو آپ کے باپ کی مہربانی سے آپ کی ماں کے لیے تو میں مر چکی ہوں" یہ سن کر محبوب جان کا دل بھر آیا۔ وہ بولی "آپ جیسی عورت سے کوئی کس طرح نفرت کر سکتا ہے۔"
"محبوب بہن، ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اب یہی لو، تم کون ہو اور میں کون ہوں مگر بہنوں کی طرح رہتی ہیں پھر دیکھتی ہوں کہ خون کے رشتہ میں ایسی باتیں ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے تو لوگ کہتے ہیں "یہ کلجگ ہے" لیکن محبوب بہن، لڑائی جھگڑے سے کہیں خون کا رشتہ ٹوٹ

جاتا ہے۔ سو سال بھی بیت جائیں تب بھی خون خون ہی ہے۔"

ایسے نیک لوگوں سے ماں کے قطع تعلق کر دینے کی بات سن کر کٹی کو ذرا بھی ندامت نہ محسوس ہوئی۔

اتنے میں رتنا دو پیالے دودھ گرم کر کے لے آئی۔ اب اندر آنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کٹی نے دہلیز پر کھڑی شرمائی لجائی سی ایک پندرہ سالہ دوشیزہ کو دیکھا۔ وہ ماں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ جب اس نے دودھ لا کر رکھا تو کٹی نے اس کے کھلے سر کو للچائی نظروں سے دیکھا۔ تین گھنٹہ پہلے جوان ہونے والا کٹی اب عاشق بھی بن چکا تھا۔

9

گنگوا کی بے احتیاطی کا انجام

پچھلی بار جب گنگوا دیسائی جی کے گھر آئی تو ایک بے احتیاطی کر بیٹھی۔ غصہ میں گنگوا نے پیسے کے بارے میں جو کچھ کہا وہ وسنت کے کانوں میں پڑ گیا۔ وسنت راؤ، سینما دیکھنے کے لیے پیسے نہ ملنے کے سبب، ساری شام پیچ و تاب کھاتا رہا۔ سینما کا مستقل گاہک ہونے کے باوجود صرف اسی ایک دن بھی گیٹ کیپر نے اسے بغیر ٹکٹ اندر نہیں گھسنے دیا۔ اس نے اس کی بڑی خوشامد بھی کی پھر بھی نہ مانا تین آنے کے لیے اس نے اس سے پہلے کبھی اتنی پریشانی نہ اٹھائی تھی۔ اس دن سینما جا کر مایوس لوٹنے کی تکلیف سے دکھی ہو کر اس نے گنگوا کی بات کا راز معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بسنت کے موسم کی طرح وسنت راؤ کی حرکتیں بھی بڑی عجیب تھیں۔ اگلے دن دوپہر کو جیسے ہی ماں کھانے سے فارغ ہوئیں اس نے ان کا پاندان چھپا دیا۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد اگر وینو بائی دو پان اور ایک مٹھی بھر کر سپاری نہ کھاتیں تو ان کا جینا حرام ہو جاتا۔ پریشان ہو کر انھوں نے سارا گھر چھان مارا۔ دیسائی جی کے سونے کا وقت ہونے کی وجہ سے زیادہ شور بھی نہ مچا سکیں۔ اتنے میں اوپر کی منزل سے وسنت راؤ اتر کر ماں کے پاس آیا اور بولا "ماں کل گنگوا کچھ کہہ رہی تھی نا"

"کیا کہہ رہی تھی بیچاری، بیٹا بیٹا کرتے گھلتی جا رہی ہے۔"

"نہیں ماں، کچھ پیسوں کی بات تھی نا"

"پیسے کہاں سے آئے رے؟"

"لیکن اس نے مجھے ڈانٹ پڑوا دی۔ گھر کے وارث کو سینما دیکھنے کے لیے تین آنے نہیں ملتے لیکن اس مائی کو جب بھی دس پندرہ روپے کی ضرورت پڑے مل جاتے ہیں۔ گھر میں جو کچھ ہوتا ہے کیا مجھے پتہ نہیں! ایرے غیرے نتھو خیرے موج کریں اور گھر والوں کو ٹھینگا! میں کچھ کہتا نہیں۔ اسی لیے تو؟"

"تمھیں دینے سے کون منع کرتا ہے وسنتنا۔ وہ تو تمھارے بھلے کے لیے ہی کہتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار سینما دیکھو بیٹا۔ روز دیکھو گے تو کیسے کام چلے گا۔ تمھاری پڑھائی کا کیا ہوگا؟"

"مجھے سینما نہ دیکھنے سے سر درد ہو جاتا ہے۔ سر درد رہے تو پڑھائی کیسے ہوگی۔ اگر میں فیل ہو جاؤں تو کہوگی: دیکھ اس کتّی کو! بس کٹّی کٹّی کی رٹ لگاتی رہوگی۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ جانے دو، مجھے بھی نہیں چاہیے پیسے۔ لیکن گھر کا پیسہ کہاں جاتا ہے کم از کم یہ تو مجھے معلوم ہی ہونا چاہیے۔ میں کیا چھوٹا بچہ ہوں؟ اس گھر میں پیدا نہیں ہوا کیا؟ اگر ایسے ہی چلتا رہا تو اچیوتنّا کو سب کچھ لکھ دوں گا۔"

"اچیوت تمھاری طرح احمق نہیں ہے۔ خیر۔ پہلے میں پان تو کھا لوں" بات بدلنے کے لیے وینو بائی بولی۔

"تم پان سپاری کہاں سے کھاؤ گی۔ میں نے پاندان ہی چھپا دیا ہے۔ پہلے مجھے بتاؤ تب دوں گا۔"

وینو بائی کو اپنے بیٹے کی ان حرکتوں پر افسوس ہوا۔ وہ پان سپاری چھوڑ سکتی تھی لیکن اپنے اس بیٹے کی حرکتیں، اس کی باتیں، اس کے خیالات، یہ سب دیکھ کر وہ فکر مند ہو گئی۔ ایک لمحہ تامل کرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اب تک جس بات کو اس نے چھپا رکھا تھا اُسے بتا دینے میں کوئی نقصان نہیں اور چھپانے میں کوئی فائدہ بھی نہیں چنانچہ اس نے اس امید میں زبان کھولی کہ ممکن ہے تمام باتیں معلوم ہو جانے کے بعد وسنت کے دل میں گنگوا کی عزت پیدا ہو جائے۔

"وسنت بیٹا تم اب سمجھدار ہو گئے ہو۔ تمھاری پان سپاری تمھیں مبارک! لیکن تمھارا پیسے کا گھمنڈ مٹ جائے اس لیے بتاتی ہوں۔ سنو! گنگوا نے کہا تھا کہ کسی سے نہ کہنا لیکن تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اب تو دس سال گزر گئے ہیں کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ انسان کو دولت پر اترانا نہیں چاہیے۔ یہ آج ہے کل نہیں۔ انسان کو سب کے ساتھ بنائے رکھنا چاہیے۔"

"پہلے بتاؤ تو بات کیا ہے" وسنت اپنے تجسس کو روک نہ سکا۔

"گنگوا بڑے گھرانے کی ہے بیٹا، اس کا شوہر موتیوں کا بیوپار کرتا تھا، گڑ کا بیوپاری بھی تھا۔ کتنا بتاؤں، بے چارا کسی مصیبت میں پھنس گیا۔ جن کو دیا تھا وہاں گیا، جن سے لیا تھا وہاں گیا، جہاں رکھا تھا وہاں بھی گیا۔ چھ مہینے کے اندر ہی اندر پیٹ کے درد میں ختم ہو گیا۔ گنگوا ہمت والی عورت ہے۔ بیوپار کے سلسلہ میں کھیت اور دوکانیں سب بک چکی تھیں۔ قرقی آنے پر جب اس کا شوہر گھبرا گیا تو گنگوا نے گھر میں جو تھوڑا بہت سونا تھا اسے کٹی کے ہاتھوں پچھلے دروازے سے گھورے میں پھنکوا دیا۔ پتہ نہیں کس طرح کٹی ان لوگوں کی نظر سے بچ گیا۔ غرض اس طرح وہ تھوڑا سا مال بچ گیا۔ سب کچھ چلا جانے کے بعد اور شوہر کے بھی مر جانے کے بعد اس نے وہ زیور نکالا اور راتوں رات ہمارے پاس لائی اور رکھوا دیا۔ اس نے لگ بھگ سات آٹھ سو روپے تمہارے باپ کے پاس رکھے جو سود در سود سب مل کر اب تقریباً ایک ہزار روپیہ ہو گئے ہیں۔ جب ضرورت ہوتی ہے تب آکر اپنے پیسوں میں سے لے جاتی ہے۔ ہم اسے کچھ نہیں دیتے۔ ہم تو اس سے صرف دو پیار بھرے بول بول دیتے ہیں۔ صرف اتنے کے لیے وہ ہماری کتنی احسان مند ہے، اس کا یہ گن تو دیکھو!"

"تو کٹی بھی ہر ماہ روپیہ لا کر دیتا ہے کیا؟"

"پچھلی بار جب ہم کاشی یاترا کو گئے تھے تو وہ میرے ساتھ گئی تھی۔ اس وقت ہم نے خرچ کیا تھا۔ یہ نام ہی کو ہے۔ اب کٹی کے ہاتھ سے کچھ روپیہ ہر مہینے دلاتی رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس طرح چار پیسے بچ جائیں۔ غریبوں کی باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ پیٹ بھر کے کھانا مل جاتا ہے تو زیادہ زبان نہیں چلانا چاہیے۔"

آخری جملے سے وسنت بڑا جز بز ہوا۔ اس نے اپنے کمرے سے پاندان لا کر ماں کے سامنے رکھ دیا۔

ماں بولی "نہیں چاہیے۔ جا تو ہی اپنے پان کھا لے۔"

ماں کی دی ہوئی اس تعلیم کے امرت کو زہر بنانے میں وسنت کو دو دن لگے۔

اسی رات کو وینو بائی نے اپنے بیٹے کا کارنامہ اور اپنا جواب شوہر کو سنایا۔ یہ سب سن کر دیسائی جی اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہو گئے۔ اس لڑکے کے رنگ ڈھنگ اگر یہی رہے تو نہ جانے کہاں پہونچے گا۔ بڑے بیٹے اچیوت کے بارے میں انھیں مطلق فکر نہ تھی۔ اسے

دیکھ کر وہ پھولے نہ سماتے تھے۔ انھیں اس بات کی بھی فکر ہوئی کہ کہیں اپنے اثر سے وسنت راؤ
اپنے چھوٹے بھائی پرشوتم کو بھی نہ بگاڑ دے۔

ویسے دیکھا جائے تو دیسائی جی نے بھی اپنے زمانے میں اپنے باپ کے ساتھ کافی جھگڑا کیا تھا
لیکن وسنت کی طرح ان میں اوچھاپن نہ تھا۔ انھوں نے اپنے باپ سے سینما کے لیے تین آنے
کے پیچھے لڑائی مول نہیں لی تھی، بلکہ اس کے برعکس جائداد کو بنائے رکھنے کی خاطر جھگڑا کیا تھا۔ سب ہی بڑے
گھروں کے لڑکے چھوٹی عمر میں ہی دولت اور جائداد کا شعور رکھتے ہیں۔ یہی لوگ جب بڑے ہو جاتے
ہیں تو اپنے بچوں میں دولت کا لالچ دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ دولت کے ساتھ یہ لعنت
ازل سے لگی ہوئی ہے۔

دیسائی جی نے ان حالات کو دوسرے ڈھنگ سے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت
دنوں سے ان کے کندھوں پر گنگوا کا جو جو اچلا آرہا تھا چاہنے کے باوجود وہ اُسے اتار نہ پا رہے
تھے۔ اب اسے اتار پھینکنے کا اچھا بہانہ ہاتھ آیا تھا۔ اگلے دن ہی انھوں نے گنگوا کو بلا بھیجا اسے
سب باتیں صاف صاف بتا دیں "تم نے جو پیسے میرے پاس رکھے ہیں ان کا نہ کوئی کاغذ ہے نہ رقعہ
ہماری بھی اب عمر ہو چلی ہے۔ ہمارے بڑوں کے زمانے میں جو باہمی اعتماد تھا اب نہیں ہے۔ اور
ہمارے زمانہ کا اعتماد ہمارے بچوں میں نہ ہوگا۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ تمھارا بیٹا اب اچھی نوکری
پر ہے اس بات کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے کہ کل میرے پاس پیسہ بنا رہے گا۔ میرے بچے بھی جوان
ہو رہے ہیں۔ . . . چلو یہ بات جانے دو . . . . . بہر حال، حاصل کلام یہ ہے کہ پیسہ فنا ہو جانے والی
چیز ہے۔ میں تمھارا قرضدار ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔ ہاتھ میں پیسہ رہتے رہتے تمھارا پیسہ تم کو
مل جائے تو میرے سینہ سے ایک بوجھ اتر جائے گا" اپنی ساری طولانی تقریر کے بعد دیسائی جی
نے گنگوا کو اس وقت تک کا سارا حساب پڑھ کر سنایا۔

گنگوا کے سامنے بھلا ان کی کیا چل سکتی تھی۔ اس کے آنسوؤں اور دہائیوں کے سامنے ان
کی تقریر بیکار ثابت ہوئی۔ آخر ہار کر دیسائی جی نے گڑگڑا کر کہا کہ کم سے کم اس پیسہ کا معاملہ
کٹی کے گوش گزار تو کر ہی دینا چاہیے لیکن گنگوا اس کے لیے بھی تیار نہ ہوئی۔

"پہلے ہی اس نے اپنا خرچ بڑھا رکھا ہے۔ یہ سوچ کر کہ پیچھے کچھ بھی نہیں ہے یہ چار پیسے بچائے
ہیں۔ گوپیا، یہ ہزار روپیہ لے بھی لے تو چار دن نہیں ٹکیں گے، کسی کام بھی نہ آئیں گے۔ لوگ کہتے
ہیں بند مٹھی اور خوشبو کو بند رکھنا ہی ہوش مندی ہے۔ اس کے کانوں تک یہ بات پہونچی نہیں

چاہیے" یہ کہہ کر اس نے دیسائی جی کو لاجواب کر دیا۔ پھر گھر لوٹتے وقت وہ زور دے کر بولی "اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا میرے پاس کسی کے پیسے نہیں ہیں ۔ میری اتنی بات مان لو باقی جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

دیسائی نے ایک لمبی سانس لی اور چار و ناچار اس امانت کا بوجھ پھر قبول کر لیا۔

اگلے دن وسنت راؤ تحصیل کی کینٹین میں چائے پکوڑے ختم کر کے کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا کٹی کے دفتر سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تحصیلدار صاحب کے دفتر سے باہر آنے کے بعد کٹی اور اس کے ساتھی چار کلرک دفتر سے نکل کر ہنستے ہوئے کینٹین کی طرف آئے۔ کٹی نے بھی ان لوگوں کے ساتھ چائے ناشتہ کیا۔ ہوٹل کے پچھلے حصہ میں بیٹھا ہوا وسنت کٹی کو نظر نہ آیا۔ کینٹین سے نکل کر جب کٹی اکیلا گھر کی طرف روانہ ہوا تو وسنت راؤ ایک دم سے اس کے سامنے آ گیا اور بولا "کیوں صاحب، اب پرانے واقف کاروں سے کیوں ملنے لگے"

وسنت اور کٹی کی ملاقات ایک مہینے سے نہیں ہوئی تھی۔ اس کے اکھڑ پن سے کٹی خوب واقف تھا پھر بھی اس کے ساتھ ہمیشہ پیار سے پیش آتا تھا۔

"آپ تو دیسائی بہادر ہیں۔ آپ غریبوں کو بھلے ہی بھول جائیں پر ہم غریب کیسے..... ؟"

"چل جھوٹے، چائے کی دوکان میں میں پیچھے کی طرف بیٹھا تھا۔ تم نے بات تک نہیں کی پیچھے دیکھتے تو بات کرنی پڑتی اس لیے میز پر کہنی ٹکائے آگے منہ کیے ہی بیٹھے رہے۔ میں نے بھی سوچا یہاں دفتر میں اس کی چوری کیوں پکڑوں، باہر دیکھا جائے گا۔ یہ تو صاحب بن گیا ہے۔ .... اب تو کٹی تم صاحبی چھوڑ دو۔ میرے پتا جی تمہاری تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ کٹی ہوٹل میں چائے نہیں پیتا، کٹی سینما نہیں جاتا، صوفیوں کی طرح رہتا ہے۔ . . . لیکن تم تو چھپے رستم نکلے، آج معلوم ہوا کہ چوربلی کی طرح تم چھپ کر سب کچھ کرتے ہو۔"

"بھیا وسنت، تمہاری طرح گھر میں آرام سے کھانے کو ملتا تو اس کی کیا ضرورت تھی۔ پیٹ کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ عادتیں ڈالنا پڑتی ہیں۔"

"تمھیں کس بات کی کمی ہے۔ چور دیمک کی طرح اندر ہی اندر خوب جمع کر رہے ہو۔ تمہاری ماں نے کافی پیسہ جوڑ رکھا ہے۔ آج تم کما رہے ہو، کل صاحب بھی بن جاؤ گے۔ اپنے اس پرانے سڑے کوٹ کو اب پھینک دو۔ یہ شجاع الدولہ جیسی مونچھیں صاف کرا دو، صاحب بننے پر بھی

تمھارا گنوار پن ابھی باقی ہے۔"

"وہ کہاں جائے گا، وہ تو بزرگوں کی دین ہے"، کٹی نے توہین کو توقیر بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے ایسی بات مت کہو۔ تمھارا باپ اتنی آسانی سے ڈوبنے والا نہیں تھا اور تم نے تو اس کو بھی مات کر دیا۔ تم نے تو آٹھ برس کی عمر میں ہی سونا چرایا تھا۔"

"ارے کیا کہہ رہے ہو؟"

"جو کہنا تھا کہہ دیا۔"

وسنت سے جدا ہونے کے بعد کٹی کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ جاتے ہی وہ ماں سے سب کچھ دریافت کرے لیکن گھر کے قریب پہونچ کر اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔ یہ فیصلہ کر کے کہ اس معاملہ میں وہ کسی اور موقع پر ماں سے استفسار کرے گا، اس نے گھر آ کر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن اس دن ہونے والے اس انکشاف نے کٹی کی زندگی میں کئی چھوٹی موٹی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ ماں کے پاس ایک ہزار روپیہ ہونے کی بات معلوم ہو کر اُسے یک گونہ تسلی ہوئی۔ وہ تحصیلدار صاحب کے مشورہ کے مطابق قواعد و ضوابط کی کتاب الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ دفتری ضابطوں کے مطالعے سے اس کی سمجھ میں بہت سی باتیں آنے لگیں۔ اس سے اس کی رفتار و گفتار میں ایک وقار پیدا ہوا۔ اب وہ سب کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس میں عزت نفس کا احساس بھی بڑھا۔ اب اس نے دوسروں کی باتوں کو مان لینے کا رویہ بھی ترک کر دیا۔ خرچ بھی اچھا کرنے لگا اس سے اس کا وزن بھی بڑھ گیا اور دوسری طرف اس کے کام میں بھی سدھار پیدا ہوا۔

10

گھر برباد کرنے والی زندگی

بندگوڑہ کے راگھپا کی عرفیت 'راگھو بابھراری' تھی۔ اس نام سے وہ سارے گاؤں میں

مشہور تھا اسے اپنی اس عرفیت پر فخر بھی تھا۔ اس کی شہرت کئی شکلوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب وہ دس بارہ سال کا تھا اور گاندھی جی بھی خورد سال تھے تب ہی سے وہ سینہ گرہ کی طلسمی قوت سے واقف تھا۔ ایک بار وہ اپنے دو چار دوستوں کو لے کر ایک بیکری کے سامنے کھڑے ہو کر "بریڈ چاہیئے" کا نعرہ ایک گھنٹہ تک لگاتا رہا۔ بیکری والے نے نعرہ بازی سے تنگ آ کر ایک ڈبل روٹی انھیں دے دی اور ہاتھ جوڑ کر ان سے درخواست کی کہ وہ دوبارہ وہاں نہ آئیں۔ بارھویں سال میں وہ اپنے باپ کی جیب سے پانچ روپیہ اڑا کر ترقی کا ایک اور زینہ چڑھ گیا۔ چالیس سال کا ہوتے ہوتے وہ گاؤں کے سب ہی کاموں میں اور تقریبوں تہواروں میں سب سے آگے آگے رہنے لگا۔ کبھی آؤٹ نہ ہونے والے بلے باز کے ہینشن لے لینے کی طرح اس نے بھی اپنی گدی جالیہ دس بارہ سال میں دوسروں کو سونپ دی تھی۔ پھر بھی گزشتہ چار سال تک نوجوان ہر معاملے میں اس سے صلاح لیتے رہے تھے۔

راگھپا قسمت کا دھنی تھا۔ اسے کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ بند گوڑہ کی اپنی آٹھ سالہ زندگی میں وہ گاؤں کا لیڈر بنا رہا۔ کسان لوگ ڈر کی وجہ سے اس سے کسی قسم کا کوئی چندہ نہیں مانگتے تھے۔ اس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ چندہ مانگے جانے پر بھائی بھائی میں جھگڑا کرا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس نے کاشت کی تو ایسے شاندار بیل رکھے کہ بڑے بڑے کسانوں کو ترسا دیا اور ان سے کمایا بھی خوب۔ اس نے کچھ عرصہ شہد کی مکھیاں پالیں اور کچھ دن مرغیاں پال کر بھی دیکھا۔ اس کے قرض مانگنے پر "نہیں" کہنے کی ہمت گاؤں بھر میں کسی کو نہ تھی۔ گھاس کے پولوں میں اگر آس پاس کہیں آگ لگتی تو آدھا گھنٹہ پہلے ہی راگھپا کو معلوم ہو جاتا۔ گاؤں میں کوئی جھگڑا کھڑا کر کے لوگوں کو آپس میں لڑوا کر وہ انھیں کچہری تک پہونچانے نکلتا تو پانچ چھ روپیہ بنائے بغیر گھر واپس نہ لوٹتا۔ لیکن ان تمام کاموں کا روح رواں ہونے کے باوجود وہ گاؤں کے باہر کھڑے ہوئے ہنومان جی کے مجسمے کی طرح ہر بات سے لاتعلق بھی رہتا۔ جب سے وہ دھارواڑ آیا تھا تب سے بند گوڑہ والے چین کی نیند سوتے تھے۔ دھارواڑ میں راگھپا نے ایک نیا دھندا شروع کر دیا یعنی بڑے بڑے لوگوں سے دوستی کرنا۔ جس طرح ماضی میں وہ ہر معاملہ میں سب سے آگے نکل جاتا تھا مثلاً گھوڑا پالا تو سب سے اعلیٰ، کھیتی کی تو سب سے اچھی اور جانور پالے تو نمائش میں رکھنے کے قابل، اسی طرح اس معاملہ میں بھی اس کو بے مثل کامیابی حاصل ہوئی۔

محبوب جان سے اس کا تعلق قایم ہوئے بارہ تیرہ سال ہو گئے تھے۔ ابتدائی جان پہچان

بہت جلد محبت میں بدل گئی۔ تین چار سال تک تو یہ بات چھپی رہی لیکن اس کے بعد میں چرچا عام ہوگیا۔ بند گوڑہ میں ایک بار اس کے گھر سے کچھ سونا غائب ہو گیا۔ راگھپا نے "چوری ہو گئی" کہہ کر تلاش شروع کی لیکن گاؤں کی اسی گلی میں رہنے والا ایک بوڑھا اپنے بیٹوں کے منع کرنے کے باوجود سیدھا چمپکا کے پاس آیا اور اس سے کہا "بیٹی، تمہارے سکھ کے لیے میں ایک بات کہتا ہوں۔ تمھارے شوہر کچہری کے کام سے بار بار ہبلی آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں وہ کسی غلط راستے پر جا سکتے ہیں۔ تمھارا سونا کہیں بھی نہیں گیا۔ غائب کرنے والے بھی وہی ہیں اور کھوجنے والے بھی وہی ہیں تم ذرا ہوشیاری سے گرہستی چلاؤ۔"

لیکن آئندہ تین سال تک چمپکا نے کوئی احتیاط نہیں برتی۔ گھر کو لڑائی جھگڑوں کی آماجگاہ بنا دیا۔ ایک بار بچوں کو لے کر چار مہینے تک اپنے بھائی کے گھر پڑی رہی۔ بھائی نے بعد میں سمجھا بجھا کر چمپکا کو گھر واپس بھجوا دیا۔ راگھپا کو سمجھانے کی ہمت سارے بند گوڑہ میں کسی کو بھی نہ تھی۔ ایک بار سارے زیور ایک ٹرنک میں بند کر کے اور یہ فیصلہ کر کے چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے کنجی شوہر کو نہ دوں گی وہ ٹرنک کو ساتھ لے کر پوجا گھر میں جا بیٹھی، لیکن شوہر کا ایک تھپیڑ پڑتے ہی اس کے سارے منصوبے ہوا میں اڑ گئے۔ اس نے شوہر کے پاؤں پکڑے، منتیں کیں پیاری بیٹی کو اس کے قدموں میں ڈال دیا لیکن ان سب کا راگھپا کے پاس ایک ہی جواب تھا "میں کماتا ہوں، میں خرچ کرتا ہوں۔ جس دن تم لوگوں کے لیے کھانے پہننے کو نہ ہوگا اس دن گاؤں کی چوپال کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ناک کان کٹوا لوں گا۔ مردوں کے معاملات میں تم کیوں دخل دیتی ہو" اس عہد کو راگھپا اب تک نبھاتا چلا آرہا تھا۔ اتنی فضول خرچی پر بھی وہ تباہ نہ ہوا۔ "میں جہاں بھی قدم رکھوں گا چار پیسے جیب میں ڈال کر لاؤں گا" اس کی یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ اس نے کھانے میں کبھی کمی نہ کی۔ کبھی پھٹا کپڑا نہ خود پہنا نہ گھر والوں کو پہننے کو دیا۔ اگر اس نے کہیں کوئی پیسہ گنوایا تو کسی نہ کسی صلے سے کما بھی لیا چاہے تاش کھیل کر، چاہے عدالت کچہری میں راضی نامے کرا کر۔

اتنا سب کچھ ہونے پر چمپکا اس نتیجہ پر پہونچی کہ اس کے شوہر کی طرح دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا اس لیے وہ چپ ہو گئی۔ ایک بار شوہر کی شکایت کچھ لوگوں سے کی تھی تو الٹا خود ہی خفیف ہونا پڑا تھا، اس لیے ایک بار جب وہ گھر میں گھسی تو پورے ایک سال تک قدم باہر نہ نکالا۔

دو ایک سال بعد اس کے بھائی کا تبادلہ ہُبلی ہو گیا۔ اس وقت اس کا دل چاہا کہ وہ اس حسینہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے جس نے اس کے شوہر کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ اُس شوہر کو جس سے وہ خود ہار مان چکی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے بھائی کے گھر ہبلی گئی اور محبوب جان کا پتہ لگایا۔ ایک دن اپنی بیٹی کو لے کر محبوب جان کے گھر پہونچی۔ وہاں اپنی بیٹی کو اس کے قدموں میں ڈال کر رو رو کر اور آنچل پھیلا پھیلا کر اپنا دکھڑا محبوب جان کو سنایا اور گھر واپس آ گئی۔

محبوب کو اس وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ راگھپا کے بیوی بچے بھی ہیں اس نئے انکشاف سے اس کا دل پگھل گیا۔ اگلے ہفتہ جب راگھپا اس کے پاس آیا تو اُسے "اپنے گھر جائیے" کہہ کر لوٹا دیا اس کے بعد ڈیڑھ سال تک راگھپا کو محبوب جان کا دیدار نہ ہو سکا۔ اس عرصہ میں چمپکا کے دل میں نئے اندیشوں نے سر اٹھانا شروع کیا۔ اُسے یہ خوف ہوا کہ راگھپا ادھر ادھر غلط جگہوں پر بھٹک کر کہیں اپنی صحت نہ گنوا بیٹھے آخر ایک دن خود محبوب جان کے گھر گئی اور راگھپا کی ذمہ داری اسے سونپ دی۔ اس سے محبوب جان اس گھر میں کسی دیوی کی طرح محترم ہو گئی تھی۔ تب سے یگادی اور دیوالی کے تہواروں پر چمپکا محبوب جان کو گھر پر مدعو کرتی اور کبھی بلاؤز کا کپڑا کبھی کوئی اور تحفہ دے کر واپس کرتی۔ محبوب جان بھی چمپکا کو فصل پر امرودوں اور آموں کی ٹوکریاں بھیجتی تھی۔ اس سے راگھپا کی زندگی میں بھی پہلے سے زیادہ انانیت پیدا ہوئی۔ اس دوران چمپکا کے ہاں ایک اور بچی پیدا ہوئی لیکن اس کی پیدائش کے وقت سے ہی چمپکا کو سینہ کا درد اور سل کی بیماری لاحق ہو گئی اور وہ سال میں تین چار مہینے بستر سے لگی رہنے لگی۔ ڈاکٹروں کی صلاح تھی کہ اب دوبارہ اس کے حمل نہیں ٹھہرنا چاہیے۔

چمپکا کی علالت کے ابتدائی زمانے میں محبوب اسے ہبلی کے اسپتال میں دن میں دو بار دیکھنے جاتی تھی۔ بچوں کی پڑھائی کے بہانے جب راگھپا دھارواڑ منتقل ہو گیا تو محبوب جان کی آمد و رفت گھر میں اور بھی بڑھ گئی اور وہ بھی اسی گھر کی ایک فرد سی بن گئی۔ بچوں کو تو اس سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ جب بھی وہ آتی ان کے لیے ٹافیاں اور پھل وغیرہ لے کر آتی۔

اب رتنا چودہ سال کی اور شانتا بارہ سال کی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے اچھے چال چلن کے لیے سارے محلے میں مشہور تھیں۔ رتنا کی عمر جوں جوں شادی کے قابل ہوتی جاتی چمپکا کی فکر بڑھتی جاتی۔ گنگوا اور کٹی کی دھارواڑ میں موجودگی کا اسے علم تھا لیکن گھر میں ان کے بارے میں کبھی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ مگر کٹی جب بڑا ہو کر تحصیلدار صاحب کے دفتر میں نوکر ہو گیا تو راگھپا

نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر کیا۔ اسے کٹی کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کرنے کی کوئی خاص خواہش نہیں تھی لیکن چمپکا کی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جائے تاکہ دونوں گھروں کے تعلقات بحال ہو جائیں۔ کٹی کے باپ سوامی رائے نے اس کی شادی کے معاملہ میں اس پر جو احسان کیا تھا وہ اب تک اُسے بھولی نہیں تھی۔ اپنی بیٹی کٹی کو دے کر وہ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتی تھی اُسی کے اصرار پر راگھیا پہلے کٹی سے دفتر میں ملا اور پھر اس دن گنگوا کے گھر جا کر اس نے شادی کا پیغام دیا۔ گنگوا کے انکار سے راگھپا کے اندر چھپے ہوئے کھلاڑی کو شہ ملی اور وہ اپنے اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے شطرنج کی سی چالیں چلنے پر تل گیا۔ "تیری آنکھوں کے سامنے ہی تیرے بیٹے کو اپنی جیب میں رکھ لوں گا" اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ایک باقاعدہ منصوبہ بنایا۔ ساتھ ہی اس نے ایک کام اور بھی کیا۔ راگھپا کو اپنی شادی کے معاملہ میں کسی سے شاکی ہونے کا کوئی جواز نہ تھا پھر بھی سوامی رائے کی ڈانٹ کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہونے سے اس کی انا کو جو زبردست ٹھیس پہونچی تھی اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ خفت اور کینہ کا انتقام لینے کی خواہش اس کے دل میں اب بھی چھپی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کٹی کو بیاہ دے تو اس ہتک کا تھوڑا بہت مداوا ہو جائے گا۔ خوش قسمتی سے رتنا بے حد حسین تھی راگھپا کو یقین تھا کہ رتنا کا حسن ہی اس کی نصف کامیابی کی ضمانت ہے۔ اسی لیے وہ اگلے اقدامات کا نقشہ بنا رہا تھا اگر بیاہ کا فیصلہ ہو جائے تو اخراجات کے لیے دو تین ہزار روپیہ ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ دھارواڑ میں بڑے بڑے لوگوں سے اس کی دوستی تھی اور بیاہ میں ان کو شریک کرنا ضروری تھا اس لیے شادی دھوم دھام سے ہونا چاہیے۔ راگھپا کو گھر کے معمول کے اخراجات کی کوئی فکر نہ تھی لیکن اکٹھا اتنے پیسے حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس زمین بیچنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

جب راگھپا اس فکر میں ڈوبا ہوا تھا اس وقت چمپکا عورتوں کی فطری کمزوری سے پیدا ہونے والی فکروں میں مبتلا تھی۔ محبوب جان میری بہن ہے۔ وہ میرے لیے ایک دیوی کی مانند ہے، یہ تو ٹھیک ہی ہے۔ لیکن اسے اس گھر سے اب تک آٹھ دس ہزار روپے مل چکے ہیں۔ کیا رتنا اس کی بیٹی نہیں ہے۔ بیٹی کی شادی کے لیے کیا اسے خود دو ایک ہزار روپیہ دینے کی پیش کش نہیں کرنی چاہیے۔ اسی خیال سے چمپکا ہر بار محبوب جان کو بڑے پیار سے یہ بات جتا دیا کرتی تھی ایک بار جوش میں راگھپا سے بھی وہ یہی بات کہہ بیٹھی۔ راگھپا یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور

غصہ سے گرجنے لگا" خبردار، جو پھر یہ بات میرے سامنے کہی، اگر ضرورت پڑی تو میں ایک کھیت فروخت کر دوں گا ورنہ رتنا بیٹے کی طرح گھر میں رہے گی" اُس دن سے چمپکا کو پھر کبھی اس کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چمپکا نے ایک بار پھر محبوب جان سے کہا "دیکھو بہن تمھارے "جمان" رتنا کی شادی کے لیے میگور کے کھیت فروخت کرنے کو سوچ رہے ہیں" تیز طرار محبوب ان باتوں کا مقصد نہ سمجھتی ہو ایسا نہیں تھا لیکن ایسی باتوں پر وہ خاموش رہتی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ابھی شادی کا معاملہ طے نہیں ہوا تھا دوسرے یہ کہ اس نے حال ہی میں اپنے بھانجے کو کرانے کی دکان کرادی تھی اور اس میں اپنا سارا پیسہ لگادیا تھا۔

11

دیسائی جی کے اندیشے

دیسائی جی متفکر ہو کر لکشمی بائی اسکول پہونچے۔ وہ جب پرنسپل صاحب کے کمرے کی طرف جارہے تھے تو انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے سب ہی کلاسوں کے شور مچاتے ہوئے بچے بڑی دلچسپی سے ان کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ ایک کلاس کے سامنے سے گزرتے ہوئے انھیں ایک اجڈ ماسٹر کی گرجدار آواز سنائی دی "ادھر اُدھر مت دیکھو، میری طرف دھیان دو" اس سے دیسائی جی کی تشویش اور بڑھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں بھگوان سے یہ دعا کر رہے تھے "بھلے ہی جھگڑا ہو، چوری ہو، خون ہو لیکن وہ بات نہ ہو" یہی دعا مانگتے ہوئے وہ پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ پرنسپل نے اپنی روایتی مسکراہٹ اور گرم جوشی سے ان کا استقبال نہیں کیا۔ بس "آئیے" کہہ کر ایک کرسی کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہی ہوا جس کا ان کو ڈر تھا۔ وسنت راؤ کے بارے میں اس سے پہلے بھی کافی شکایتیں تھیں مثلاً کلاس میں شور مچانا، استادوں پر آوازے کسنا، جب جی چاہے اسکول آنا اور جب نہ چاہے اسکول نہ آنا۔ یہ سب باتیں اس میں پہلی جماعت سے ہی موجود تھیں لیکن چونکہ دیسائی جی ابتدا سے ہی اسکول کے سرپرستوں میں تھے اور اسکول کی انتظامی کمیٹی کے بھی رکن تھے اس لیے اساتذہ وسنت کی شکایت کرنے کی ہمت ہی نہ کرتے تھے۔ میٹرک میں پہلی بار

فیل ہونے کے بعد وسنت راؤ کے طرزِ عمل میں ایک عجیب تبدیلی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جلد ہی خود اسکول کا لائف ممبر بننے والا ہو۔ اسکول کی چھٹی کے وقت وہ اپنے چند لفنگے دوستوں کے ساتھ کلاس کی لڑکیوں کا پیچھا کرتا اور ان کو چھیڑتا۔ کبھی کبھی وہ ان کا پیچھا ان کے گھروں تک کرتا۔ یہ تمام باتیں چپراسی سے لے کر پرنسپل تک سب ہی کو معلوم تھیں۔ اب تک وسنت راؤ اس سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ لڑکیاں بھی اس کی ان حرکتوں کی خوگر ہو گئی تھیں اور اس کی طرف دھیان دیے بغیر اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔ گزشتہ سال وسنت راؤ تیسری بار میٹرک کے امتحان میں بیٹھا تھا۔ اُس وقت سے اس نے اپنی تعلیمی حالت کے حسبِ حال سب ہی طور طریقے تیسرے درجے کے اپنا لیے تھے۔ اندومتی کے سوئمبر میں آنے والے راجاؤں کو بھی شرمندہ کرنے والے طور طریقے اس نے اپنائے۔ لڑکیوں کے نرم رخساروں کو اس نے چکنی ڈلی کا نشانہ بنایا۔ کبھی کبھی چمپا کے پھول کی پنکھڑیوں پر اپنا نام لکھ کر یا کسی لڑکی کا نام لکھ کر روزانہ الگ الگ لڑکیوں کے بالوں میں ٹھونس دیتا اور اس طرح اپنی محبت کا اظہار کرتا۔ کلاس میں لمبے بالوں والی فیشن پرست ایک لڑکی تھی۔ وسنت کو اس سے مطلق لگاؤ نہ تھا۔ کسی شخص نے اسے کبھی بتایا تھا کہ سر پر نمک چھڑک دینے سے بال اڑ جاتے ہیں۔ اس نے ذاتی طور پر اس کا تجربہ کرنے کے لیے ایک دن اسکول کی دیوار پر کھڑے ہو کر اس لڑکی کے سر پر پورا آدھا سیر نمک انڈیل دیا۔ اس کے یہ کرتوت دیکھ کر پرنسپل نے اُسے بلا کر ایک دن خوب ڈانٹا لیکن وہ پرنسپل کو دھوکا دینے کے فن میں بھی ماہر تھا۔ اس نے ڈانٹ کھا کر ایک سادہ لوح گنوار کی طرح ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے پرنسپل سے کہا

"ایک بار غلطی ہوئی مہاراج، مجھے اپنا بیٹا سمجھ کر معاف کر دیجیے" ایسے لوگوں کو کس طرح سمجھایا جائے، پرنسپل کے لیے یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ اسکول کے طالب علموں میں وسنت راؤ کے قصے مذہبی کہانیوں کی طرح مشہور تھے جن کی بنا پر رات دن اس کی شہرت میں اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ اس کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کسی طالب علم کے ساتھ برائی نہیں کرتا اور نہ کسی کا دل دکھاتا ہے۔

اُسی سال کی دوسری ششماہی میں پونا سے تبادلہ ہو کر آئے ہوئے سب جج کی لڑکی نے بھی اُسی اسکول میں داخلہ لیا۔ اس کے آنے کے بعد وسنت راؤ، جو اب تک لڑکیوں میں اس طرح گھومتا تھا جیسے گوپیوں کے درمیان کرشن جی، اس پر دل وجان سے فریفتہ ہو گیا۔ بلی جیسی آنکھوں والی اس لڑکی کو وسنت بکرے کی آنکھوں سے دیکھتا۔ اب تک وسنت کا عشق زبانی چھیڑ چھاڑ تک

محدود رہا تھا لیکن اس لڑکی کے عشق نے اسے حال سے بے حال کر دیا چنانچہ وسنت اپنے دوست عبدالعزیز کے کمرے میں گیا اور اسے اپنے دل کا حال بتایا۔ اس سے غزلیں سیکھیں اور ان کو گا گا کر خود ہائے ہائے کہتا اور لمبی لمبی سانسیں بھرتا پھر ایک دن عبدالعزیز کی مدد سے اس نے مندرجہ ذیل محبت نامہ لکھ کر اس لڑکی کے جیومیٹری بکس میں چھپا دیا۔

پیاری پیلے (دکاری کھوٹے)

سب ٹھیک ہے۔ میں دل و جان سے تمہیں پیار کرتا ہوں۔ تم بھی مجھ سے پیار کرو۔ میں اور تم سینما چلیں گے۔ باکس میں بیٹھیں گے۔ میں موٹر اسٹینڈ پر تین بجے تمہارا انتظار کروں گا سینما ساڑھے تین بجے شروع ہوتا ہے۔ اگر تم نہ آئیں تو میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ اب کچھ اور نہیں لکھ سکتا۔ باقی باتیں ملنے پر ہوں گی۔ باقی سب خیریت ہے۔

ڈاک خانہ دھارواڑ — تمہارا پیارا مجنوں
ضلع دھارواڑ — وسنت راؤ گوپال گوڑا دیسائی (بہادر)

پیلی نے یہ خط اپنی ماں کو، ماں نے اپنے شوہر کو اور انھوں نے اپنے نوٹ کے ساتھ پرنسپل کو بھیج دیا۔ اس طرح وسنت راؤ کا پریم پتر گویا تین دن تک سفر کرتا رہا۔

قارئین اس پریم پتر کو "بکواس" نہ سمجھ بیٹھیں کیونکہ یہ واقعہ آج سے کم از کم تیس سال پہلے کا ہے اور اس وقت کے محبت نامے آج کے محبت ناموں کی طرح بیچھورے اور گھٹیا نہیں ہوتے تھے۔

پرنسپل صاحب کے سامنے بڑا نازک سوال تھا۔ لڑکی کے باپ سب جج نے بہت سخت قسم کا قانونی نوٹ لکھ کر خط کے ساتھ بھیجا تھا، جو یہ تھا۔

جناب پرنسپل صاحب!

میں آپ کی خدمت میں وہ خط بھیج رہا ہوں جو مجھے اپنی بیٹی کے جیومیٹری بکس میں ملا ہے۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ اس غنڈے کے خلاف کیا کارروائی کرتے ہیں۔ مہربانی کر کے حامل رقعہ کے ہاتھ دونوں خطوں کی رسید بھیج دیں فقط

سب جج صاحب کا رقعہ لانے والا سپاہی خط کی رسید لے کر ہی واپس گیا۔

پرنسپل صاحب کو یک گونہ خوشی بھی تھی کیونکہ اس بار شکایت انھیں تحریری طور پر

موصول ہوئی تھی انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس خط کو دیسائی جی کے سامنے رکھ کر اُن سے ہی پوچھیں گے کہ اس معاملہ میں کیا کارروائی کی جائے۔ اس طرح گویا وہ ساری ذمہ داری دیسائی جی پر ڈال دیں گے۔ خط دیکھ کر دیسائی جی کو پسینے چھوٹ گئے۔ ان کو پسینہ پسینہ دیکھ کر پرنسپل صاحب کو بھی پسینہ آگیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ اسی اثناء میں کچھ لڑکے جو ماسٹروں سے پیشاب کرنے کی اجازت لے کر کلاس سے باہر آگئے تھے پرنسپل صاحب کے کمرے میں جھانکنے لگے۔ دیسائی جی کو فیصلہ پر پہونچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگے۔

"ماسٹر صاحب، آپ یہ بھول جائیے کہ میں اسکول کا ڈونر ہوں البتہ لڑکے کا باپ ہونے کے ناتے میری آپ سے ایک درخواست ہے۔ اگر آپ اسے بھی صحیح نہ سمجھیں تو بلاتردد —— رد کر دیجے گا۔"

ماسٹر صاحب کو فکر ہوئی کہ پتہ نہیں دیسائی جی کیا کہہ بیٹھیں۔ وہ تھوڑا اجز بز ہو کر بولے "فرمائیے"

"میں اپنے بیٹے کا نام کاٹ دینے کے لیے عرضی دوں گا۔ آپ اس کا نام کاٹ دیجے۔ اس کے بعد میں اُسے تاکید کر دوں گا کہ وہ اسکول کے آس پاس بھی قدم نہ رکھے۔ اس پر بھی اگر وہ باز نہ آئے تو دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ چاہیں تو چپراسی سے دھکے دے کر اسے نکلوا دیں۔ ایک شخص کی وجہ سے اسکول کی بدنامی نہیں ہونی چاہیے۔ اسکول بھی ایک طرح سے میرا بچہ ہی ہے" دیسائی جی نے اپنی بھیگی آنکھوں کو رومال سے پونچھ کر مزید کہا "میری بس یہ درخواست ہے کہ آپ اُسے اسکول سے خارج کریں تو یہ الفاظ نہ تو ریکارڈ میں درج کریں نہ ہی نوٹس بورڈ پر لگوائیں البتہ اگر آپ چاہیں تو جج صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے خط میں یہ بات لکھ دیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں ایک معافی نامہ لکھ کر آپ کو دیدوں۔ بہرحال میری یہ چھوٹی سی درخواست ہے اور آپ چاہیں تو اس کو پورا کر سکتے ہیں۔"

"پروگریس رپورٹ نہیں بھیجی، فیس زیادہ لے لی، کھیلوں کی فیس لیتے ہیں لیکن کھیلنے کو کچھ نہیں دیتے،" عام والدین کی یہ باتیں صبح سے شام تک پرنسپل صاحب روزانہ سنتے آئے تھے۔ ایسی تلخ قسم کی باتیں سننے والے پرنسپل صاحب کو دیسائی جی کی باتیں گویا شہد جیسی میٹھی معلوم ہوئیں۔ تشکر کے احساس سے ان کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دیسائی جی سے ان سب باتوں کی توقع نہ تھی۔ دیسائی جی کی باتوں سے انھیں یہ امید بندھی کہ وہ اس معاملہ میں پورا پورا انصاف کر سکیں گے،

جج صاحب سے البتہ تھوڑا جھوٹ بولنا پڑے گا لیکن ذراسی ہوشیاری سے اس سے بھی کسی حد تک بچا جاسکتا ہے۔ ان کے تھکے دماغ کو سب سے زیادہ سکون یہ دیکھ کر ہوا کہ دیسائی جی کو اسکول کی نیک نامی کس قدر عزیز ہے۔

پرنسپل صاحب نے وسنت راؤ کو بلا بھیجا۔ وہ ابھی تک کلاس میں نہیں پہونچا تھا۔

اس دن وسنت راؤ خوب بناؤ سنگار کرکے اپنے دوست عبدالعزیز کے کمرے پر پہنچا اور ساری دوپہر اس کے ساتھ ہوٹل پر بیٹھا اصلاح مشورہ کرتا رہا۔ دو ہی بجے سے وہ موٹر اسٹینڈ پر کھڑا ہو گیا۔ دو گھنٹے کھڑے رہنے پر بھی کوئی نہ آیا تو اس نے موٹر اسٹینڈ اور سینما کے بیچ کوئی دس چکر لگا ڈالے۔ اس کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس کی محبوبہ نے اُسے پسند نہیں کیا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دل نے اس سے کہا اسکول کی چھٹی ہونے سے پہلے اسکول جاکر اس پر اپنے دل کی حالت ظاہر کر دینی چاہیے۔ اسکول کا فاصلہ زیادہ تھا، اس لیے اسے شبہ ہی تھا کہ وہ چھٹی سے پہلے اسکول پہونچ سکے گا یا نہیں۔ بہرحال اس نے فوراً ایک تانگہ کیا تانگہ چھن چھن کرتا اسکول کے احاطے تک پہونچ گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کس کی سواری ہے سارا اسکول امنڈ پڑا۔ پرنسپل صاحب بھی یہ سوچ کر کہیں انسپکٹر صاحب تو نہیں آدھمکے اپنے کمرے سے باہر آگئے۔ ان کے پیچھے پیچھے دو چپراسی دوڑے۔ انسپکٹر صاحب کی ہیبت سے اسکول کی چار دیواری کے اندر لگے ہوئے پیڑوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں بھی مبہوت ہو گئی تھیں۔ عین اُسی وقت وسنت راؤ بڑی شان سے اپنی دھوتی سنبھالتا تانگے سے اترا۔ پان سے اس کا منھ رچا ہوا تھا۔ اس کے گرم کوٹ سے آتی ہوئی عطر کی خوشبو کے سامنے باغ کے پھولوں کی مہک بھی ہیچ تھی۔ کوٹ کے کاج میں گلاب کا ایک تازہ پھول لگا ہوا تھا جیب میں سے دو تین رنگ کے رومال جھانک رہے تھے۔ جوتے پالش سے چمک رہے تھے۔ گردن میں اسکارف شیش ناگ کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر کھیل رہی تھی۔ عبدالعزیز نے اُسے پورا مجنوں بنانے کے لیے اس کی آنکھوں میں سرمہ بھی لگوا دیا تھا اپنی اس ہیئت کذائی میں وسنت راؤ ناٹک کے کسی عجیب دوہرے کردار جیسا دکھائی دیتا تھا آدھا بھیم سین اور آدھا تین مہینے کی زچہ۔ پرنسپل صاحب اپنے جوتوں کا ہوش کھو کر ننگے پاؤں گھوڑے کی طرح دوڑتے ہوئے وسنت کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ وہ جوڑنے کے لیے اٹھے ہاتھوں سے سر کھجانے لگے جلدی میں یہ سمجھ میں نہ آنے پر کہ اس حالت میں کیا کیا جائے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کلاسوں میں لڑکے

ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پانچویں درجہ کے ایک ماسٹر صاحب اپنی ہنسی نہ روک سکے اور ان کے منھ سے "ہی" نکل ہی گیا۔ بس پھر کیا کہنا تھا ساری کلاس قہقہہ لگانے لگی اور ذرا ہی دیر میں یہ ہنسی برابر کی دو تین کلاسوں تک پہونچ گئی اور وہاں بھی قہقہے پڑنے لگے۔ اس اثنا میں پرنسپل صاحب سنبھل گئے:

"کیا ہے؟" انھوں نے گمبھیرتا سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، جناب، گھر میں شرادھ تھا اس لیے آنے میں دیر ہوگئی۔"

پرنسپل صاحب نے سوچا اب اس شرادھ کو ختم ہی کر دینا چاہیے۔ وہ اُسے اپنے کمرے میں لے گئے اور وہ پریم پتر اس کے ہاتھ میں دے کر اس سے پوچھا "کیا یہ تم نے لکھا ہے؟"

اپنے ہی خون سے لکھا خط جب پرنسپل کے ہاتھ سے اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ خط اسے اپنا دشمن معلوم ہوا۔ اس خط پر اسی کے دستخط تھے، اسی کی سیاہی تھی، اپنی شخصیت کے بارے میں ہر قسم کی غلط فہمیوں کے سدباب کے لیے نام کے ساتھ جوڑا ہوا لفظ "بہادر" بھی تھا۔ ان سب باتوں نے جیسے اُسے جکڑ لیا تھا۔ اس کا کچھ کہنے کو جی نہ چاہا۔ جھوٹے غصہ سے وہ قانون کا سہارا لینے لگا اور بولا:

"جی ہاں میں نے ہی لکھا لیکن آپ نے اسے پڑھا کیوں؟"

اس پر پرنسپل صاحب نے جج صاحب کا رقعہ اس کے سامنے بڑھا دیا اور گرجدار آواز میں بولے "کل سے تم اسکول نہیں آؤگے۔"

ان کا غصہ دیکھ کر وسنت راؤ نے خوشامد سے کام نکالنا چاہا:

"سر مجھے اپنا بیٹا سمجھ لیجیے۔ اس مرتبہ معاف کر دیجیے۔ اس غلطی کو اپنے تک ہی رکھیے۔"

پرنسپل صاحب کے لیے وسنت کی یہ باتیں نئی نہ تھیں۔ وہ بولے "یہ سب نہیں چلے گا۔ کل سے اسکول آنے کی ضرورت نہیں۔ آئے تو....." یہ کہہ کر انھوں نے تھوک نگلا۔ وسنت کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔

"آیا تو کیا کیجیے گا"

"یہ بات باپّا سے پوچھو"

باپّا گھنٹی بجانے والا نہایت طاقتور چپراسی تھا۔ وسنت کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے توہین بھی محسوس کی۔ گھمنڈ سے ہکلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں باپّا کیا کرے گا۔ میرے پتاجی کی دی ہوئی

نوکری ہے۔ ورنہ مارا مارا پھرتا۔ ذرا چھو کر تو دیکھے مجھے........" یہ کہہ کر وہ پھر اصل موضوع کی طرف آیا "میں کل سے اسکول نہیں آؤں؟ کیوں؟ میں کیا فیس نہیں دیتا، پتھر دیتا ہوں؟ فیس دیتا ہوں فیس!"

"تمھاری فیس کی بھی ضرورت نہیں اور تمھاری بھی ضرورت نہیں۔"

"کیوں؟ جب آپ کو ضرورت ہو تو آؤں ورنہ نہیں! یہ اسکول آپ کے باپ کا نہیں۔" یہ کہتے کہتے وسنت سسکیاں لینے لگا۔ چپراسیوں نے آکر اسے پکڑ لیا۔ وہ زور لگا کر زمین پر بیٹھ گیا وسنت نے جب دیسائی جی کا لکھا ہوا معافی نامہ پڑھا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی پھر پرنسپل صاحب نے اُسے یہ بھی بتایا "دیسائی صاحب نے ہی تمھیں باپّا کے ذریعہ باہر نکلوا دینے کی واضح اجازت دی ہے وہ تمھاری تمام حرکتوں سے واقف ہیں..... تمھارے پتا نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم غصہ میں آکر رات کو میرے گھر جاتے وقت کوئی حرکت کرو تو......" یہ تمام باتیں بتانے کے بعد آخر میں انھوں نے اس سے کہا "اب تم جا سکتے ہو۔"

وسنت گیند کی طرح اچھل کر کمرے باہر آیا۔ پیسہ نہ ملنے کی وجہ سے تانگا ابھی تک باہر ہی کھڑا تھا۔ وسنت راؤ سسکیاں بھرتا اور ہتھیلیاں ملتا اس طرح تانگے پر چڑھا جیسے...... پھر بولا "جانے دو۔ اس طرح کون آتا ہے" یہ کہہ کر اس نے اسکول کے فرش پر تھوک دیا۔

12

وسنت راؤ کی لنکا ڈھینا

اسکول سے چل کر وسنت راؤ سیدھا اپنے دوست عبدالعزیز کے کمرہ پر پہونچا عبدالعزیز کو اپنی "استادی" کا مناسب انعام نہ ملنے کا رنج ہوا۔ اس شکست محبت کا حقیقی صدمہ اسی کو ہوا لیلیٰ مجنوں کی کہانی پڑھ کر جوان ہونے والے اس دوست کو اس بات کی فکر ہوئی کہ کہیں وسنت راؤ غم سے تباہ نہ ہو جائے، اپنا سینہ نہ پیٹ لے، کہیں پاگل نہ ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اسے سمجھانا شروع کیا لیکن وسنت راؤ تو پریم کی بات ہی بھول چکا تھا۔ اُس کے سر میں اس وقت محبت کے سودے کی جگہ اسکول میں ہونے والی بے عزتی تھی۔ وہ اسکول کو جلا ڈالے یا پرنسپل

کو اندھیرے میں پکڑ کر پیٹ دے، وہ اس قسم کی باتیں ہی سوچ رہا تھا۔ عبدالعزیز کی غزلوں سے اس کو سکون نہ ملا۔ اس نے اندھیرا ہونے پر گھر کی راہ لی۔ گھر کے پاس پہونچ کر اس نے سوچا "یہاں کیوں جاؤں" اور واپس لوٹ گیا۔ کوئی منزل متعین نہ ہونے کے سبب وہ دس بجے تک چکر لگاتا رہا۔ آخری چکر پر جب وہ اپنے گھر کے احاطے کے پاس پہونچا تو اسے اندر ہونے والی یہ گفتگو سنائی دی:

"کوئیں کے پاس والے گھر میں تاش کھیل رہا ہوگا۔ وہاں دیکھ کر آیا" دیسائی جی پوچھ رہے تھے۔

"وہاں بھی نہیں ہیں، مالک"

"اس مسلمان لڑکے کے کمرے میں دیکھ آئے"

"ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔"

"تو آدھ گھنٹہ اس کا انتظار کرو، جیسے ہی وہ آئے مجھے فوراً اطلاع دینا۔ جائے گا کہاں؟"

اس کے بعد پھر کوئی اور آواز نہ سنائی دی۔

یہ گفتگو سن کر وسنت کا وہاں سے بھاگ جانے کو جی چاہا لیکن اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ عزیز کا کمرہ بھی بہت دور تھا۔ اس نے سوچا اگر وہ کسی اور کے گھر جائے گا تو اور بہت سے بکھیڑے پیدا ہوں گے۔ پروہت بالم بھٹ کے گھر جا کر "بھٹ تم ہی کھانا کھلاؤ"، کہہ سکتا ہے لیکن وہاں سونا مشکل ہے۔ وہاں کھٹمل بہت ہیں۔ معاً ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ کسی کمرے کے پچھواڑے سے آنگن میں داخل ہو کر چپ چاپ اپنے اوپر کے کمرے میں گھس جانا چاہیے۔

پچھواڑے کی طرف گہرا اندھیرا تھا۔ باڑھ کو پھاند کر کانٹا نہ چبھنے سے خوش ہوتا ہوا وہ گھر کے قریب پہونچا۔ اندھیرے میں گھر کسی سفید دیو کے غیر واضح ہیولیٰ کی طرح کھڑا تھا۔ اس نے ٹوپی اتار کر جیب میں رکھ لی اور کوٹ کو آستینوں سے کمر پر باندھ لیا جوتے جالی میں چھپا دیے۔ دھوتی اوپر چڑھا کر لانگ کس لی۔ کھڑکی پر پاؤں رکھ کر اس کی سلاخوں میں انگوٹھے پھنسا کر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کھسکتا ہوا کھڑکی کے پتھر کے چھجے کو پکڑ کر لٹک گیا اور برابر میں لگے ایک چھوٹے پتھر کے سہارے چھجے پر چڑھ گیا۔ چھجے پر کھڑے ہو کر بھی وہ اپنی کھڑکی تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔ اگر کسی طرح سے کھڑکی کی سلاخ تک اس کا ہاتھ پہونچ جاتا تو وہ ایک چھلانگ میں اپنے کمرے میں ہوتا۔ برآمدے کی سلاخیں بھی اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ وسنت نے

پنجوں کے بل کھڑے ہوکر کھڑکی کے چھجے کو بھی پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس پر بھی اس کی انگلیوں کی مکمل گرفت ممکن نہ ہوئی۔ انگلیوں کی اتنی معمولی گرفت پر وہ اپنے جسم کا سارا بوجھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ایسی مایوسی وسنت کو زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔جسمانی تھکن دوبارہ شدت سے محسوس ہونے لگی۔ تھکن کی وجہ سے اس کا سارا بدن پسینہ پسینہ ہورہا تھا۔ پنڈلیاں اس طرح دکھ رہی تھیں جیسے کسی نے ان میں لوہے کے کانٹے چبھا دیے ہوں۔تلوے الگ پسیج گئے تھے۔ اگر اس کا دھیان ذرا بھی ادھر ادھر ہو جاتا تو وہ چھت سے گرنے والی چھپکلی کی طرح پٹ سے نیچے گر پڑتا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پیر لٹکا کر دیکھا۔ نیچے کھڑکی کی سلاخیں اس کے پیروں سے مس نہ ہوئیں۔ اس حالت میں اس نے اوپر سے کود پڑنا ہی مناسب سمجھا۔ اس اندھیرے میں یہ تو دکھائی نہیں دیتا تھا کہ زمین کتنی دور ہے۔ جہاں بھی کودا جائے پیروں کے بل ہی کودنا ٹھیک رہے گا۔ یہ سوچ کر پیچھے کی طرف ذرا سا جھکاؤ لے کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ ہوا میں ایک لمحہ معلق رہ کر دھڑام سے نیچے گر پڑا آنکھوں میں اندھیرا چھا جانے کے سبب دو منٹ سر پکڑے بیٹھا رہا۔ اسے ساری دنیا تاریک سی معلوم ہوئی۔اتنے میں کونے میں سرسراہٹ سنائی دی۔ یہ آواز گائے بندھنے والی کوٹھری میں سے آرہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا کوٹھری اُسے سونے کے لیے بلا رہی ہے۔ وہ سرکتا ہوا کوٹھری میں پہونچا اور پیال پر لڑھک گیا اور ذرا ہی دیر میں وہیں سو گیا۔

رات کے بارہ بجے تک لڑکا گھر نہیں لوٹا۔ اگر سینما بھی گیا ہوتا تو اس وقت تک لوٹ آنا چاہیے تھا۔ وینو بائی جو اب تک خاموش تھی بدحواس ہوکر رو پڑی۔ میاں بیوی دونوں نے اس دن کھانا نہیں کھایا تھا۔ رات کے دو بجے تک دیسائی جی گلی گلی بھٹکتے پھرے۔ آخر ریلوے اسٹیشن گئے اور ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ وہاں پہونچ کر انھوں نے ایک طرف بھرما کو اور دوسری طرف پلا کو وسنت کی تلاش میں دوڑایا۔ یہ لوگ لالٹین لے کر ڈیڑھ ڈیڑھ میل تک وسنت کو ڈھونڈ کر ناکام لوٹ آئے۔ دیسائی جی مایوس ہوکر گھر واپس آگئے۔ وینو بائی اپنے چھوٹے بیٹے پرشوتم کو سینہ سے لگائے بیٹی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ آہٹ پاتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر رونے لگی۔ دیسائی جی اُسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی رہے تھے کہ مرغ بانگ دینے لگا۔ پو پھٹتے پھٹتے سب کو نیند آگئی۔

سات بجے کے قریب گوبر اور کچرا اٹھانے کے لیے جب بھرما گوٹھ میں آیا تو بھوسے کے ڈھیر میں سویا ہوا وسنت اسے نظر آیا۔ دیسائی جی کی اسی وقت آنکھ لگی تھی۔ بھرما نے انہیں جگا دیا۔

وینو بائی بھی دوڑتی ہوئی آئی اور آنکھیں پھاڑے خاموشی سے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہ گئی۔ دیسائی جی نے مزید باتوں کے بغیر بھرما سے اسے جگانے کو کہا۔ وینو بائی نے خود جا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اُسے جگایا۔ وسنت آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو بھوسے، گوبر، چارہ اور گھاس پر نظر پڑی اور اسے گزشتہ دن کی سب باتیں یاد آ گئیں۔

ماں اسے سینے سے لگائے رقت بھری آواز میں "وسنت وسنت" کہہ کر چمکارنے لگی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے بڑی محبت سے اُسے ایک کٹورا دودھ پلایا۔ دیسائی جی چپ چاپ سب کچھ دیکھتے رہے۔ بیٹے کو اس حالت میں سوتا دیکھ کر ان کا دل بھی پگھل گیا تھا لیکن انھوں نے اپنے دل کی اس کیفیت کو اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

دے نکانے وسنت کے بدن پر تیل مل کر اُسے نہلایا۔ اس کے بعد آرتی اتاری اور پھر نظر اتار کر ماتھے پر کم کم کا ٹیکا لگایا اور ناشتہ کے لیے بٹھایا۔ وسنت کو بہت زور کی بھوک لگی تھی اس لیے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ ماں گڑگڑا کر بولی "وسنت مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جانا بیٹا، دیکھ تیری وجہ سے کل ایک پل کو بھی میری آنکھ نہیں لگی۔ ساری رات ایک سی بیٹھی رہی۔ وہ بھی رات بھر تجھے گلی گلی ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔ چاہے تو بھرما سے پوچھ لے۔ جا بیٹا ان سے معافی مانگ، 'میری غلطی ہوئی پتا جی' کہہ، اس سے اُن کا دل بھی ہلکا ہو جائے گا۔"

لیکن پیٹ بھر جانے کے بعد وسنت باپ سے معافی مانگنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ باپ نے اسے اسکول سے چھڑا دیا اور پرنسپل سے یہ کہا کہ اسے چپراسی کے ذریعہ نکلوا دیا جائے۔ یہ بات یاد کر کے وہ ماں کی بات ماننے کو کسی صورت سے تیار نہ ہوا۔

وسنت کے عجیب طرز عمل کو اور اس کی تمام غلطیوں کو نظر انداز کر کے سب نے گھر میں اس کا شاندار خیر مقدم کیا لیکن دوسرے ہی دن سے دھارواڑ شہر جیسے اسے کاٹنے لگا۔ اس کے اسکول سے نکالے جانے کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی تھی اور اب اس کے لیے گلیوں میں نکلنا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا سارا شہر اس کا دشمن ہو گیا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی اس توہین کا انتقام وہ مس کھوٹے سے لے کر رہے گا۔ چنانچہ ایک رات وہ چپ چاپ گھر سے نکل گیا اور اس نے تمام پبلک مقامات پر ایک چاقو سے اس کا نام اور طرح طرح کی پیار کی باتیں گود دیں۔

دیسائی جی کے پاس اس کی شکایت پھر پہونچی۔ وسنت نے گھر میں سب لوگوں کی قسم

کھا کر کہا "میں نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ میں تو گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔"
دیسائی جی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کریں۔ آخر کار وے نکّا کی سفارش کو مسترد کرتے ہوئے انھوں نے وسنت کو گاؤں بھیج دیا۔ وہ تو دھارواڑ چھوڑنا ہی چاہتا تھا۔ باپ اور دھارواڑ کے لوگوں کی نظروں سے دور گاؤں پہونچ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

13

جارج واشنگٹن کمبارگنوی

کٹی کو اپنی بدلی ہوئی ذہنیت کے حسب حال کچہری میں ایک نیا دوست ملا۔ یہ تھا جارج واشنگٹن کمبارگنوی۔ کافی عرصہ تک جارج اپنے لمبے نام کی وجہ سے ایک عجوبہ بنا رہا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور کسی سے بات بھی کرتا تو صرف کام کی۔ کٹی کے لیے اس کا وجود اور عدم برابر تھا لیکن کٹی کا مزاج ہی آج کل کچھ بدل گیا تھا۔ تحصیلدار صاحب کی نصیحت کے بعد وہ گھر پر قانون کی کتابوں اور مقدمات کی فائلوں کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔ کام پر گرفت مضبوط ہو جانے کے سبب اب اسے پرانے دوست اچھے نہیں لگتے تھے۔ احمقوں کی طرح ان کے پاس جا کر چھوٹے چھوٹے معاملات میں مشورہ لینا اسے اپنی خودداری کے منافی معلوم ہوا حالانکہ وہ لوگ دل سے یہ چاہتے تھے کہ کوئی ان سے مشورہ کرے۔ اِن دنوں جب کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو کٹی سیدھا تحصیلدار صاحب کے پاس چلا جاتا۔ اِس سے دوسروں کو شبہ پیدا ہوا اور انھوں نے پہلے کی طرح اس سے کھل کر بات کرنا بند کر دیا۔ ایک دن تحصیلدار صاحب نے کٹی کی کارکردگی کو سراہا۔ جب یہ بات دوسروں کو معلوم ہوئی تو وہ اس سے جلنے لگے۔ کٹی کسی بھی کام کے لیے تحصیلدار صاحب کے پاس جاتا تو یہ لوگ اس پر آوازہ کسے بغیر نہ رہتے۔ ایک بار ایک چھوٹے سے معاملہ میں اسے جارج سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر اس نے جارج سے کچھ اور باتیں بھی کیں اور اسے اپنا دوست بنا لیا۔ جارج دوستوں کا خیر مقدم کرتا تھا لیکن دوستی کرنے میں خود کبھی پہل نہ کرتا تھا۔ جب کوئی دوستی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا تو وہ اُن سے بہت جلد گھل مل جاتا۔ کٹی کی ساتھ بھی کچھ ہی دنوں میں اس کی گاڑھی چھننے لگی۔ ایک موہوم وجود رکھنے والا جارج اب

کٹی کے لیے گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ جارج کی زندگی نیند سے مشابہت رکھتی تھی۔ اُسے خاموشی پسند تھی۔ کچہری میں خاموش رہ کر ہی اس نے اتنا رسوخ پیدا کیا تھا۔ لوگ اس کی غیبت میں اس کی خاموشی اور اس کے نام کا خوب خوب مذاق اڑاتے اور ہنستے۔ لیکن کٹی کی طرح تحصیلدار کی ڈانٹ اس نے ایک بار بھی نہیں کھائی تھی۔ وہ اپنی فائلیں کس وقت پڑھتا ہے، یہ کسی کو معلوم نہ تھا لیکن وہ جس میز پر بھی کام کرتا ہے وہاں کوئی کام باقی نہیں پڑا رہتا تھا۔ کام میں لگے رہنا، کام میں غلطیاں نہ کرنا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے اس کے کام کے بارے میں لوگوں کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کبھی کسی نے اچھا کارکن نہیں کہا تھا اسے دوسروں کی طرح کوشش کرکے کبھی آگے جانے کا موقع نہیں ملا — اسی لیے اس کے کام کی بھی کسی نے کبھی تعریف نہ کی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کام خوش اسلوبی سے کرتا ہے؟ کچہری کے کام کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر یہ تھا "سب اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ میں بھی اپنا کام کرتا ہوں۔"

ابتدا میں کٹی کے اسے پسند کرنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ کٹی کو کوئی دوسرا دوست میسر نہ تھا۔ بلکہ ٹھوکر کھا کر گرے بھی تو روٹی کی دوکان میں، کہاوت کے مصداق کٹی جلد ہی اس نئے شخص کے کردار سے متاثر ہو گیا۔ سب سے پہلی پسندیدہ بات جارج میں کٹی کے لیے یہ تھی کہ وہ جس کو جیسا دیکھتا تھا ویسا ہی تسلیم کر لیتا تھا۔ اس نے کٹی کی وضع قطع، پہناوا، بات کرنے کا ڈھنگ وغیرہ کے متعلق کبھی ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کٹی کے کپڑوں، اس کی چوٹی اور مونچھوں کے علاوہ کوٹ اور ٹوپی تک کا اس کے پرانے دوست مذاق اڑاتے رہتے تھے لیکن جارج کو تو جیسے یہ سب کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اس نے تو کٹی جیسا بھی تھا اسے اپنا لیا تھا۔

وہ اپنے کام میں چوکس تھا اور زندگی سے اُسے ایک خیالی اور رومانی قسم کی بے زاری تھی جسے دور کرنے کے لیے وہ ہر تیسرے دن ایک فلم دیکھا کرتا تھا۔ کٹی اسی بات کو جارج کی زندگی کا ماحصل سمجھتا تھا۔ اپنے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا اس لیے غیر ضروری عاجزی بھی اس میں نہ تھی۔ کٹی کے لیے جارج غیر محسوس طریقہ پر ایک مثالی ہستی بن گیا تھا۔ کٹی اپنی کوشش اور محنت سے نیک نامی حاصل کر رہا تھا، جارج میں بھی غالباً یہ سب گن موجود تھے۔ انہیں دنوں تحصیلدار صاحب نے ایک بار 'اچھا کارکن' کہہ کر کٹی کی تعریف کی لیکن جارج کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی — وہ سوچنے لگا ایسا کیوں ہے — تحصیلدار کی زبان سے اپنی تعریف سن کر تھوڑی دیر کے لیے تو وہ بھی یہ سمجھا تھا کہ اس کا کام جارج کے کام سے اچھا ہے

لیکن پھر بھی اس کو مکمل تسکین حاصل نہ ہوئی۔

جارج کٹی کی زندگی میں سینما لے کر آیا۔ سینما کے بغیر اسے زندگی بے مزہ لگتی تھی۔ دو تین دن میں کم از کم ایک بار سینما دیکھنا اس کے لیے ضروری تھا۔ دو تین سال پہلے تک تفریحی ٹیکس کا محکمہ اس کے پاس تھا۔ اب یہ کام اس سے لے لیا گیا تھا لیکن سینما والوں سے اس کا رسوخ اب بھی تھا وہ جتنے لوگوں کو چاہے مفت میں سینما دکھا سکتا تھا۔

اس کے ساتھ کٹی پہلی بار سینما گیا۔ جاتے وقت وہ گھبرا رہا تھا۔ ایک تو جارج کا اصرار دوسرے مفت میں سینما۔ اسے یہ تسلی تھی کہ وہ اپنا پیسہ پھونک نہیں رہا ہے۔ کٹی کے لیے سینما ایک نیا تجربہ تھا۔ بچپن میں اس نے ایک خاموش فلم دیکھی تھی جو اسے مطلق اچھی نہ لگی تھی۔ اب تک سینما دیکھنے کا اُسے واحد تجربہ وہی تھا۔ کٹی کے ناتجربہ کار ذہن کو ابتدا میں سینما اندھیرے، شور اور گرمی کا مرکب معلوم ہوا۔ فلم کی موسیقی سے اس کے دل پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ جب وہ کوئی حزنیہ گیت سنتا تو اس کا دل دکھ سے بھر جاتا۔ فلم ہندی زبان میں ہوتے تھے اس لیے کٹی ان کو سمجھ نہیں پاتا تھا لیکن جارج جو ہندی جانتا تھا بیچ بیچ میں ان کو بتاتا جاتا تھا۔ وہ ایکٹروں کا تعارف بھی کرا دیتا تھا کہ یہ بلو رہا ہے یہ حسن بانو ہیں وغیرہ۔ جارج کی اس توضیح سے کٹی کی لطف اندوزی میں خلل پڑتا تھا۔ . . . . کسی فلم کے ایک منظر میں کچھ غنڈے ایک خوبصورت دوشیزہ کو پریشان کر رہے تھے۔ غنڈوں کا سردار اس کے بال پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ کچھ غنڈے لڑکی کے منھ کو ایک مشعل سے جلانے کی دھمکی دے رہے تھے۔ کٹی یہ تو سمجھ نہ پایا کہ وہ لوگ کون ہیں لیکن لڑکی بپتا دیکھ کر اس کا دل دہل گیا اور اس لڑکی پر اسے بڑا ترس آیا۔ وہ اس لرزہ خیز منظر سے بچنے کے لیے آنکھیں جھکا لیتا لیکن پھر ذرا ہی دیر میں اسے ادھر دیکھنے کی خواہش ہوتی اور وہ پھر اپنی نظریں پردے پر جما دیتا۔ کٹی کا دل جس وقت رحم سے بھرا ہوا تھا اُسی وقت جارج نے 'بورنگ، بورنگ' کہہ کر سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ انٹرول میں جب دونوں باہر آئے تو جارج نے "بیڈ پکچر" کہہ کر باقی فلم دیکھنے سے انکار کر دیا۔ کٹی کو بڑی کوفت ہوئی اس کا دل پوری فلم دیکھنے کو چاہ رہا تھا لیکن وہ جارج کی دعوت پر فلم دیکھنے آیا تھا اس لیے مجبور ہو کر اس کے ساتھ وہ بھی چلا آیا۔

ایسے واقعات بار بار ہوتے رہتے۔ جارج اکتا کر آدھی فلم دیکھ کر چلا جاتا لیکن کٹی یہ سوچ کر کہ باقی فلم شاید اچھی ہو آخر تک دیکھتا رہتا۔ فلم اچھی نہ ہونے پر بدمزہ ہو کر رات کے دس بجے گھر آتا اور ماں کی ڈانٹ کھاتا۔ ماں کو دو ایک جواب دیتا اور بعد میں جھنجھلا کر سو جاتا

ایسے مواقع اکثر آتے۔ کچھ دنوں میں کٹی کو اچھی اور بری فلموں کی پہچان ہوگئی تھی. لیکن بیچ میں اٹھ کر آنے کی عادت وہ نہ ڈال سکا، ماں گھر پر اکیلی راستہ دیکھتی رہتی ہے اس لیے میں سینما نہ جاؤں گا، اس نے کئی بار عہد کیا لیکن وقت آنے پر اس عہد پر قایم نہ رہ سکا۔ کبھی کبھی دعوت دینے والے جارج پر بھی اُسے غصہ آجاتا لیکن ذرا دیر ٹھنڈے دل سے سوچنے پر اسے خود پر غصہ آجاتا۔ اس طرح اس میں اور جارج میں جو فرق تھا وہ بھی اس پر واضح ہوگیا۔ جارج ایک بااصول شخص تھا۔ جہاں اس کا جی نہ چاہتا وہاں نہ جاتا۔ مضبوط قوت ارادی کے سبب اس کی زندگی میں تفکرات کم تھے۔ خواہشات کو کم کرکے ہی بھرپور طمانیت حاصل ہوسکتی ہے، اس کو یہ شعور ورثہ میں ملا تھا۔ یہی وہ مضبوط بنیادیں تھیں جن پر اس کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی۔ وہ کچہری کے کاموں میں بھی بہت دیکھ بھال کے پیسہ لیتا تھا اور لوگوں کو صاف صاف بات بتا دینے سے بھی ہچکچاتا نہ تھا۔ وہ صاف کہہ دیتا تھا "یہی قاعدہ ہے، میں کیا کر سکتا ہوں" ایک بار ایک شخص اس کے یہ کہہ دینے پر بھی پانچ روپیہ کا نوٹ میز پر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا تو اس نے چپراسی کو پیسے دے کر دوڑایا اور پیسے اسے واپس کرا دیے۔ کوئی اسے کس مقصد سے پیسے دے رہا ہے یہ بات جب تک اچھی طرح معلوم نہ کرلیتا تب تک وہ ایک دمڑی بھی لینے کو تیار نہ ہوتا۔ اُسے پیسے کی زیادہ فکر نہ تھی۔ گھر میں غیر شادی شدہ ایک بہن تھی جو ایک اسکول میں پڑھاتی تھی وہ خود بھی کماتا تھا۔ آئندہ سال چھوٹا بھائی بھی میٹرک پاس کرکے نوکری پر لگنے والا تھا۔ باپ چرچ میں ملازم تھے۔ ماں نہیں تھی گھر میں ہر شخص ذمہ دار تھا۔ یہ قناعت کٹی جیسے متلون مزاج شخص کو میسر نہیں ہوسکتی تھی۔ کتنا ہی پیسہ گھر میں کیوں نہ آجائے کبھی پورا نہیں پڑتا تھا۔ اس کو کبھی یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ اس کو کس نے پیسے دیے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ بے خیالی میں دونوں فریقوں سے پیسہ لے کر جیب میں ڈال لیتا تھا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دیتا کہ باقی لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں لیکن جارج کی مثالوں کو سامنے رکھتا تو اس کا دل بے چین ہوجاتا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ حسین کا آلۂ کار تھا۔ حسین اکثر سنا تا رہتا تھا "کرشنا جی صاحب کو ہم نے ہی تیار کیا ہے"۔ رشوت لینے والے دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو اپنے اختیارات کے بل پر پیسہ لیتے ہیں اور اسے اپنا حق سمجھ کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو لالچ کی وجہ سے جتنا بھی مل جائے اتنا لے کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ پہلے قسم کے لوگوں کا پیسہ ایک طرح سے دینے والوں پر ان کا احسان ہے۔ دوسرے قسم کے لوگ دینے والے سے اپنی

محنت کا گویا معاوضہ لیتے ہیں۔ پہلے والا پیسہ قبول کرکے گویا دینے والے کو ممنون کرتا ہے۔ دوسرا خود دینے والے کا ممنون ہوتا ہے۔ دینے والے کا ہاتھ ہمیشہ اونچا رہتا ہے۔ یہ بات دوسری قسم کے لوگوں پر صادق آتی ہے۔ عطیہ لینے میں ناک میں نسوار لینے کی طرح پہلے والے کا ہاتھ ہی اوپر رہتا ہے کٹی اگر کسی کا کام کر دیتا تھا تو یہ اس کی محنت ہوتی تھی نہ کہ اس کا احسان لیکن جارج اگر کسی کا کام کر دیتا تو وہ شخص ہمیشہ اسے یاد رکھتا اور اس کی خدمت کو تیار رہتا۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال کٹی کے ذہن میں بار بار آتا۔ محکمۂ مال میں ہی نہیں بلکہ گورنمنٹ کے کسی بھی محکمہ میں کام کرنے والا آج نہیں تو کل کام آتا ہی ہے اس لیے ان کو خوش رکھنا سینما والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑی تنظیموں کے لیے بھی ضروری ہوتا ہے۔ ایسے محکموں میں کام کرنے والے سب ہی ملازمین اسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ایک اتوار کو کٹی بہت اداس تھا۔ اپنی اداسی دور کرنے کے لیے وہ سینما چلا گیا۔ اس کی جیب میں پیسے تھے لیکن شاید ٹکٹ لینے کے لیے بکنگ آفس کے سامنے کھڑے ہونے کو اس کا جی نہ چاہا یا شاید اس نے پیسہ خرچ کرنا نہ چاہا ہو۔ غرض وہ ٹکٹ خریدے بغیر سیدھا باکس کے گیٹ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ جارج کو ہمیشہ سلام کرنے والا گیٹ کیپر بھلے ہی اسے سلام نہ کرے لیکن اندر جانے سے نہ روکے گا۔ جب تمام ٹکٹ والے لوگ ہال میں داخل ہو چکے تو کٹی بھی اندر داخل ہونے لگا لیکن گیٹ کیپر نے ڈپٹ کر اس سے پوچھا: "ٹکٹ"، کٹی چکرا یا۔ جارج کا حوالہ دینا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ جیب سے بٹوا نکال کر ٹٹولتا رہا پھر "ارے کہیں گر گیا" کہہ کر بڑبڑاتا ہوا واپس لوٹ آیا۔ گیٹ کیپر کا قہقہہ اس کے کلیجے کے پار ہو گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ دوبارہ کبھی اس سینما کی طرف نہ آئے گا مگر دوسرے ہی دن جارج نے اسے سینما دیکھنے کی دعوت دی اور وہ تیار ہو گیا۔ آج وہی گیٹ کیپر کیا کرے گا وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ گیٹ کیپر نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا جس سے اسے بڑی کوفت ہوئی۔

چائے اور ناشتے کے معاملے میں جارج بڑے اصول کا پابند تھا۔ روزانہ کچہری میں صرف ایک بار شام کو چار بجے وہ چائے پیتا۔ کبھی کبھار بھوک لگنے پر دو بجے کے قریب کچھ کھا لیتا ورنہ نہیں۔ کچہری میں آنے والوں کے ساتھ وہ کبھی ہوٹل نہ جاتا۔ دوسرے لوگ جارج کی اس عادت کو 'ایک اچھا اصول' کہہ کر رہ جاتے تھے۔ جارج کے لیے یہ کوئی خاص اصول نہ تھا لیکن ہر آدمی کے ساتھ مل بیٹھنے کو اس کا دل نہ چاہتا تھا۔

جارج سے اپنی دوستی کے ابتدائی زمانے میں کٹی نے ایک بار اس سے اپنے ساتھ چائے

پینے کے لیے اصرار کیا۔ جارج آدھا گھنٹہ پہلے چائے پی چکا تھا اس لیے اس نے معذرت چاہی لیکن کٹی نے اس سے کہا کہ بس میرے ساتھ چلو چاہے نہ پینا اور اسے زبردستی کینٹین لے گیا۔ وہاں جاکر جارج کے منع کرنے کے باوجود دو اسپیشل چائے کا آرڈر دے دیا۔ اُسے یقین تھا کہ ویٹر چائے لاکر رکھے گا تو جارج مان جائے گا۔ چائے آگئی لیکن جارج نہ مانا۔ اسپیشل چائے ہونے کی وجہ سے کٹی اُسے واپس بھی کرنا نہیں چاہتا تھا اور چائے پیے بغیر پیسے دینے کو بھی اس کا دل نہ تھا آخر کٹی نے خود دونوں پیالی چائے پی۔

جارج کی ضد پر اکثر اسے غصہ بھی آجاتا لیکن ساتھ ہی یہ بھی سوچتا کہ اگر وہ خود بھی ضدی بنا رہتا تو آگے نہ بڑھ پاتا۔ چٹورپن کی عادت کی وجہ سے گھر کا کھانا اچھا نہ لگتا تھا۔ روز انہ کچہری میں تین چار بار ناشتہ کا دور چلتا تھا اور ہر بار وہ خوب طبیعت سے کھاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی دن جارج اسے اپنے اصول کے متعلق بتائے تو وہ اس سے اپنا اختلاف ظاہر کرے۔ یا تو جارج اس معاملہ کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا یا پھر اس کا خیال تھا کہ کھانے پینے کے معاملہ میں ہر شخص کا اپنا اپنا الگ اصول ہوتا ہے غالباً اسی وجہ سے اس نے اس موضوع پر کبھی کوئی گفتگو نہ کی۔ آخر تنگ آکر ایک دن کٹی نے خود ہی یہ سوال اُٹھایا۔ اس پر جارج نے صرف اتنا کہا: "ہاضمہ خراب ہوجاتا ہے"۔ کٹی کو جارج کی دفتر میں کم خوری کا سبب یہی نظر آیا کہ وہ شاید گھر سے خوب عمدہ کھانا کھا کر آتا ہے۔ اس لیے ہوٹل کی چیزیں اسے اچھی نہیں لگتی ہیں۔ کٹی کو اتوار کا دن بہت برا لگتا تھا۔ اس دن کچہری کا کینٹین بھی بند رہتا تھا اور اوپری آمدنی بھی بند رہتی تھی۔ مفت کی ضیافتیں بھی اتوار کو نہیں ہوتی تھیں۔ ایک اتوار کو کٹی اپنے گھر کے پاس کے ایک مشہور ہوٹل میں گیا۔ اس دن ویٹر نے اسپیشل چائے لاکر دی تو کٹی صاحب نے کہا "ایک ٹکڑا چکلی[1] کا بھی لاؤ"۔ کٹی صاحب ہو تو ان کو کیا۔ اس نے زور سے پوچھا "ایک پلیٹ چکلی لاؤں۔" کٹی بولا "نہیں — چائے کے لیے ایک ٹکڑا لاؤ" لڑکا سیدھا ہوٹل کے مالک کے پاس پہونچا اور زور سے کہا "ان صاحب کو چائے کے ساتھ تھوڑی چکلی چاہیے"۔ ہوٹل میں موجود سبھی لوگوں نے کٹی کی طرف دیکھا۔ مالک نے مسکراتے ہوئے کہا "دے دو" کٹی کے سامنے چکلی کا ٹکڑا آگیا لیکن اسے کھا کر اس کا منھ بدمزہ ہوگیا۔

---

[1] ایک قسم کا نمکین پکوان۔

"اگر سکھ چاہیے تو شرم چھوڑ دو"۔۔۔ مگر ہر معاملے میں اس اصول پر عمل کرنا اتنا آسان نہیں۔

جارج کے دوست یونہی کم تھے۔ ان میں بھی کٹی سے ہی اسے خصوصیت تھی۔ جوں جوں ان کی دوستی بڑھتی گئی جارج کے دل میں کٹی کو اپنی محبوبہ سے ملانے کی شدید خواہش پیدا ہونے لگی۔ شادی کرنے کے فیصلے کے متعلق تو اس نے کچھ نہیں بتایا لیکن یہ خواہش اس کے دل میں شدید ہوتی گئی۔ جارج کی زندگی میں اس کی محبوبہ ایک بڑی کامیابی کی حیثیت رکھتی تھی۔ سارا ایک پادری کی بیٹی تھی۔ اس شہر کے پروٹیسٹنٹ گھرانوں میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ چھٹے اسٹینڈرڈ میں پڑھتی تھی اور اگلے سال میٹرک پاس کر کے نوکری پر لگنے والی تھی۔ اس لیے اس کی دوگنی اہمیت تھی۔ اس کے باپ کے پاس اس کی شادی کے لیے بہت سے پیغام آئے تھے۔ ان میں منگلور کی طرف کے ایک نوجوان پادری کا پیغام تھا مگر جارج دھارُاڑ ہی میں پیدا ہوا تھا اور وہیں پروان چڑھا تھا اس لیے سارا کا باپ اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک دن انھوں نے جارج کو بلا کر شادی کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کیے۔ اس غیر متوقع نعمت کو پا کر جارج کے خاندان والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ منگلور کے پادری کا پیغام نامنظور کر کے جارج کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی پیش کش واقعی ایک قابل فخر بات تھی۔ سارا نے بھی اس شادی کے لیے خوشی سے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس طرح انہیں ڈیڑھ سال کی کورٹ شپ کا بھی موقع مل گیا۔ جارج کو سارا کے حسن پر بڑا ناز تھا۔ جارج کے دوست کم تھے اور کٹی اس کا گہرا دوست تھا اس لیے وہ کٹی کو یہ بات بتانے کے لیے بڑا بے چین تھا۔ ایک دن وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور کٹی سے کہہ ہی بیٹھا "میری شادی اگلے سال ہو جائے گی۔ پادری کی لڑکی کے ساتھ رشتہ طے ہو چکا ہے۔ لڑکی بے حد حسین ہے۔ کسی دن پادری کے گھر چلیں گے اور تمہیں وہاں اپنی منگیتر سے ملاؤں گا۔" کٹی کو بھی اس حسینہ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ لیکن پادری سے جان پہچان نہ ہونے کی صورت وہ اس کے گھر جانے سے ہچکچاتا تھا۔ اس کے علاوہ اگرچہ اس نے بہت سی باتوں میں چھوت چھات ترک کر دی تھی پھر بھی کسی عیسائی کے گھر کچھ کھانے میں اسے بڑا ڈر لگتا تھا۔ جارج کے گھر بھی وہ صرف چائے پی لیا کرتا تھا وہ بھی بہت اصرار کے بعد۔ اس لیے وہ بہانہ کر کے ٹالتا رہا۔ لیکن جارج نے اسے اپنی محبوبہ سے ملانے کا ایک اور راستہ اختیار کیا۔ ایک دن کٹی اور جارج سینما گئے، وہاں عورتوں کی سیٹ پر

بیٹھی ہوئی سارا ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھا تو اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔ جارج نے اس سے پوچھا "بہت دیر انتظار کرنا پڑا؟" "نہیں تو" اس نے جواب دیا۔ جارج نے کٹی سے اس کا تعارف کرادیا۔ "یہ کرشنا جی کلکرنی میرے دفتر کے ساتھی ہیں ـــ یہ سارا ڈی سوزا میری منگیتر ہے۔" کٹی کو بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ جھینپ کی وجہ سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اس مختصر تعارف کے بعد وہ تینوں چائے کی دکان میں چلے گئے اور وہاں چائے بسکٹ کھائے۔ سارا کو جارج اپنے اس دوست کے متعلق پہلے ہی بہت کچھ بتا چکا تھا۔ سارا کو اپنے قریب پا کر جارج کی بھی اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا باتیں کرے۔ سارا کی توجہ اس وقت جارج کے اس شرمیلے دوست پر مرکوز تھی۔ یہ دیکھ کر جارج کو فوراً ایک ترکیب سوجھی۔ ابھی جارج کو سارا کے بارے میں کچھ باتیں بتانا باقی تھیں۔ اس نے سوچا چلو بات کرنے کے لیے ایک موضوع تو ہاتھ آیا۔ چنانچہ اس نے سارا کے باپ کے بارے میں، اسکول میں سارا کی ذہانت کے بارے میں، امور خانہ داری میں اس کی مہارت کے بارے میں اور کڑھائی بنائی سے اس کے غیر معمولی رجحان کے بارے میں کٹی کو تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ سارا کو اس نے منگنی کو جو انگوٹھی دی تھی وہ کٹی کو دکھا کر بتایا کہ کس طرح اس نے انگوٹھی کے نگینہ کو حاصل کیا اور کس طرح اسکا ڈیزائن خود بنایا وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران سارا خاموشی سے کٹی کی پلیٹ میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دو دو ایک ایک بسکٹ رکھتی رہی۔ سارا کا دل رکھنے کو کٹی نے ایک آدھ بسکٹ اٹھا کر کھا بھی لیا۔ بہرحال، کٹی کو سارا اتنی خوبصورت نہیں لگی جتنی جارج نے اس کی تعریف کی تھی۔ یہ صحیح تھا کہ شباب اور اچھی صحت کی وجہ سے اس کے چہرہ پر ایک شگفتگی اور تازگی تھی اور قد لمبا ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر ایک قسم کی معصومیت بھی تھی۔ وہ زرد فراک پہنے تھی، سر پر سرخ ربن بندھا تھا اور بالوں میں آڑے ترچھے کئی پن بھی لگے تھے۔ دوران گفتگو وہ ہوں ہاں کرتی رہی، کبھی کبھی جارج کے کسی سوال کا جواب دیا ورنہ مسکراتی ہوئی زیادہ تر خاموش بیٹھی رہی۔ سینما دیکھنے کے لیے بھی وہ تیار نہ ہوتی کیونکہ اس کے باپ کو دھارواڑ سے باہر کہیں امتحان لینے جانا تھا اور سارا کو اپنے باپ کے لیے ناشتہ تیار کرنا تھا۔ گھر کا سارا انتظام اسی کے سپرد تھا کیوں کہ ماں کو مرے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے۔ شادی کے بعد جارج بھی اپنی سسرال میں منتقل ہونے والا تھا۔

جارج سارا کو اتنی جلد گھر بھیجنا نہ چاہتا تھا اس لیے وہ اُسے شاپنگ کے لیے بازار لے گیا۔

کٹی عجب گو مگو میں تھا۔ اس وقت ان کو چھوڑ کر چل دینا بھی مناسب نہ تھا اور ان کے ساتھ جانے میں اسے حجاب لگتا تھا۔ بہر حال کٹی ان کے اور اپنے درمیان ایک گز کا فاصلہ قایم کر کے ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جارج اور سارا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا باتیں کریں۔ کٹی کو گفتگو میں شریک کرنا تقریباً ناممکن تھا اس لیے وہ تینوں کسی خاموش فلم کے اداکاروں کی طرح چپ چاپ چلتے رہے۔

جارج نے بازار سے سارا کے لیے ربن، رومال، لیس اور کنگھی وغیرہ جیسی چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں اور انہیں گتے کے ایک ڈبہ میں ڈال کر اوپر سے ربن باندھ کر سارا کو گھر تک پہونچانے کے لیے چل پڑا۔ کٹی نے بھی یہ سوچ کر کہ اب ان کے ساتھ جانا مناسب نہیں، بازار سے سبزی خریدنے کا بہانہ کیا اور ان سے علیحدہ ہو گیا۔ اس رات اس نے کئی خواب دیکھے۔ رتنا کو اپنے ساتھ سارے شہر میں گھمایا، سینما گیا، پھول پہنائے، دوکان میں چوڑیاں پہنوائیں اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اس نے خوابوں میں دیکھیں ـــ سارا کی خوبصورتی پر لٹو جارج اگر رتنا کو دیکھ لے تو پتہ نہیں کیا کہے؟! ایسے احمقانہ خیالات بھی اس کے دل میں آئے ـــ نیند آتے آتے بارہ بج گئے۔ "حسن" لفظ کا استعمال جارج جن معنوں میں کرتا تھا انھیں سمجھنے کے لیے کٹی کو ابھی کافی وقت درکار تھا۔

14

کٹی کا التماس

راگھپا کا گھر کٹی کی کچہری کے قریب ہی تھا۔ راگھپا نے کٹی کو گھر پر آکر چائے ناشتہ کرنے کی کھلی دعوت دے رکھی تھی لیکن ابھی تک اس کی نوبت نہ آئی تھی۔ اس لیے دیوالی کے آتے ہی نرک چتردشی کے دن اس نے کٹی کو ناشتے کے لیے بہت اصرار سے مدعو کیا۔ اس دن کٹی کے علاوہ کسی اور مہمان کو مدعو نہیں کیا گیا تھا لیکن پڑوس کی بارہ تیرہ لڑکیوں کا ایک دل رتنا کے منگیتر کو دیکھنے کے لیے آموجود ہوا تھا۔ عورتوں کی اکثریت کے اس راج میں کٹی کو چند بہت دلچسپ تجربے ہوئے۔ وہ لڑکیاں اس سے اس طرح پیش آئیں جیسے رتنا سے اس کی شادی واقعی طے ہو گئی ہو۔ ان میں ایک لڑکی بڑی تیز طرار بالکل مردانی سی تھی۔ کٹی کو اس کے ہاتھوں بہت تنگ ہونا پڑا۔

جب وہ بیٹھک میں تھا تب ہی وہ لڑکیوں کی فوج لے کر بیٹھک کے دروازے پر جم کر کھڑی ہوگئی تھی اور کٹی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے لگی، ساتھ ہی کٹی کی طرف اشارہ کر کے وہ لڑکیوں سے کچھ کہتی جاتی اور ان کے چٹکیاں کاٹنے لگی۔ ذرا دیر میں چنچل گوداوری نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ وہ رتنا کو اپنی مضبوط باہوں میں پکڑ کر بیٹھک کی دہلیز پر لے آئی اور بولی "اس نے آپ کو ٹھیک سے دیکھا نہیں ہے۔ اس لیے آپ ناراض نہ ہوں۔ اسی وجہ سے میں اسے یہاں کھینچ لائی ہوں" اس کھینچا تانی اور ہنسی مذاق سے رتنا کے گال سرخ ہو گئے۔ آنکھیں بھیگ گئیں اور آنسوؤں کی ایک بوند اس کی پلکوں پر آکر لرزنے لگی۔ اس نے ایک شوخ نظر کٹی پر ڈالی اور پھر "چھوڑو چھوڑو" کہتی ہوئی ایک زوردار جھٹکے سے اپنی باہیں چھڑا کر بھاگ گئی۔ سولہ سال کی ہو جانے پر بھی اس شوخ گوداوری کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی لیکن اسے گویا اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔ وہ ابھی بچپن کی شرارتوں کی منزل سے آگے نہیں بڑھی تھی بلکہ دوسروں کی شادی بیاہ کے موقعہ پر اس کی شوخی کچھ اور بھی بڑھ جاتی تھی۔

ساڑھے آٹھ بج جانے پر بھی خاص طور پر کٹی کے لیے کی جانے والی آرتی کی تیاریاں ابھی مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ راگھوا کے آتے ہی آرتی کی رسم شروع ہوگئی۔ "تو ادھر آ۔ تیرے ہی ہاتھوں سے آرتی اترواؤں گی" کہہ کر گوداوری شرما کر بھاگنے والی رتنا کو پکڑنے کے لیے دوڑی رتنا نے منع کیا۔ گوداوری نے اس کے خوب چٹکیاں کاٹیں۔ ماں نے بھی اس کی طرفداری نہیں کی اور کمرے کے اندر سے اُسے ڈانٹا "جانا، سہیلیاں بلا رہی ہیں۔ تو تو گھر کی لڑکی ہے" لاچار ہو کر رتنا آرتی لے کر آئی۔ گوداوری اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ آرتی کا گیت گانے کا مسئلہ اٹھا تو گوداوری نے لڑکیوں کی فوج کو حکم دیا "خبردار جو تم میں سے کسی نے گیت گایا۔ رتنا ہی گائے گی"۔ اس کا یہ حکم سن کر لڑکیاں بالکل خاموش ہوگئیں۔ رتنا اس خاموشی کا مطلب سمجھ گئی۔ مجبور ہو کر اسے گیت گانا پڑا۔ محبوب جان سے سیکھا ہوا ایک گیت اس نے گایا "کرشنا نینو بیگنے بارو" ــــ محبوب جان کے سکھائے ہوئے اصول موسیقی کے مطابق کرشنا لفظ کی پوری ادائیگی صرف 'پلوی' میں ہی ہوتی ہے۔ رشیش 'میں' "نا" رہ جاتا ہے۔ جیسے ہی "پلوی" کے بول کٹی کے کانوں میں پڑے اس نے یہ سمجھ کر گیت کا مخاطب میں ہی ہوں اپنا سر جھکا لیا۔ سہیلیاں اس کی اس حرکت کو لے اڑیں اور خوب قہقہے لگائے۔ رتنا کو اس کا احساس نہ ہو پایا اور وہ گاتی رہی لیکن دوسرا "پد" اٹھاتے وقت یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ گھبرا گئی۔ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا وہ

کانپتی ہوئی آگے بڑھی لیکن "پلّو ی" کے بول بھی پورے نہ گا سکی۔ ہنستے ہوئے اس نے اپنا منھ پھیر لیا۔ تمام لڑکیاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ کٹّی نے بھی جھینپ کر بیٹھک کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اُدھر ایک مسکراتا، خوشی کے آنسوؤں سے دمکتا چہرہ اسے نظر آیا۔ یہ چہرہ چمپکا کا تھا۔

ناشتہ کے لیے بیٹھنے پر گوداوری نے مرچیں بھری ہوئی گجھیاں دوسری گجھیوں کے ساتھ ملا کر کٹّی کے سامنے پیش کیں۔ ہنسی کے موقعے بہم پہونچانے میں بخل سے کام نہ لینے والے کٹّی نے لڑکیوں کو ہنسنے کا ایک اور موقع دیا۔ مرچوں کی گجھیاں کھا کر اس نے دل میں سوچا 'باپ رے۔ کیوں میں ان لڑکیوں کے درمیان آپھنسا' ناشتہ کے بعد راگھپا نے پان کھایا اور کٹّی سے یہ کہہ کر کہ کھانا یہیں کھا کر جانا وہ کسی کام سے باہر چلا گیا۔ بوکھلاہٹ کے مارے کٹّی انکار نہ کر سکا اور خاموش رہا۔ پھر اس کو یہ آس بھی تھی کہ یہاں ٹھہرنے سے شاید رتنا کا دیدار ایک بار اور ہو جائے۔ اتنے میں رتنا شرماتی لجاتی آئی اور پان کے دو بیڑے اس کے سامنے رکھ کر چلی گئی کٹّی نے بڑا والا بیڑا اٹھا کر منھ میں رکھ لیا۔ اس میں پسی ہوئی مرچیں بھری تھیں۔ لڑکیوں نے پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ اب راگھپا کے انتظار میں کٹّی کو اکیلا ہی بیٹھنا پڑا۔ بیٹھک میں کوئی اخبار بھی نہیں تھا۔ آدھے گھنٹہ کی تنہائی نے ہی اس کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا کر دیا۔ اس کی آنتیں کلبلانے لگیں گھر اور ماں کی یاد آنے لگی۔

اس دن صبح گنگوا نے اسے پانچ بجے ہی اٹھا دیا تھا۔ پندرہ سال سے سینت کر رکھی گئی عطر کی شیشی کو کھول کر گنگوا نے دو بوند عطر کٹوری بھر تیل میں ڈالا۔ اُس دیوالی کو وہ کٹّی کی آرتی اپنے گھر ہی میں اتروانے کی بڑی خواہش تھی۔ سوامی رائے کے انتقال کے بعد گھر میں سوگ ہونے کی وجہ سے کٹّی کو دیوالی کی آرتی کے لیے دیسائی جی کے گھر بھیج دیا گیا تھا وہی روایت اب تک چلی آرہی تھی۔ اس بار بھی حسب معمول دیسائی جی کے وہاں سے کٹّی کا بلاوا آیا تھا۔ اور ان کے بلاوے کا بھرم بھی رکھنا تھا تا کہ اُنھیں یہ کہنے موقع نہ ملے کہ دیکھو نوکری ملتے ہی دماغ خراب ہو گیا۔ اُن کے گھر آرتی کے لیے جانا ہی ہوگا لیکن گنگوا کی یہ خواہش تھی کہ دیسائی جی کے یہاں جانے سے پہلے خاموشی سے گھر پر بھی کٹّی کی آرتی ہو جائے۔ اسی خیال سے اپنی پڑوسن کاشی کی ماں، اس کے چھ سال کے بیٹے اور اس کے شوہر کو گنگوا نے ساڑھے پانچ بجے ہی ناشتے کے لیے بلا لیا تھا۔ وہ آئے انھوں نے گیت بھی گائے نیل اور کم کم لگایا اور کٹّی کی آرتی کی۔ اُس دن گنگوا نے غریب کاشی کی ماں کو دینے کے لیے کٹّی کے ہاتھ سے آرتی کی تھالی میں ایک روپیہ ڈلوایا۔

پندرہ سال کے بعد گھر میں یہ پہلی آرتی ہوئی تھی۔ گنگوا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کو دیکھ کر سب کے دل بھر آئے۔ ناشتے کے وقت کاشی کی ماں نے اُسے بہت دلاسا دیا لیکن گنگوا اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ باورچی خانے کی چوکھٹ پکڑ کر زور سے رو پڑی۔ اسے دیکھ کر غم نصیب کاشی کی ماں بھی رونے لگی۔ کاشی کی ماں کا نیم پاگل خاوند" رو مت، ماں رومت ماں" کہہ کر تسلی دینے لگا۔ کٹی کا دل بھی یہ منظر دیکھ کر بھر آیا لیکن وہ اپنے آنسو پی گیا۔

اس کے بعد ہمیشہ کی طرح دیسائی جی کے گھر پر کٹی کی آرتی ہوئی۔ دیسائی جی کے گھر پہونچ کر اس کی اداسی بھی تقریباً ختم ہو گئی۔ شام کو راگھیا کے وہاں دھما چوکڑی میں حزن و ملال کے باقی ماندہ اثرات بھی ختم ہو گئے۔ اب جو اسے آدھا گھنٹہ تنہا بیٹھنا پڑا تو صبح کی تمام باتیں ایک ایک کر کے اُسے یاد آئیں اور اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ گھر میں بھی تیوہار ہے۔ ماں راستہ دیکھتی ہوگی کھانا بنا کر بیٹھی ہوگی ــــ یہ سوچ کر کٹی کی بے قراری ناقابل برداشت ہو گئی اس نے سوچا کہ وہ چمپکا سے یہ کہہ دے گا کہ گھر میں تہوار ہے اس لیے وہ کھانا نہیں کھا سکے گا ــــ وہ تیزی سے چمپکا کے کمرے میں گیا ــ چمپکا کمرے میں نہیں تھی۔ رتنا اکیلی دیوار کے سہارے رکھے ہوئے ایک بڑے آئینہ میں اپنے ہلکے بھورے رنگ کے بالوں کے لچھوں کو اپنی انگلیوں میں لپیٹ کر ادھر ادھر گھما رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج پہلی بار اسے اپنے حسن کا احساس ہوا ہو اور وہ حسن کے اس احساس سے سرشار دنیا و ما فیہا سے بے خبر آئینہ میں اپنا جلوہ دیکھنے میں محو تھی۔ اس کے ہلکے بھورے رنگ کے بال بڑے خوبصورت تھے۔ وہ آئینہ میں مختلف زاویوں سے اپنے حسن کو دیکھ رہی تھی۔ رتنا کو ان اداؤں کو زیادہ دیر تک دیکھتے رہنے کی ہمت کٹی میں نہ تھی وہ آہستہ سے کھانسا۔ رتنا نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہڑبڑا کر اپنے بالوں کو لپیٹ کر جلدی سے آئینہ کے سامنے سے ہٹ گئی۔ کٹی نے شرماتے ہوئے کہا،

"میں کھانا اپنے گھر پر کھاؤں گا۔"

کتنی ہی شرمیلی لڑکی کیوں نہ ہو وہ اپنے مہمان سے کھانے کے لیے اصرار کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ رتنا نے بھی یہی کیا "کھانا کھا کر ہی جائیے گا۔"

"بڑے رعب سے کہہ رہی ہو" کٹی نے طنز کیا۔ لیکن یہ بھولی بھالی پندرہ سالہ دوشیزہ اس کے طنز کو سمجھ نہ سکی اور بولی "ہمیں اپنے گھر میں کسی سے کھانا کھانے کو کہنے کا اختیار نہیں ہے کیا؟"

کٹی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کرنے کے لیے کہا "تمھاری شادی مجھ سے ہونے والی ہے تمہیں معلوم ہے؟"

"یہ سب باتیں وہ لوگ جانیں" وہ بھولپن سے بولی۔

"پان کے بیڑے میں مرچ کھلانے والی کے ساتھ شادی کیسے ہوگی؟"

"میں نے نہیں ڈالی، گوذادری نے ڈالی ہوگی! مجھے پتہ نہیں تھا۔"

"کسی نے بھی ڈالی ہوں میرا منھ تو جل ہی گیا" یہ کہہ کر کٹی للچائی نظروں سے اس کے سرخ سرخ ہونٹوں کو دیکھنے لگا۔

"اسی لیے تو کھانا کھا کر جانے کو کہہ رہی ہوں، کری کدڑ بولو[1] بنایا ہے۔"

"تمہارے پتا جی تو شادی کے لیے تیار ہیں لیکن اگر تم نے "نا" کردی تو؟"

اس کی پہلی والی بات کا طنز اب رتنا کی سمجھ میں آیا۔ کچھ سوچ کر بولی۔

"میری بات چھوڑیے۔ آپ کی ماتا جی کیا کہتی ہیں پہلے ان سے تو پوچھ لیجیے۔ آپ کے لیے تو وہی سب کچھ ہیں۔"

ماں کی بات یہاں اٹھنے کی کٹی کو مطلق توقع نہ تھی۔ اس کا منھ اتر گیا۔ اپنی شاعرانہ باتوں کو سادگی سے نثر بنا دینے والی اس فنکار لڑکی کی باتوں کی تہہ تک وہ نہ پہونچ سکا۔ خوش قسمتی سے اُسی وقت ہچکیاں لیتی چمپکا وہاں آپہونچی اور یہ گفتگو وہیں پر ختم ہوگئی۔ کٹی چمپکا کو دیکھ کر اس سے بولا "آج تہوار ہے۔ میں کھانا اپنے گھر پر ہی کھاؤں گا"

"کیوں؟ یہ گھر نہیں ہے کیا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں گھر پر ماں انتظار کر رہی ہوگی — پھر آؤں گا۔"

"نہیں۔ کھانا تیار ہے۔ ان کے آتے ہی لگ جائے گا۔"

اتنے میں راگھپا بھی آگیا۔ چمپکا نے اسے بتایا کہ کٹی کھانا کھائے بغیر جانے کو کہہ رہا ہے۔ راگھپا نے کٹی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور جلدی جلدی بولنے لگا "چھی چھی۔ کٹا! نہ میں پرایا ہوں اور نہ تمہاری ماں۔ تمہاری ماں اور مجھ میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں گھر تمہارے ہی ہیں کبھی کبھار تو آئے ہو۔ کھانا کھا کر ہی جانا ہوگا۔ کتنی بار چائے پر بلایا مگر تم نہ آئے۔ پھر کب آؤگے

---

[1] چاول کے آٹے اور تلوں سے بنایا ہوا ایک میٹھا پکوان۔

کیا بھروسہ ؟ چلو بیٹھو۔"

کٹی مجبور ہو کر کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران راگھپا لطیفے سناتا رہا لیکن کٹی کو بالکل مزا نہ آیا۔ کھانا ختم ہوتے ہی وہ جلدی سے گھر چل دیا۔

کٹی کے جاتے ہی راگھپا بیوی کی طرف مڑا اور فاتحانہ انداز سے مسکراتا ہوا بولا "آج میرا وار پھر پورا پڑا ہے۔ آج گنگوا کو معلوم ہوگا"۔ چمپکا خاموش رہی۔ اس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔

کٹی کے گھر پہونچتے پہونچتے دوپہر کا ایک بج گیا۔ گنگوا بھی 'کڈبو' تیار کر کے اس کا انتظار کرتے کرتے، اور کئی بار گھر کے آس پاس اس کی تلاش میں چکر کاٹ کر آخر تھک کر بیٹھ گئی تھی۔ کٹی کے آتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور بولی "اتنی دیر کٹنا — کھانا ٹھنڈا ہو کر سوکھی لکڑی کی طرح سخت ہو گیا ہے۔"

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں ایک دوست نے پکڑ لیا تھا۔ زبردستی کھانا کھلا کر بھیجا، تم کھا لو ماں۔"

گنگوا بڑے دکھ سے بولی "ارے! اتنا سب بنا کر رکھا تھا کہ کٹنا آتا ہوگا — اب آیا — اب آیا۔ اسی انتظار میں اب تک بیٹھی ہوں — اور تو کھانا کھا کر آیا ہے۔ کیوں؟ کس نے کھانے کے لیے بلایا تھا۔ کیا اسے نہیں معلوم کہ دوسروں کے گھر بھی تہوار ہے؟ بڑے اچھے ہیں تمہارے دوست!" پھر کچھ سوچ کر بولی "کٹی سچ سچ بتا کہاں گیا تھا؟ — راگھو کے گھر گیا تھا نا؟"

اب تک ماں کے لیے جو ہمدردی اس کے دل میں تھی وہ اس آخری جملے سے ختم ہو گئی۔ وہ رکھائی سے بولا "ہاں"

"اچھا۔ یوں ہی سہی — عورت کو تو بھگوان نے پیدا ہی رونے کے لیے کیا ہے۔ یہ بھی بھگتوں گی۔" یہ کہہ کر اندر گئی۔ خاموشی سے تھوڑے سے چاول نکالے — شدید صدمے سے اس کے سر میں چکر سا آرہا تھا۔ پانی کے سہارے دو چار نوالے مشکل سے نگلے ہوں گے کہ متلی آئی اور قے ہو گئی۔ جو تھوڑا بہت کھایا تھا وہ سب نکل گیا۔ سارا منہ کڑوا ہو گیا۔

ماں کی احمقانہ باتوں سے پریشان کٹی ماں کو کھانے کے درمیان سے اٹھتا دیکھ کر مضطرب ہو گیا۔ اب تک تو وہ چپ سادھے پڑا تھا مگر اب وہ اندر آیا اور بڑے اصرار سے بولا "ماں تم ایک ہی بار کھاتی ہو، پھر سے کھا لو نا۔ رات کو کھاؤ گی نہیں"،[1] کٹی کے منھ سے ایسی

---

[1] جنوبی ہند میں بیوہ عورتیں ایک ہی وقت کھانا کھاتی ہیں۔

باتیں اس نے گزشتہ دو سال میں پہلی بار سنی تھیں۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھیا۔ ہمیں تو ایک بار ہی کھانا ہے۔ بھوک لگی تو رات میں ایک مٹھی چوڑے کھا لوں گی" یہ کہہ کر اس نے جھوٹے برتن سمیٹے اور ان کو مانجھنے بیٹھ گئی۔
راکھ کی گرمی میں رکھا ہوا کڑ لوسے بھرا پیتل کا پیالہ اس کا منھ چڑا رہا تھا۔

15

دیسائی جی کی کوشش

گنگوا نے اس مرتبہ دیسائی جی کو ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپ دی۔ اس دن جو کچھ ہوا تھا شروع سے آخر تک دیسائی جی کو تفصیل سے بتایا۔ تیوہار کے دن کٹی کو گھر پر کھانا کھانے نہ دے کر راگھپا نے گنگوا کو روحانی اذیت پہونچائی تھی ـــــ بہر حال جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ اس واقعہ سے اُسے بروقت آگاہی مل گئی۔ اس نے سوچا کہ بات ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے ہی اسے کٹی کے لیے دوسری لڑکی تلاش کر لینی چاہیے۔
"میں سوچ رہی تھی کہ ابھی اسے نوکر ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ ذرا مستقل ہو جائے تو شادی کریں لیکن گوپنا! اب جو واقعات پیش آرہے ہیں ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راگھپا کا منصوبہ کامیاب ہو جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کٹی کو کچھ کھلا پلا دے۔ بھیا! سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے۔ میں سوچتی تھی کہ کٹی میرا اپنا لڑکا ہے...... خیر! چھوڑو اب جیسے بھی ہو اس کے لیے ایک لڑکی ضرور ڈھونڈھ دو۔ بس جلدی سے بات پکی ہو جائے! شادی حالات بہتر ہونے پر ہو جائے گی۔"
دیسائی جی کے پاس کٹی کے لیے بہت سے رشتے آئے تھے لیکن چونکہ گنگوا نے ابھی تک کٹی کی شادی کی بات ان کے سامنے نہیں اٹھائی تھی اس لیے وہ اب تک خاموش رہے تھے۔ ان رشتوں میں انہیں اپنے ایک غریب دوست دندور شوپا کی پندرہ سالہ لڑکی انھیں پسند آئی تھی اس کا رنگ تو البتہ ذرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ اور صحت بہت اچھی تھی۔ لڑکی گھر کے کام کاج میں بہت ہوشیار تھی۔ گنگوا کو آرام پہونچانے والی لڑکی تھی۔ دیسائی جی نے اسے

دیکھتے ہی سوچا تھا کہ اگر ہو سکے تو یہ رشتہ طے کرا ہی دینا چاہیے۔ اس سے ان کے غریب دوست کا بھی بھلا ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے گنگوا کو ذرا تفصیل سے شوپّا کی لڑکی کے بارے میں بتایا۔ لڑکی کی تعریف سن کر گنگوا کی تو جیسے رال ٹپکنے لگی۔ شوپّا کٹر برہمن تھا۔ غریب ہونے پر بھی خود دار تھا۔ ساتھ ہی وہ وسیع القلب بھی تھا۔ گنگوا کو یہ سب باتیں معلوم ہو کر بڑی خوشی ہوئی۔ دیسائی کے پاس رکھی ہوئی جنم پتری دیکھی تو وہ بھی ٹھیک تھی۔ چنانچہ گنگوا نے کھڑے کھڑے شوپّا کو خط لکھوا یا کہ وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ لڑکی دکھانے کے لیے فوراً وہاں پہونچ جائے۔ اتوار کے دن گنگوا نے صبح سے ہی دیسائی جی کے گھر کے چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ کٹّی کی سمجھ میں کچھ بھید نہ آیا۔ پھر دس بجے کے قریب دیسائی جی کے یہاں سے کٹّی کا بلاوا آیا۔ دیسائی جی کے گھر سے بلاوا آنے پر ہمیشہ جھپٹ کر کٹّی کے پاس آنے والی ماں آج پتہ نہیں باورچی خانہ میں کیا کر رہی تھی۔ ادھر کافی عرصہ سے کٹّی نے دیسائی جی کے ہاں آنا جانا تقریباً بند سا کر رکھا تھا۔ ان کے گھر وہ صرف بلائے جانے پر ہی جاتا تھا۔ دیوالی کے دن بھی ہر سال کی طرح وہ آرتی کے لیے ان کے گھر گیا تو تھا لیکن دیسائی جی نے اس سے کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ وسنت راؤ کی بات نہ چھڑ جائے، اس ڈر سے دیسائی جی ان دنوں دوسروں سے بہت کم بات کرتے تھے۔ اس وقت انھوں نے اُسے کیوں بلایا ہے۔ یہ سوچتا ہوا جلدی سے چپل پہن کر کٹّی ننگے سر ہی انکے گھر کی طرف چل دیا۔ اتنے میں گنگوا باورچی خانے سے دوڑتی ہوئی آئی اور بولی "کیوں کٹّی، دیسائی جی سے ملنے کے لیے ٹوپی پہن کر کیوں نہیں جاتے؟"

شوپّا کا پوجا پاٹھ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ بیٹھک میں دیسائی جی نے تنہا بڑے تپاک اور احترام سے کٹّی کا استقبال کیا۔ اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آئے۔ "دندور شوپّا نام کا میرا ایک پرانا دوست ہے اچھے گھرانے کا ہے۔ لڑکی بھی اچھی ہے۔ اس کا رشتہ تمہارے ساتھ کرانے کی خواہش مجھے بہت عرصہ سے ہے۔ . . . ."

کٹّی بیچ ہی میں بول پڑا "ابھی میرا شادی کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے"۔

"تم لوگوں کا تو کبھی رہتا ہی نہیں۔ شادی کے بارے میں تم لوگوں کو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ یہ تو تمہارے بزرگوں کا کام ہے۔ لڑکی دیکھ کر پسند کرنے کا کام تم لوگوں کا ہوتا ہے"۔

"لیکن گو پنّا جی۔ جب تک نوکری پکی نہ ہو جائے تب تک شادی کرنے کا میرا خیال. . . ."

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ شادی کرنی ہو تو سب باتیں سوچنا ہی پڑتی ہیں لیکن لڑکی پسند

کر کے بات پکی کر لینے میں کیا حرج ہے۔ نوکری تو کچھ دنوں میں پکی ہو ہی جائے گی۔"

"تو لڑکی کو ابھی دیکھنے سے فائدہ کیا ہے؟"

کٹی نے پہلی بار دیسائی جی سے اس طرح باتیں کی تھیں۔ اس کے خیالات اتنے پختہ ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ دیسائی جی کو نہ تھا۔ وہ جھنجھلا کر بولے "تم نہیں چاہتے ہو تو نہ دیکھو۔ میں نے سوچا تھا بیچارا برہمن ریل کا کرایہ خرچ کر کے آیا ہے، لڑکی پسند کر لی جاتی تو ایک کام نمٹ جاتا اب آگے تم لوگوں کی مرضی۔"

دیسائی جی کی ناگواری دیکھ کر کٹی کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی پھر بھی اس نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ کہتے ہیں تو دیکھ لوں گا۔"

"فی الحال یہی ٹھیک ہے" یہ سوچ کر دیسائی جی نے اطمینان کا سانس لیا۔

اتنے میں پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر شوپا جسم پر بھبھوت ملے ہوئے بیٹھک میں آ کر بغیر دری والے کونے میں دیوار سے پیٹھ ٹکا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ دیسائی جی نے پاندان سے پان سپاری اور تمباکو کی ڈبیہ نکال کر اس کی طرف بڑھادی جہاں وہ چھوت چھات کے ڈر سے سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ شوپا کے ہاتھ کی انگلی میں پوجا کی انگوٹھی، ماتھے پر تلک، گلے میں بڑی سی مالا اور ران کا ٹھگنا بدن دیکھ کر کٹی کے دل میں ان کے لیے عقیدت تو پیدا ہوئی لیکن سسر کی حیثیت سے انہیں قبول کرنے میں اس کو قباحت معلوم ہوئی۔ ایک تو اس تلک دھاری کے تحصیلدار صاحب سے تعلقات ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ بہت ہوا تو ان کے خاندانی دیوتا تک اس کی رسائی ہوگی۔ اس چوٹی اور لنگوٹی دھاری ہونق کے ساتھ بازار میں نکلنا بہت دشوار ہوگا..... یہ حضرت خود ایسے ہیں تو ان کی صاحبزادی کیسی ہوں گی۔ کہاں یہ اور کہاں مانچسٹر کی دھوتی پہننے والے حسین و جمیل چھ فٹ لمبے راگھپا!... دیسائی جی نے شوپا کا مختصر طور پر تعارف کرایا۔ شوپا کو ادھر ادھر کی غیر متعلق اور چکنی چپڑی باتیں پسند نہ تھیں لہٰذا بغیر تمہید کے اس نے فوراً کام کی بات شروع کر دی۔ وہ بولا "ابھی کسی کو کھانا کھلانے کے لیے کہہ دو تو اکیلی ذرا دیر میں کھانا تیار کر دے گی یہ ایک بات میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں" پھر مزید کچھ کہے بغیر تالی بجا کر بیٹی کو آواز دی "کرشنا ادھر تو آ بیٹی"

اپنی ماں اور دوسرے بھائی بہنوں کے پیچھے پیچھے کرشنا بیٹھک میں آئی۔ شوپا کو ایک اور بات پر بھی بڑا ناز تھا۔ "دیکھیے ہمارے گھر کے سبھی لوگ کالے ہیں اور میں نے سب ہی کے نام انکے

رنگ کی مناسبت سے رکھے ہیں۔ یہ کرشنا ہے۔ اس سے چھوٹا کالنگ ہے۔ اس سے چھوٹی شاملا ہے اور اس سے چھوٹا یہ گود کا بچہ گھن شیام ہے۔ کرشنا ہی ان سب میں ذرا کم کالی ہے۔" شوپا کے بچے ایک ترتیب سے دری پر بیٹھ گئے۔ گھن شیام بھی اپنا نام سنتے ہی باپ کی گود میں جانے کے لیے ہاتھ بڑھانے لگا لیکن باپ کی چھوت چھات کے ڈر سے شاملا نے اسے اٹھا لیا۔ عورتوں کا چھوٹا سا گروہ دروازے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ ان کی سربراہی وینو بائی کررہی تھی۔ کرشنا کماری بھی دیوار کے پاس منہ نیچا کرکے اکڑوں بیٹھ گئی۔ وینو بائی اپنی جگہ سے ہٹے بغیر وہیں سے بولی "دیکھو بھیا تم تو کرشن ہو یہ کرشنا ہے۔ ہم سب کو یہ جوڑی بہت پسند آئی ہے۔ تمہاری ماں صبح ہی دیکھ کر خوش خوش گھر گئی ہے۔" کسی نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی چھائی رہی۔ کچھ دیر بعد دیسائی جی نے ہی کرشنا سے سوالات کرکے یہ سکوت توڑا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں تک پڑھی ہو؟ گانا آتا ہے؟" وغیرہ وغیرہ کرشنا نے ایک بھجن گا کر سنایا۔ آواز شیریں نہ ہونے پر بھی سریلی تھی۔ دیسائی جی نے مزید سوالات نہ کیے اور کرشنا کو گھر کے اندر بھیج دیا۔ سب لوگ سوچنے لگے۔ کام بن گیا۔ شوپا نے بھی یہی قیاس کرکے آگے کی بات کٹی کو سناتے ہوئے دیسائی جی سے کہی "دیکھیے سب کام اپنی حیثیت کے مطابق کروں گا۔ ایک ہزار روپیہ بردکشنا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ لیکن میرا ابھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔" کٹی نے یہ جملا اتنے آہستہ سے کہا کہ اسے صرف دیسائی جی ہی سن سکے۔ اس حالت میں انھیں اس بات کو مزید آگے بڑھانا مناسب نہ معلوم ہوا۔ دروازہ کے قریب کھڑی ہوئی گنگوا کو ناشتہ لگانے کا اشارہ کرکے انھوں نے مجلس کی اس دن کی کارروائی گویا ختم کردی۔ اب کٹی کو بھی گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ پیر پٹختا ہوا گھر پہنچا۔ دروازہ کا تالا کھول کر اندر گیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ یہ سب اس کی ماں اور دیسائی جی کی مشترکہ سازش ہے۔ ماں تو خیر مورکھ ہے لیکن دیسائی جی آخر کیوں نہیں سمجھتے۔ انھوں نے ایک بار اگر احسان کردیا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں شادی کے معاملے میں خاموش رہوں۔ سوچ بچار کے بعد اس نے دیسائی جی کو خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ خط لکھ کر اس نے کاشی کی ماں کی بیٹی کو دیا اور اسے تاکید کردی کہ یہ خط دیسائی جی کے ہاتھ میں ہی دے۔

محترم گوپنا جی کی خدمت میں کرشن کا مؤدبانہ آداب

آپ نے میری شادی کرانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے جس کے لیے میں آپ کا بے حد

ممنون ہوں۔ لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس معاملہ میں آپ کی کوشش
رائیگاں جائے گی۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس معاملہ
میں فی الحال مزید کوئی قدم نہ اُٹھائیں۔ میرا جس وقت شادی کرنے کا ارادہ
ہوگا آپ کو مطلع کر دوں گا۔ فقط

آپ کا بچہ
کرشن جی

اہم نوٹ :۔ اس معاملے میں میں آپ سے جلد ہی ملوں گا۔

کرشن جی

خط کے انداز اور لب و لہجہ کو دیسائی جی نے اپنے لیے توہین آمیز تصور کیا۔ انھوں نے اس خط کو اور کسی کو نہیں دکھایا اور اپنی تجوری میں رکھ دیا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ شوپا کو انھوں نے دو دن کے لیے گھر پر ہی روک لیا اور اس سے گھر کی عافیت کے لیے پوجا کرائی۔ گاؤں واپس جاتے وقت شوپا نے ہچکچاتے ہوئے شادی کا معاملہ پھر اٹھایا تو دیسائی جی نے اس سے کہا " ارے چھوڑو بھی ! اس بہانے تم ایک بار میرے گھر تو آ گئے۔ یہی میرے لیے باعث اطمینان ہے ویسے بلاتا تو کیا تم آتے اپنا پوجا پاٹ چھوڑ کر ؟" اسی قسم کی دو چار باتیں کر کے اُسے ٹال دیا۔ گنگوا سے بھی انھوں نے زیادہ بات چیت نہیں کی۔

گنگوا نے کٹی کو دو تین دن گھر میں خوب تنگ کیا۔" اس طرح چار سال اور گزر گئے تو تجھے کوئی اپنی لڑکی نہ دے گا" یہ کہہ کر گنگوا نے اُسے ڈرانے کی بھی کوشش کی۔ ہر وقت کی اس تکرار سے بچنے کے لیے کٹی رات کو دیر سے گھر آنے لگا۔ سب کی باتوں کا اس کے پاس بس ایک ہی جواب تھا " ابھی میرا شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ نوکری پکی ہو جائے گی تو دیکھوں گا۔"

16

دیسائی جی کی دوسری کوشش

کٹی بہت پریشان رہنے لگا۔ راگھپا نے اس کی ماں کے سامنے ایک بار شادی کی بات

اٹھاکر دوسری بار اس کے گھر کا رخ ہی نہیں کیا لیکن نادیدہ جال کٹی کے چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ کٹی جب بھی بھولے سے راگھپا کی گلی سے گزرتا تو محلے کی عورتیں اس کی طرف اشارہ کرکے کہتیں "یہ رتنا کا دولھا ہے۔" دیوالی میں اتنا سب ہو جانے پر بھی راگھپا نے شادی کے معاملے میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ دن گزرتے گئے۔ وہ تحصیلدار صاحب سے دوستی، ضلعدار صاحب سے بے تکلفی اور جاگیردار صاحب کی جانب سے راگھپا کو اپنا بیٹا بنا لینے کے راگ الاپتا رہتا۔ رتنا کی بات ہی نہ چھیڑتا۔ رتنا نے بھی دیوالی کے اُس موقع کے بعد، یا تو جوان ہو جانے کے سبب یا ماں کے منع کر دینے کی وجہ سے، دوبارہ کٹی کے روبرو کھڑے ہو کر اس سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ رتنا سے اس طرح بات چیت پر پابندی لگ جانے کی وجہ سے کٹی بہت مغموم ہو گیا۔ رتنا روز بروز زیادہ خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ آج کی رتنا کل بالکل مختلف دکھائی دیتی۔ یہ تبدیلی صرف وضع قطع تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے جسم کے انگ انگ سے ظاہر ہوتی تھی۔ دیوالی کے موقع پر کٹی سے جس جراءت سے اس نے بات کی تھی اب وہ اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ اب وہ اسے دیکھتے شرما کر پردہ میں چھپ جاتی۔ اس میں کٹی کو بہت سی چھوٹی موٹی تبدیلیاں نظر آئیں اس کے ہونٹوں پر اب تک بچپن کی جو سفیدی تھی اس کی جگہ پکے ہوئے پھل کا رسیلا پن آ گیا تھا۔ آنکھوں میں ایک نئی چمک آ گئی تھی۔ رخساروں پر اور گردن پر ہاتھی دانت جیسی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے دور ہونے پر بھی کٹی کے دل میں اس کی تصویر ہر وقت موجود رہتی تھی۔ بہت دن سے کٹی کا بے چین دل بہانے ڈھونڈھ رہا تھا لیکن اس کی ہمت نہ ہوتی تھی دیسائی جی کے گھر میں لڑکی دکھانے کا جو واقعہ ہوا تھا اس سے اُسے شہ مل گئی۔ ایک بار راستے میں ملاقات ہونے پر کٹی نے راگھپا سے کہا "دیسائی جی ایک لڑکی سے شادی کرانے پر بضد ہیں۔"

"کون دیسائی؟" راگھپا نے اصل سوال کو پس پشت ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہمارے گھر کے پاس والے بہادر دیسائی جی۔ سفیدی والے گھر کے مالک۔"

"تو یہ بات ہے!"

کٹی خاموش رہا۔ پھر بولا "ابھی میرا شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ یہ میں نے اُن سے کہدیا ہے۔"

"تو پھر کب کرنے کا خیال ہے؟"

"نہیں، نہیں۔ ان سے ایسے ہی کہہ دیا ہے. . . . ." کٹی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"تو میں . . . . ." پتہ نہیں راگھپا آگے کیا کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کٹی کو اس ادھورے جملے

نے گویا بولنے کا موقع دے دیا "نہیں، نہیں، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں میں نے سوچ لیا ہے کہ اگر وہ دوبارہ اصرار کریں گے تو میں صاف صاف بتادوں گا کہ میں آپ کی بیٹی کے علاوہ کسی اور لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ اب تک میں ان کی بزرگی کے لحاظ سے خاموش رہا۔"

راگھپا اتنے دن سے کٹی کے منھ سے یہی باتیں سننے کا منتظر تھا۔ اس کی چلی ہوئی شطرنج کی چالیں گویا بار آور ہو رہی تھیں۔ راگھپا کے چہرہ پر کامیابی کی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے کٹی سے پوچھا۔

"تو یہ بات پکی ہے نا؟"

"کیوں؟ آپ کو کچھ شک ہے۔"

"نہیں۔ گنگوا کا اس معاملہ میں کیا خیال ہے۔"

"یہ بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ ماں دیسائی جی کی بات کو رد نہیں کرتی۔ اس لیے اہم بات دیسائی جی کو منانے کی ہے اگر دیسائی جی مان گئے تو سمجھ لیجے ماں بھی مان گئی۔"

راگھپا کچھ دیر گہری سوچ میں رہا۔ اس کے بعد اس نے دیسائی جی کا پتہ، مزاج، انکے دوستوں وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کیں اور اگلے اقدامات کی تیاری کرنے لگا۔

راگھپا کے سامنے اب جو مسئلہ درپیش تھا وہ بہت نازک تھا۔ دیسائی جی سے اس کی براہ راست ملاقات نہ تھی۔ وہ اپنے ساتھ دیسائی جی کے کسی واقف کار کو لے جا سکتا تھا۔ اکیلا بھی جا سکتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اسے ڈر تھا تو صرف اس بات کا کہ گنگوا نے دیسائی جی کو اسکے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اگر وہ کسی کو ساتھ لے کر جاتا ہے تو ہو سکتا ہے گنگوا کے ساتھ ہونے والے تمام پرانے واقعات ظاہر ہو جائیں جس سے اس کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ غرض بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اکیلے ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ کٹی کے دفتر کے اوقات کو ذہن میں رکھ کر ایک دن دوپہر کو دو بجے کے قریب وہ دیسائی جی کے گھر جا دھمکا اور ان کے دروازے پر دستک دی۔ دیسائی جی ذرا ہی دیر پہلے سو کر اٹھے تھے اور منھ ہاتھ دھو کر اخبار کو دوسری بار پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور کہا "آئیے! آپ کون ہیں؟"

راگھپا نے ان کے سوالات پر توجہ نہ دیتے ہوئے سب سے پہلے ان کے پاؤں چھو کر نہایت ادب سے انھیں آداب کیا۔ دیسائی جی کو پاؤں چھوانے کا پہلے سے تجربہ تھا۔ گاؤں کے کسان ہی نہیں، نوکری کے لیے اُن کی مدد حاصل کرنے کے لیے آئے لوگ اور قرض مانگنے والے اکثر لوگ

ان کے پاؤں چھوتے تھے۔ ان کو راگھپا کا یہ فعل تصنع سے بھرا ہوا معلوم ہوا۔ جھک کر اسے اٹھاتے ہوئے انھوں نے کہا "ارے، اس طرح ہر ایک کے پاؤں نہیں پڑتے"۔ پھر وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔

راگھپا نے اپنی آواز میں مصنوعی رقت پیدا کرتے ہوئے کہا "مجھے مصیبت سے چھڑانے کی طاقت صرف آپ میں ہی ہے اسی لیے میں آپ کی پناہ ڈھونڈھنے آیا ہوں"۔ پھر مصنوعی آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام بند گوڑہ کا راگھپا ہے۔ آپ کی پڑوسن گنگوا میری بہن ہے۔ (دیسائی جی کی تیوریوں پر پڑنے والے بلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا) تقریباً دس سال سے میرے اور اس کے تعلقات خراب ہیں۔ قسمت کے کھیل دیکھیے۔ مجھے اپنی بہن سے ملنے کے لیے آپ جیسے بزرگوں کے پاؤں چھونے کا موقع ملا۔ جب تک بند گوڑہ میں تھا یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ ایسا اتفاق بھی ہوگا۔ گاؤں چھوڑ کر بچوں کی تعلیم کی خاطر یہاں آیا تو یہ صورت پیش آئی"۔ یہ کہہ کر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ دیسائی جی کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا، وہ سمجھ گئے کہ بات کیا ہے۔ معمولی سی دنیاوی بات کے لیے اتنا سوانگ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ انجام کو سامنے رکھتے ہوئے وہ حتیٰ الامکان اس کی بات سننے کے لیے تیار ہوگئے۔ اسی وجہ سے وہ راگھپا کے اس سوانگ کو برداشت کر گئے۔ "کیوں؟ اب کیا ہوا؟"

"یہاں آکر اتفاقاً میری ملاقات کٹنا سے ہوگئی۔ خون کا رشتہ ہے نا! کچھ بھی کیوں نہ ہو کہیں دل مان سکتا ہے۔ گنگوا عورت ذات ہے۔ اپنی ہٹ چھوڑتی نہیں۔ لڑکے کے ساتھ تو کم از کم قرابت قایم رہے۔ یہ سوچ کر کٹنا کو تین چار بار ناشتے کے لیے گھر لے گیا۔ یہ معلوم تھا کہ گنگوا ناراض ہوگی لیکن پھر بھی میں کٹنا کو گھر لے ہی گیا۔ میرا اپنا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ کٹنا کو دیکھتے ہی پتہ نہیں میرے دل کو کیا ہو جاتا ہے ـــــ لیکن کرنے کچھ گیا تھا ہو کچھ گیا۔ جو ہو گیا اسے بتانے سے اب کوئی فائدہ نہیں۔ گنگوا بھلا کیوں چھوڑ دے گی حالانکہ آپ جیسے عظیم المرتبت بزرگ تو یہی کہیں گے کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا ـــــ بات یہ ہے کہ یہ کٹنا میری بڑی لڑکی رتنا سے شادی کرنے کے لیے میرے پیچھے پڑا ہے ـــــ ایسا نہیں ہے کہ میں اسے اپنی بیٹی دینا نہیں چاہتا لیکن یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ کٹنا اتنی ضد پکڑے گا۔ خیر! یہ تو ہوئی کٹنا کی بات اب قصہ یہ ہے کہ یہ بات سارے محلے میں پھیل گئی ہے اور میری رتنا کو اس کی سہیلیاں "یہ تیرا دولھا ہے" کہہ کر

چڑاتی ہیں۔ اس طرح بار بار کہہ کر رتنا کے دماغ میں بھی یہ بات ٹھونس دی گئی ہے۔

"ویسے دیکھا جائے تو سب لوگوں کو بڑی خوشی سے کٹی اور رتنا کی شادی کی بات کو منظور کر لینا چاہیے خون کا رشتہ ہے راؤ صاحب۔ لیکن گنگوا کو میرے متعلق شبہ ہے۔ کیوں ہے؟ یہ مجھے بھی نہیں معلوم ہے۔ ہماری گنگوا ویسے اتنی سخت دل نہیں ہے راؤ صاحب! وہ کتنی کشادہ دل ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میری شادی میں اس نے کس تندہی اور جوش و خروش سے کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔ برہمنوں کو دکشنا دینے کے وقت اپنے ہاتھ سے دو دو روپیہ دکشنا ہر ایک کو دی ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مقدر ہی خراب ہے۔ میرا بھی اور اس کا بھی۔ اس کا وقت بگڑا تو سب کی طرف سے اس کے دل میں شک سا بیٹھ گیا کہ ان ہی لوگوں کی وجہ سے میرا گھر بگڑا ہے۔ لیکن اس میں گنگوا کا کوئی قصور نہیں۔ بڑے بڑے مونچھ والے تک پیسہ کھو کر پاگل ہو جاتے ہیں، وہ تو ٹھہری عورت ذات اچھے پینے میں پیسہ گیا، جائداد گئی، شوہر گیا۔۔۔ اب اگر وہ عزیزوں سے بدظن ہے تو اس میں اس کی کیا غلطی ہے ۔۔۔ پھر آپ جیسے بزرگ اُسے تسلی دینے کے لیے موجود تھے۔ رشتے دار تو اسے بھاتے ہی نہیں تھے ۔۔۔ خیر! تقدیر کے آگے کس کی چلتی ہے۔ اب میرا ہی حال دیکھ لیجیے۔ ادھر کٹی میری جان کھا رہا ہے، ادھر اس نے مجھے بتایا کہ آپ نے اُسے کوئی لڑکی دکھائی ہے۔ آپ جیسے بزرگ، اس کی بھلائی کو سامنے رکھ کر ہی کچھ کرتے ہیں، یہی سوچ کر میں اپنی بہن کے پاس نہیں گیا سیدھا آپ کے پاس آیا۔ دوسری طرف وہ پگلی لڑکی رتنا ہے۔ ابھی تک تو ٹھیک ہے لیکن آج کل کی لڑکیاں فلم دیکھ دیکھ کر کیا کیا نہیں سیکھ رہی ہیں، کل اگر گنگوا کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے کٹی شادی سے انکار کر دے تو رتنا کیسے زندہ رہ سکے گی، وہ اپنی سہیلیوں کو کس طرح منہ دکھا سکے گی۔ عورت کا دل ویسے ہی نازک ہوتا ہے پھر چھوٹی عمر ہے، ناعاقبت اندیش ہے۔ غرض میں ایسی آفت میں پھنس گیا ہوں کہ بھگوان ہی اس سے نجات دلائے! راؤ صاحب۔ یہ بات بھی بہت زیادہ اہم نہیں ہے۔ میں ان تمام باتوں کو انگیز کر جاؤں گا لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اسے دیکھ لیجیے ایک بار ۔۔۔ چونکہ کٹی کی ذمہ داری آپ نے لی ہے اس لیے اپنی بیٹی ایک بار آپ کو دکھاؤں گا۔ آپ اسے خوب اچھی طرح دیکھ لیجیے آپ کے دل کو اطمینان ہو جائے تب ہی آپ اس رشتہ کے لیے 'ہاں' کہیے۔ ایک بات اور بھی ہے۔ خون کا رشتہ پھر خون کا رشتہ ہے۔ گنگوا میرے خلاف چاہے کتنی بھی زہر افشانی کرے لیکن کٹی کو دیکھتے ہی میرا دل بھر آتا ہے ۔ ۔ ۔ پھر میری رتنا موتی جیسی ہے۔ یہ بات نہیں کہ میں ہی۔۔"

اتنے میں راگھپا کی نظر دروازے پر خاموشی سے کھڑی اس کی باتیں سنتی ہوئی و بنو بائی پر پڑی۔ راگھپا نے ایک لمحہ کے لیے توقف کیا، اِدھر اُدھر دیکھا مگر پھر اپنی بات جاری رکھی۔ اپنے شوہر کو اس چرب زبان آدمی کی باتیں منہ پھاڑتے ہوئے سنتا دیکھ کر و بنو بائی سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ درمیان میں ہی بات کاٹ کر بول پڑی۔

"ہمیں کیا ہے جی! آپ اس جھنجھٹ میں نہ پڑیے۔ کِٹی جس سے جی چاہے شادی کرے، ہمیں کیا لینا دینا ہے۔ لیکن بے چاری گنگوا نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ بیٹے کے نام پر جان دیتی ہے۔ اس نے جو مصیبتیں جھیلی ہیں انھیں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس نے اپنی ہمت سے کِٹی کو اس منزل تک پہونچایا ہے۔ گنگوا کو راحت مل جائے، ہماری تو بس یہی خواہش ہے"

یہ بات دیسائی جی کو ٹھیک معلوم ہوئی۔ جہاں تک ممکن ہو اس کام میں دخل نہ دینا چاہیے لیکن و بنو بائی کا آخری جملہ "ہماری خواہش" انہیں پسند نہ آیا چنانچہ وہ بولے "ہماری نہ کوئی خواہش ہے نہ ہماری کوئی غرض ہے، پھر گنگوا ہماری لگتی ہی کیا ہے اور کرشن بھی ہمارا کیا لگتا ہے۔ ہم اس معاملہ میں دخل دینا ہی نہیں چاہتے۔ آپ گنگوا سے مل کر اسے راضی کر لیجیے۔ ہاں اگر آپ چاہیں گے تو ہم شادی میں دولہا دلہن کو آشیرواد دینے کے لیے ضرور آئیں گے۔"

"راؤ صاحب! حقیقت میں اس لڑکے کا بھلا کرنے والے آپ ہیں۔ اگر آپ نہ ہوتے تو بیچاری گنگوا کیا کر سکتی تھی"۔۔۔ دیسائی جی اٹھ کر باہر چلے گئے تو راگھپا و بنو بائی سے ہی بات کرتا رہا "آپ لوگوں نے اس لڑکے کے لیے کیا کچھ کیا ہے، یہ بات وہ لڑکا خود ہی بتا چکا ہے۔ اور لڑکا ہی کیا۔ تمام لوگ کہتے ہیں، ساری دنیا کہتی ہے ۔۔ وہ لڑکا اس معاملہ میں بھی آپ پر ہی تکیہ کر رہا ہے"۔ دیسائی جی یہ سن کر اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکے اٹھ کر انھوں نے تجوری کھولی اور کِٹی کا خط باہر نکال کر راگھپا کے سامنے رکھ دیا۔ خط کو دیکھ کر راگھپا تھوڑا سا سٹپٹایا لیکن نوٹ کو دیکھ کر اسے سہارا ملا۔ وہ پھر بولا "ہاں، ہاں، کِٹا کہہ رہا تھا، دیسائی جی میرے لیے لڑکی دیکھنے کی زحمت کر رہے ہیں لیکن میرا دل رتنا کی طرف مائل ہے۔ اُن سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی لیکن ایک نہ ایک دن ہمت کر کے ان کا آشیرواد لے ہی لوں گا۔ اس کے دل میں آپ کی عزت بھی ہے اور آپ کا ڈر بھی"۔

بچوں کی طرح بہلانے کے اس ڈھنگ سے دیسائی جی اچھی طرح واقف تھے لیکن کسی مصلحت سے انہوں نے اپنا غصہ ضبط کر لیا۔ وہ بولے۔ "اس خط کا مطلب کچھ بھی ہو۔۔۔۔

لیکن گنگوا کو راحت ملے، اوروں کی طرح میں بھی یہی چاہتا ہوں"

"کیوں نہ ملے گی رائے صاحب، بھگوان مجھ سے جھوٹ نہ بلوائے۔ میں گنگوا سے کیسا سلوک کروں گا، آپ لوگ خود دیکھ لیں گے۔ میرے اوپر اس کے بڑے احسانات ہیں۔۔۔۔ لیکن کیا کیا جائے کوئی وسیلہ میسر نہیں ہے اس لیے خاموش ہوں۔ ایک بات صرف آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میری دو ہی لڑکیاں ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی کٹی سے کر کے گنگوا کو اپنے قریب لانا چاہتا ہوں۔ دوسری کو بڑا ہونے میں ابھی پانچ چھ سال ہیں۔ دو چار ہزار روپیہ خرچ کر کے اس کی شادی بھی کسی اچھی جگہ کر دوں گا۔ اس کے علاوہ میرا یہ ارادہ ہے کہ کٹّا کو گود لے لوں۔ یہ میری دلی خواہش بھی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ سچ ہے کہ گنگوا کا ایک ہی لڑکا ہے لیکن اس کو متبنیٰ کیا جاسکتا ہے میں نے خود متبنیٰ کرنے کے اس قسم کے معاملات انجام دلائے ہیں۔ میں بھگوان کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ذرا بھی دھوکا نہ دوں گا۔ اپنے ہی خون میں کیسے دھوکا دے سکتا ہوں۔ میری ایک ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے۔ ان شادیوں میں تھوڑی بہت زمین ہاتھ سے نکل بھی جائے تب بھی کم سے کم سات آٹھ سو روپیہ کی آمدنی تو رہے گی ہی۔ یہ سب کٹّا کے حوالے کر کے چار دن جی کر اس کے بچوں کو کھلا کر آنکھیں موند لیں، یہی میری اور میری بیوی کی آرزو ہے ـــــ اچھی طبیعت کا لڑکا ہے۔ پھر اپنا ہی تو ہے۔ مرنے پر اس کے ہاتھوں ہمیں نجات ملے گی اس کا ہمیں یقین ہے۔ یہ میری دلی باتیں ہیں۔ آپ کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ اِدھر چھری ہے اور اُدھر خربوزہ ـــــ آپ جو چاہیں کیجیے سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔" کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد راگھپا اس معاملے کی آخری رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے تیار ہوا۔

"اب اگر آپ یہ کہیں کہ یہ سب باتیں تم ہی اپنی بہن سے کہو تو میں یہی جواب دوں گا کہ یہ کہنے کے بدلے آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ راگھپا تم اچھے آدمی نہیں ہو۔ تمہاری بیٹی ہمیں پسند نہیں۔ تمہاری عاقبت خراب ہو۔ اور یہ کہہ کر مجھے گھر سے نکلوا دیجیے۔ اس میں بھی خوش ہوں۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ اپنی بہن کو جا کر سمجھا تو تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ یہ آپ جیسے بزرگوں کا ہی کام ہے۔ کیوں؟ بھائی بہنوں میں کیا جھگڑے نہیں ہوتے ہیں؟ اور کیا آپ جیسے بزرگ درمیان میں پڑ کر انہیں طے نہیں کراتے ـــــ اتنے لوگوں کا بھلا کرنے والا اگر مجھے خالی ہاتھ لوٹا دے تو میں اسے اپنی بدنصیبی ہی کہوں گا۔"

راگھپا کی منطق کے چکر میں پڑ کر دیسائی جی پریشان ہو گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا

جیسے ان کی آزمائش کا وقت آ پہونچا ہے۔ شوبّا کی لڑکی ہوتی تو بات ہی کچھ اور ہوتی۔ اب کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ دینا ہوگا۔ اس میں بھی نظر کٹی کی بھلائی پر رکھنی ہوگی۔ اگر کٹی نے حماقت کی ہے تو مجھے تو اپنا ہوش و حواس نہ کھونا چاہیے۔ میں یہ کام کر بھی سکوں گا — پتہ نہیں لوگ آ آ کر کیوں میری جان کھاتے ہیں۔ میری اپنی ہی پریشانیاں کافی ہیں — یہ سوچ کر دل ہی دل میں جھنجھلاتے ہوئے وہ اس کام کے لیے تیار ہوئے اور گنگوا کو بلانے کے لیے انھوں نے بھرما کو بھیجا۔

17

گنگوا۔ راگھپا

بھرما سے جو اطلاع ملی اس سے یہ اندازہ کر کے کہ راگھپا ہی آیا ہوگا گنگوا تیزی سے چلتی ہوئی دیسائی جی کے کمرے کے پاس آئی اور کمرے کے باہر ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دینو بائی نے کہا "گنگوا اندر آ جاؤ"، لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔ آخر راگھپا نے بھی منھ کھولا — "گنگوا اندر آؤ۔ باہر کیوں بیٹھ گئیں جوان لڑکیوں کی طرح۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں بھیا، جسے جہاں رہنا چاہیے وہ وہیں رہے تو ٹھیک رہتا ہے۔"

راگھپا کی مکاری کی باتیں گنگوا کی دو ٹوک سیدھی باتوں سے ہار جاتی تھیں۔ دنیا کو قبضہ میں کر لینے والے راگھپا کو پتہ نہیں کیوں بہن سے کچھ ڈر سا لگتا تھا۔ اب تو جیسے کھائی میں کھڑے ہو کر لڑنے والے سپاہی کے مقابلے میں ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے سپاہی کا وار زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ اسی طرح گنگوا کا وار گویا دیوار کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے زیادہ کاری لگا۔

دیسائی جی کی بات بھی اس نے نہ مانی اور وہیں بیٹھی رہی۔ سامنے آ کر بیٹھنے کو بھی تیار نہ ہوئی۔ اسے ایک اور بھی ڈر تھا۔ چھوٹے بھائی کے سامنے بیٹھنے سے اگر اسے دیکھ کر دل پگھل گیا تو کیا ہوگا۔ اس کی رنگین باتوں کے جال میں وہ اب نہیں پھنسے گی۔ یہی فیصلہ کر کے وہ گھر سے چلی تھی اس لیے دیوار کی اوٹ میں بیٹھنا ہی اسے ٹھیک معلوم ہوا۔ دیسائی جی نے تمہید باندھی "گنگوا تمھارے چھوٹے بھائی سے ہم پوری طرح واقف نہیں ہیں لیکن گزشتہ ایک گھنٹہ میں ہم نے

بہت سی ادھر ادھر کی اور گھریلو باتیں کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی بیٹی کرشن کو بیاہی جائے۔ پرسوں شوپا کی بیٹی کرشن کو دکھائی گئی تھی، اس بات کو سن کر یہ یہاں آئے ہیں۔ ہم تمہاری مرضی جانے بغیر کچھ نہیں کرسکتے اسی لیے تمہیں بلوایا ہے۔"

رالکھپا بیچ میں ہی بول اٹھا "چھی، چھی، گنگوا کے آشیرواد کے بغیر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔"

گنگوا طنز کرتے ہوئے بولی: "میرے آشیرواد کی کیا ضرورت، تم نے تو اپنا سر پرستی کا ہاتھ اس پر رکھ ہی دیا ہے۔"

"یہ بات چھوڑو گنگوا، بہرحال آپ لوگ سگے بھائی بہن ہیں۔ کل پھر ایک ہوکر رہیں سے کہیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تم لوگ اپنی رنجش کو بھول جاؤ اور اصل بات پر آؤ۔ تم لڑکی دیکھنا چاہتی ہو کیا؟"

"گوپیا، بیکار کی باتیں کیوں کرتے ہو۔ میں نہ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتی ہوں نہ اس کے باپ کو، ان لوگوں کو دیکھتے دیکھتے تو میں تھک گئی ہوں، سوچتی ہوں کب میری آنکھ بند ہوگی"

دیسائی جی نے سر جھکا لیا۔ میرے بولنے کا وقت آگیا ہے، یہ سوچ کر رالکھپا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا انگوچھا درست کرتا ہوا بولا: "گنگوا جو ہوگیا سو گیا، گزری ہوئی باتیں بھول جاؤ اور مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر میری طرف دیکھو۔ کتنے دن غصہ کرتی رہو گی بلا سبب یہ ناراضگی کیوں؟ پتھر بھی پگھل جاتا ہے، دیکھو۔"

"ہاں بھیا رالکھو، میرا ہی دل پتھر کا ہے۔ تمہاری دولت دیکھ کر، تمہاری آن بان دیکھ کر، تمہاری رنڈیوں کو دیکھ کر میرا دل پگھلتا ہی نہیں۔ میں نے اتنے دن مصیبت اٹھا کر کٹی کو پالا پوسا، اتنا بڑا کیا میں نے، اکیلی نے۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے، کسی کے پاؤں پکڑے، کسی کی نوکری کی، کسی کو شرم بھرم میں ڈالا، کسی سے ضد کی، کیا کیا نہیں کیا۔ تب تمہیں میری یاد کبھی آئی کیا؟ بھائی والی کوئی بات کی تم نے؟ کبھی پوچھا، کیوں بہن کیسی ہو؟ تمہارے گھر میں کھانے پینے کو کچھ ہے یا نہیں؟ ایک دن بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب اس کی نوکری لگنے کے بعد میری یاد آئی ہے۔ تب تمہارے دل میں رحم نہیں تھا!"

"گنگوا، تم نے شکاری کتے کی طرح گھر کے آس پاس تک تو ہمیں پھٹکنے نہیں دیا۔ جوٹھی پتلوں تک کو تو دیکھنے نہیں دیا۔ تم نے ہمیں اچھوتوں کی طرح دور رکھا۔"

"ارے بھیا، تم کیوں اچھوت ہو، اچھوت تو ہم ہیں جنھوں نے اپنا پیسہ گنوا دیا۔ پیسہ

ہوتا ہے تو سبھی اپنے ہوتے ہیں۔ پیسہ نہیں ہوتا تو کوئی پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ یہی دنیا کی ریت ہے۔"
"مجھے دوسروں کا پیسہ کاٹنے کو دوڑتا ہے؟ تم چاہے مانو یا نہ مانو، میرا اصول یہی ہے۔"
یہ سنتے ہی گنگوا تلملا گئی۔ اب تک گفتگو الزام تراشی تک محدود تھی۔ اب گنگوا غصہ سے لال بھبوکا ہو گئی اور دیوار کے پاس سے اُٹھ کر دروازے پر بیٹھ کر چیخ پڑی۔ "دوسروں کا پیسہ! تیرے پاس پیسہ تھا ہی کب؟ مجھے معلوم نہیں کیا؟ سارے کھیت گروی پڑے تھے۔ ہمارے برباد ہو جانے کے بعد تیری زمینیں تیرے ہاتھ آئیں، ارے چھوڑ یہ ڈینگیں۔"
"گنگوا ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔ تمہارا پیسہ کیا ہم نے چرا لیا یا لوٹ لیا۔ ایک ایک بات کرو۔ تمہاری بربادی سے ہمیں دکھ نہیں ہوا، تم یہی کہنا چاہتی ہو نا۔"
"مجھے برباد کرنے والا تو ہی ہے۔ ہم سے ضمانت دلانے والا تو ہی ہے اس حرام خور وینکائی کو گھر سے بھگانے والا بھی تو ہی ہے۔ اس وقت کیا تجھے پتہ نہ تھا کہ بہن کے گلے میں پھانسی پڑ جائیگی تیری وجہ سے ہی میرے گھر کا سونا مٹی میں مل گیا۔ میرے شوہر کو تو نے ہی نگل لیا۔ دنیا میں حصہ بٹانے والے اور بھی مل جائیں گے لیکن تیرا جیسا آدمی چراغ لے کر ڈھونڈھنے پر بھی نہ ملے گا۔"
"ذرا ٹھہرو گنگوا، پتہ نہیں ہم پھر کبھی ملیں یا نہ ملیں، مجھے بھی ایسی باتیں سنتے سنتے بہت دن ہو گئے۔ اب دیبائی جی بھی گواہ ہیں۔ تمہاری ہر بات کا میرے پاس جواب ہے۔ ایک بار دونوں کے دل کی باتیں صاف صاف سامنے آ جانی چاہئیں۔ انھیں دل میں رکھ کر سڑانے کی ضرورت نہیں ہے پہلی بات گنگوا — کیا میں نے وینکائی کی ضمانت دینے سے انکار کیا تھا۔ کیا اپنے کو پیچھے رکھ کر سوامی رائے کو میں نے آگے کیا تھا — نہیں، جو حالات آگے پیش آئے وہ بھگوان کے ہاتھ کی بات تھی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں ضمانت دینے کے لیے خود آگے بڑھا تھا لیکن وکیل نے کہا تمہارے کھیت گروی پڑے ہیں، تم ضمانت نہیں دے سکتے اس پر سوامی رائے ایک بہادر کی طرح بولے، تم فکر کیوں کرتے ہو، ضمانت میں دیتا ہوں۔ یہ بات تمہیں یاد نہیں ہے خاندان کی عزت کے لیے اس پگلے کی ضمانت دینے کے لیے آگے آنے والا وہ بھلا انسان — وہ تو ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ ہوتے تو تم بھلے ہی لاکھوں کا نقصان اٹھاتیں لیکن ہمارے اوپر اس طرح زہر نہ اگلتیں۔ اب جانے دو، بیتی باتوں کو یاد کرنے سے فائدہ — میں تو بھگوان کو ہی کوستا ہوں۔ میرا مقدر ہی خراب تھا۔"
"بھیا جی، عورتوں کی سی باتیں چھوڑو۔ اسی طرح کی باتیں کر کر کے تم نہ جانے کتنوں کو

نگل گئے اور ڈ کار تک نہ لی۔ سارا گاؤں یہ بات کہتا ہے۔ میں کیا کہوں۔ میں بہر حال ایسی باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔"

"ذرا ٹھہرو۔ میری بات پوری ہونے دو۔ آج صاف صاف باتیں ہو جائیں۔ جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ سب تمہیں سنا دوں گا۔ بعد میں تم چاہو تو مجھے بھائی کہو چاہو تو مجھے چھوڑ دو۔ تمہیں یہ شک ہے کہ تمہیں ڈبونے کے لیے میں نے وینکا ٹی کو بھگا دیا۔ اسے بھگا کر مجھے کیا ملنا تھا؟ میں اسے کیوں بھگاتا۔ وہ تو آدھا پاگل تھا۔ پتہ نہیں کس کے پاپ سے وہ پاگل ہوا۔ یہ سچ ہے کہ اس رات وہ میرے گھر میں سویا تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی کرتا یا اس کی باہوں میں رسی ڈال کر اسے کھمبے سے باندھ کر رکھتا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا پھر بولا، ذرا گھوم آؤں، ابھی آتا ہوں لیکن وہ لوٹا ہی نہیں۔ کہیں چلا گیا۔ آگے کیا ہوا یہ تو معلوم ہی ہے۔ اسے ڈھونڈھنے کے لیے سوامی رائے نے سو روپیہ دے کر مجھے پونا بھیجا۔ تمہارے شوہر کو یہ شبہ نہیں تھا کہ وینکا ٹی کو میں نے بھگا دیا پھر تمہارے دماغ میں یہ شک کیوں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ سوامی رائے نے ہمارے بھائی کی عزت بچائی۔ ویسے کہا جائے گنگوا تو وینکا ٹی میرا بھائی ہے اور تمہارا بھی۔ اگر میں کہوں کہ سوامی رائے نے تمہارا بھائی ہونے کے ناتے اس کی ضمانت دی تو؟ کیا سوامی رائے میرا دشمن تھا؟ میرے سامنے ہی سوامی رائے نے ضمانت کے کاغذوں پر دستخط کیے تو کیا مجھے معلوم نہ تھا کہ وینکا ٹی کو بھگانے سے وہ پھنس جائے گا۔ اگر سوامی رائے کو کچھ ہوا تو میری بہن کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ کیا میں یہ نہیں جانتا تھا۔"

گنگوا ان باتوں کو اتنی تفصیل سے نہیں جانتی تھی۔ اس کی زندگی کی یادوں کا یہ حصہ بہت ہی دکھ بھرا تھا۔ وینکا ٹی کے جانے کے بعد لوگ اس کی تلاش میں کئی جگہوں پر گئے تھے۔ وہ نہ ملا تو ایک ماہ کے اندر ہی لوگ راگھپا پر شک کرنے لگے۔ راگھپا کے بارے میں گھر سے باہر طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں لیکن گھر میں چونکہ باہمی اتفاق تھا اس لیے ان باتوں کی گونج گھر میں نہیں سنائی دی تھی۔ گھر اجڑ گیا تو شبہ کی فضا پیدا ہوئی۔ لوگوں کی باتیں گنگوا کے کانوں تک پہونچیں۔ ان باتوں کو سن کر گنگوا کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وینکا ٹی کو بھگانے والا وہی ہے اور یہ بات اس نے بغیر کسی ثبوت کے یقین کر لی۔ چھ سات مہینے بعد جب اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو اس کا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ گنگوا نے ایک طرح

سے راگھپا اور اس کے بال بچوں پر فاتحہ پڑھ دیا تھا۔ اب سب باتیں تفصیل سے معلوم ہوئیں تو وہ لاجواب رہ گئی۔ دلیل کا سہارا نہ پاکر نفرت غم میں تبدیل ہوگئی۔ اب اس میں مزید بحث کرنے کی سکت نہیں تھی۔ پرانی یادوں کے تازہ ہو جانے کی وجہ سے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی:

"تم نے انھیں کھا کر ہی دم لیا۔"

راگھپا نے بات ختم نہیں ہونے دی، وہ بولا: "ایک اور بات ابھی کہنی رہ گئی ہے۔ بہت دن سے اسے کہنا چاہتا تھا۔ گنگوا تمہاری باتوں پر مجھے غصہ نہیں آتا۔ اس معاملہ میں میں نے بھی سوچا ہے۔ اسے دوہرانے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن بات اٹھ ہی گئی ہے اس لیے صاف صاف کہے دیتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ سوامی رائے کا سب سے زیادہ غم تمہی کو ہے لیکن میں اپنے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ تم تو گھر کی لڑکی تھیں اس لیے وینکائی کی ضمانت مجھ کو ہی دینی چاہیے تھی۔ وہ بھاگا بھی میرے ہی گھر سے اور اس کے بھاگنے سے ہی میری بہن کا گھر اجڑا اسی لیے کسی نہ کسی طرح میں بہن کا قرض چکانا چاہتا تھا۔ اس عرصہ میں اچانک سوامی رائے کا انتقال ہوگیا۔ اسے مارنے والا میں ہوں اسی پچھتاوے میں میں گلی گلی بھٹکا —— اے بھگوان میری جان لے لو پر اسے واپس کردو۔ یہ سب باتیں تمہیں معلوم ہوئیں —— خیر جانے دو۔ تمہیں پتہ بھی کیسے چلتا۔ تمہارا ناقابل برداشت غم ہی تمہارے لیے بہت تھا۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے مگر دیسائی جی میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے اصل حالات جاننے والے بھی بہت کم ہیں مگر کم سے کم بھگوان تو سبھی جانتے ہیں جنھوں نے یہ دکھ دیے ہیں۔" جیسے جیسے اس کی باتوں کا جوش بڑھتا گیا ویسے ویسے اس کی آواز بھی بلند ہوتی گئی۔ اسے بھی وہ زمانہ یاد آگیا۔ وہ واقعات تھے ہی ایسے دکھ بھرے کہ کسی کے دل کو ہلا ڈالنے کے لیے کافی تھے۔ وہ خود بھی ان میں کھو گیا۔ اس کی بات ختم ہوئی تو باہر بیٹھی گنگوا کے رونے کی آواز سب کو سنائی دی۔ دیسائی جی جھٹ سے اٹھ کر باہر آئے۔ راگھپا بھی اپنے آنسو پوچھتا ہوا باہر آیا۔ دیسائی جی کے آتے ہی گنگوا جو اب تک ضبط کی کوشش کر رہی تھی دھاڑیں مار کر رونے لگی اس منظر کو دیکھ کر راگھپا پر بھی رقت طاری ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی مردانہ صلابت بھی غم کے اس طوفان کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔ لیکن اس گریہ وزاری میں جلد ہی اس کی معاملہ فہمی کی قوت پھر واپس آگئی۔ کیسا اچھا موقع ہے، یہ سوچ کر اس نے پھر اپنا ناٹک شروع کردیا۔ وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا انگوچھا گنگوا کے قدموں میں بچھا کر

بولا " گنگوا مجھ سے جو بھی غلطی ہوئی ہے اسے معاف کر دو۔ جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ اور ایک بار مجھے چھوٹا بھائی کہہ کر پکارو۔"

پرانی یادوں میں محو گنگوا جس کا دل بھائی کی باتوں سے پگھلنے لگا تھا راگھپا کی اس نئی چال سے ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر پھر حال میں واپس آ گئی۔ اپنے بھائی کے اس بہروپیے پن سے وہ خوب واقف تھی اس کے حواس پھر مجتمع ہو گئے اور اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور جلد ہی وہ اپنا رونا دھونا بھول کر اٹھی اور مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے اپنی گھر کی طرف چل دی۔

دیسائی جی سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ ایک بار پھر شادی کے معاملے میں گنگوا سے گفتگو کریں گے، راگھپا بھی اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس دن دیسائی جی کی موجودگی سے اُسے آدھی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر دیسائی جی اس مجلس کی صدارت نہ کر رہے ہوتے تو وہ اپنی ساری چرب زبانی کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسے یاد آ گیا کہ وہ گنگوا کے ہاں ایک بار اکیلا جا کر اپنا سا منہ لے کر واپس آ ہی چکا تھا۔

گنگوا نے کٹی کے سامنے ان باتوں کا ذکر نہ کیا پھر بھی کٹی کو تمام باتیں معلوم ہو گئیں۔ راگھپا دفتر کی چھٹی کے وقت تانگہ پکڑ کر دفتر کی طرف گیا اور راستے میں ہی کٹی کو تمام خاص خاص باتیں بتا دیں۔ اس کے علاوہ اس نے کٹی کو یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر دیسائی جی اور گنگوا پوچھیں تو کہہ دینا کہ راگھپا کی لڑکی سے شادی نہ ہوئی تو میں ہرگز شادی نہ کروں گا۔ اس نے کٹی پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر کٹی نے ایسا نہ کیا تو اس کی بات میں کوئی وزن نہ رہ جائے گا اور یہ شادی پھر نہ ہو سکے گی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح پھر گنگوا کا بلاوا آیا۔ دیسائی جی کے گزشتہ دن کے واقعات کی غم انگیزی کو کم کرنے کے لیے سیدھے سادے ڈھنگ سے گنگوا سے جو کچھ کہنا تھا ایک دم سے کہہ دیا " گنگوا، ایسی باتوں میں تمہیں ہم جیسوں کو درمیان میں نہ ڈالنا چاہیے۔ بہرحال اتنا سب کچھ ہمارے سامنے ہو جانے کے بعد ہم ایک بات تم سے کہے دیتے ہیں۔ اگر تمہیں ٹھیک معلوم ہو تو اس پر غور کرو۔ تمہارا اپنے بھائی سے جھگڑا کیوں ہوا، کیسے ہوا اور کتنا ہوا ان باتوں کا ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے جیسے درمیان میں پڑنے والوں کا کام تو صرف اتنا ہی دیکھنا اور سوچنا ہے کہ کرشن کا بھلا کیسے ہو اور اس کے ساتھ تمہاری زندگی کیسے سکھی بنے۔ اگر یہ بات تمہیں

ٹھیک نہ لگے اور تم اسے نہ مانو تو بھی ہمیں کوئی دکھ نہیں تمھارے راگھیا کے کوئی لڑکا نہیں ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" گنگوا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دیسائی جی نے بات آگے بڑھائی: "تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کٹی کو اپنی لڑکی دے کر اسے گود لے لینا چاہتا ہے۔ قانونی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس سالانہ سات آٹھ سو روپیہ آمدنی دینے والی زمین ہے۔ ہم پوچھ گچھ کر کے اس کی تصدیق کریں گے یہ تو خیر آگے کی بات ہے۔ رہا یہ کہ راگھیا کیسا آدمی ہے ـــــ اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی بیٹی کیسی ہے، یہ بات اہم ہے۔ ہم اس سلسلہ میں معلومات کریں گے۔ لیکن ایک بات ہے۔ بچوں کے بڑا ہو جانے پر ہم انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہیں، یہ نہیں ہو سکتا گنگوا۔ اب بچوں کے معاملے میں ہمیں اتنا اختیار نہیں رہا ہے۔ سنا ہے کرشن نے اس لڑکی سے شادی کرنے کی ٹھان لی ہے۔ اس نے تم سے کچھ کہا ہے کیا؟"

"چھی، چھی، یہ سب راگھو کی بکواس ہوگی۔"

"جو بھی ہو، ہم کرشن کو بلا کر معلوم کیے لیتے ہیں لیکن میں اسے ضروری نہیں سمجھتا۔" یہ کہتے ہوئے دیسائی جی نے کٹی کا خط اپنے چشمے کے کیس سے نکالا اور پڑھ کر گنگوا کو سنایا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی۔ اس کا جی چاہا دیسائی جی سے کہے کہ اس خط کے لکھنے پر وہ اس کے بیٹے کو معاف کر دیں لیکن کچھ سوچ کر وہ خاموش رہی۔

دیسائی جی نے مزید کہا "بہرحال، اگر راگھیا کی بات ٹھیک ہے تو اس معاملہ میں ہم بہت زیادہ آزاد نہیں ہیں، لڑکی اگر ٹھیک ہے اور گھر کا کام کاج کر سکتی ہے تو میرے خیال میں تمہارا مزید تکرار کے بغیر، ہاں، کہہ دینا ٹھیک ہوگا۔ ورنہ کل کو اگر کرشن کہہ دے کہ وہ نہ تمہاری سنے گا نہ میری بلکہ اپنے دل کی کرے گا تو تمھارے لیے مشکل ہو جائے گی کہ نہیں؟ کرشن اب کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح سوچ لو۔ ہم چاہے جو بھی ہوں، ہیں تو پرائے ہی۔ تکلیف اٹھانے والی تم ہو اس لیے اچھی طرح سوچ لو۔ اچھا اب کچھ کام کی باتیں بھی کر لو۔ ویسے تو وہ کٹی کو گود لینا چاہتا ہے لیکن پھر بھی اس کو کچھ نہ کچھ بردکشنا ضرور دینا چاہیے۔"

"تمہارا کہنا مجھے ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے گوپا، لیکن اس راگھو کی باتوں پر یقین نہیں آتا ہے۔"

"تمھیں کس بات کا یقین نہیں ہے بتاؤ۔ اس کے لیے بھی کوئی راستہ نکالا جا سکتا ہے۔

پہلے یہ بتاؤ کہ جو باتیں میں نے کہی ہیں تمھیں ان سے اتفاق ہے یا نہیں؟"

"آج اسے گود لینے کو کہہ رہا ہے۔ کل کسی اور کو لے لے تو؟ وہ کسی بات پر قایم تھوڑی رہتا ہے۔ اس کا کام تو بس دوسروں کے لیے مصیبت کھڑی کرنا ہے۔"

"وہ مصیبت کھڑی کر سکتا ہے، کرنے دو۔ ہم نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں شادی کے وقت دتا تریہ کے مندر میں جا کر چار آدمیوں کے سامنے حلف اٹھواؤں گا اگر وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا تو ہمارے گاؤں میں اسے ٹھیک کرنے والے بھی ہیں۔ کھمبے سے بندھوا کر کوڑے لگواؤں گا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے۔" دیسائی جی نے طیش میں آ کر کہا۔

گنگوا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اب کیا کہے۔ وہ پست پڑ چکی تھی۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے ذرا تذبذب سے کہا "تم کچھ بھی کہو گوپنا، میرا یہ ڈر نہیں جاتا کہ یہ سب کر لینے کے بعد وہ کٹنا کو اپنے چنگل میں پھنسالے گا۔"

"ادھر دیکھو گنگوا، تمہارا بٹیا کوئی بچہ نہیں ہے۔ شادی ہو جائے تو بھی اور نہ ہو تو بھی، اگر کٹی یہ ارادہ کرے کہ راگھپا کے کہنے پر چلے گا تو کیا ہم اسے روک سکتے ہیں۔ تم ذرا سوچو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کرشن خود جلدی شادی کرنا چاہتا ہے اب اس کے سامنے ایک شرط رکھنی پڑے گی۔ شادی کے بعد یا متبنیٰ ہونے کے بعد کرشن راگھپا کے گھر نہیں رہے گا۔ اس سے اس طرح کا وعدہ لے لیں گے۔ وہ ایماندار لڑکا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ اگر تم اس شادی کی بات مان جاؤ گی تو تمہاری عزت رہ جائے گی، تمھارا بھرم بنا رہے گا، وہ بھی خوش ہو گا۔ قسم نہیں توڑے گا، ویسے تو اپنا اپنا کیا سب ہی بھگتتے ہیں۔ بہرحال ہمیں اپنی طرف سے کام کو آسان کر دینا چاہیے۔"

آخر دیسائی جی کی کوشش کامیاب ہوئی۔ گنگوا کو اپنے میکے کی زمین جائداد اور گھر دیکھے کئی سال ہو گئے تھے۔ اپنا وطن، بچپن میں اپنے کھیلنے کی جگہیں، اپنے کھیت جن کا اس نے اناج کھایا تھا سب کو یاد کر کے اس کا دل بھر آیا۔ ایک طرح کی خوشی بھی ہوئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ جن باتوں سے ڈرتی تھی ان کو کوئی بنیاد نہیں ہے۔

دیسائی جی کو اتنے ہی سے تسلی نہ ہوئی۔ گنگوا کے ذہنی سکون کے لیے بھی انھوں نے ایک حل نکالا: "تم سوچتی ہو اتنے دن کی رنجش کو کیسے ختم کیا جائے؟ لیکن اسے چھوڑ ہی دینا چاہیے۔ اس میں کوئی ایسا بندھن نہیں ہے۔ تمھاری بہو تمھارے گھر آ جائے تو تم کو اس کے

ساتھ محبّت کرنا چاہیے۔ یہ تمھارا فرض ہے۔ تمھیں اس کے باپ پر جو غصہ ہے وہ اس پر نہیں اتارنا چاہیے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمھاری حمایت نہیں کریں گے۔ یہ ہماری شرط ہے لیکن ہم یہ شرط بھی نہیں لگاتے کہ تم راگھپا کے ساتھ بھی ایسا ہی کرو۔ تمھارا جی نہ چاہے تو تم اس کا منھ نہ دیکھو، اس کے گھر مت جاؤ، اسے اپنے گھر نہ بلاؤ۔ یہ سب باتیں ہم وقت پر صاف کر دیں گے۔ کچھ کچھ وقفہ سے بہو بیٹے کو اس کے گھر بھیج دیا کرنا اس طرح تمہارا کام بن جائے گا۔"

یہ سن کر گنگوا بالکل لاجواب ہو گئی۔ دیسائی جی کی اس تقریر کے بعد اب مزید کچھ کہنے سننے کی گنجایش نہیں تھی۔

گھر پہونچ کر گنگوا نے کٹی سے مذاق میں پوچھا "کیوں رے، سنا ہے تو نے راگھپا سے کہا ہے کہ رتنا کے علاوہ اور کسی سے بیاہ نہ کرے گا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

کٹی نے "ہاں" کہہ دیا۔

اس پر اس نے محسوس کیا کہ دیسائی جی کی مہربانی سے وہ کتنی بڑی الجھن سے بچ گئی۔ اس دن گنگوا نے بھگوان کے سامنے گھی کا ایک اور دیا جلایا اور بھگوان سے دعا کی کہ گوپنا کو طویل عمر دے۔

18

سب فریقوں کی تیاریاں

شادی کے سامان کی خریداری کے لیے فہرستیں تیار کرنے کا وقت بھی قریب آنے لگا۔ گنگوا کا طرزِ عمل اس معاملے میں ایسا تھا گویا یہ کام زبردستی اسی پر لاد دیا گیا ہے۔ لڑکی دیکھنے کو بھی وہ تیار نہ ہوئی۔ اس نے کہہ دیا "جسے دیکھنے کی ضرورت تھی اس نے دیکھ لی ہے۔ میں دیکھ کر کیا کروں گی" اس نے شادی کے متعلق کسی سے بھی کوئی بات نہ کی۔ البتہ دیسائی جی سے اسے اس سلسلے میں جو باتیں کرنی تھیں وہ اس نے سوچ رکھی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ شادی کا دونوں طرف کا خرچ راگھپا اٹھائے گا اور اسے چار آدمیوں کے روبرو قسم کھانی پڑے گی۔ کٹی کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ کسی بھی حالت میں سسرال میں نہیں رہے گا اور اپنے ہی گھر پر رہے گا۔

بر دکشنا کی صورت میں رگھپا سے ایک ہزار روپیہ دلاتا ہوں گے۔

کٹی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی شادی اتنی آسانی سے ہو جائے گی۔ اس سے پہلے وہ اپنے بارے میں جو کچھ سوچا کرتا تھا وہ کچھ اور ہی چیز تھی۔ وہ دنیا کے رسم و رواج سے واقف نہ تھا اور انسان کے لیے قدرت نے جو عیش و انبساط پیدا کیا ہے اس کا تجربہ بھی اس کو نہ تھا۔ اپنی ذات کی اہمیت سے ناواقف وہ ماں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا تھا۔ کسی شخص نے آج تک اسے زیرک نہ سمجھا تھا۔ ہر شخص اس سے یہی کہتا "تمھاری ماں نے بڑی تکلیفیں اٹھا کر تمھیں پالا ہے" گویا یہ بات جتا جتا کر اسے ماں کے احسانات کے بوجھ کے نیچے دبا دیا گیا تھا اس لیے وہ شیر جیسا ہونے پر بھی بکری کی طرح بڑھا۔ (حسین سے اگر پوچھا جاتا تو وہ یہی کہتا کہ کٹی واقعی شیر ہے) یہ سچ ہے کہ ماں کا احسان اس پر بہت زیادہ ہے لیکن کیا اس بوجھ کو عمر بھر ڈھونا ہوگا کون سی ماں ہے جو اپنے بچے کو نہیں پالتی۔ اگر میری ماں کو مجھ سے اتنا ہی پیار ہے تو وہ میری آخری خواہش کے راستہ میں رکاوٹ کیوں بن رہی ہے۔ اگر اتنی ہی محبت ہے تو دیسائی جی کے پاس جو ایک ہزار روپیہ ہے ان میں سے ایک سو روپیہ کبھی میرے کپڑوں پر کیوں خرچ نہیں کیے؟ اگر ایسا ہوتا تو اسکول کی دس سال کی زندگی میں اسے صرف دو قمیضوں اور دو نیکروں پر گزارہ کرنا نہیں پڑتا، دفتر میں خاکی نیکر پہن کر جاتا تو دفتر کے پیادے تک اس کی ہنسی اڑاتے۔ نوکر ہونے پر بھی میرے پاس دھوتی نہیں۔ یہ سب اتنا پیار کرنے والی ماں چپ چاپ کیوں دیکھتی رہتی ہے۔ ان ہزار میں سے اگر پانچ روپیہ ہی خرچ کر دیتی تو کیا میرے لیے ایک جوڑا عمدہ دھوتی نہ آجاتی۔ ایک طرح سے تو ماں نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ اب نوکری لگ جانے سے کیا میں آدمی نہیں بنا۔ کچہری میں کتنی دوڑ دھوپ کے بعد میں دو پیسے کما کر لاتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتے ہوئے ہر ایک سے اپنی ہی اہمیت جتاتی پھرتی ہے۔ وہ اکثر اپنے دل سے اس قسم کی باتیں کرتا رہتا۔ "ماں تمھارا احسان بہت بڑا ہے لیکن کیا میری کوئی حیثیت نہیں ہے میری امیدوں اور امنگوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ کیا میں اب بھی تمھاری گود کا بچہ ہوں۔ اگر تمھیں مجھ سے سچا پیار ہوتا تو تم اس طرح رکاوٹ نہ ڈالتیں۔ مجھ سے زیادہ تمھیں اپنی نفرتیں اور رنجشیں عزیز ہیں۔ تم نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا، صرف اس بات کا ڈھنڈھورا پیٹنا چاہتی ہو" وہ اس قسم کے بے تکے جملے کسی ڈرامے کے مکالمات کی طرح اپنے ہی سامنے دہراتا رہتا تھا لیکن ان جملوں کو کسی کے سامنے بولنے کا اسے کبھی موقع ہی نہ ملا۔ آسانی

سے شادی طے ہو جانے کے بعد اس کی یہ خود کلامیاں آہستہ آہستہ ختم ہونے لگیں۔ اتنی آسانی سے شادی ہو جانے پر اسے نہ صرف پُرمسرت حیرت ہوئی بلکہ اپنی ماں کی صلاحیتوں پر فخر ہونے لگا۔ ماں کچھ عرصہ کے لیے اسے دیویوں جیسی مقدس اور محترم نظر آنے لگی۔ گنگوا نے کبھی یہ امید اپنے دل میں نہ کی تھی کہ کٹی اس سے اپنی احسانمندی کا اظہار کرے۔ یہ سوچ کر جو آفت بھی آئے گی جھیلتی رہے گی وہ خاموشی سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگی رہتی تھی۔

اب کٹی کو ایک نئی فکر دامن گیر ہوگئی تھی ۔۔ "ارے میرا بیاہ؟ ۔۔۔۔۔ گھر کے لیے ایک گھر والی لا رہا ہوں۔ کیا ایسی حسین و جمیل عورت کو ایسے بے ساز و سامان گھر میں لانا میرے لیے باعث شرم نہ ہوگا؟ وہ میری غریبی کو دیکھ کر میرا مذاق اڑائے تو؟ کیا دوسروں کے سامنے فخر سے یہ کہنے والی عورت کہ میرا شوہر کماؤ ہے جب گھر میں آکر شکستہ برتنوں کو دیکھے گی تو غصہ نہ ہوگی؟ اس کے کپڑوں لتّوں کا خرچ کتنا ہوگا! یہ بات اس سے صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ اسے ماں کے دل کو جیتنا ہوگا۔ وہ مورکھ نہیں ہے۔ دو چار دن میں ہی ماں کو اپنا گرویدہ بنالے گی۔ میرے متبنیٰ بن جانے کی امید میں شادی کی منظوری دینے والی ماں جب بہو کے حسن و جمال کو دیکھے گی تو پتہ نہیں کتنی خوش ہوگی۔ جس طرح آج مجھے چار آدمیوں کے سامنے پیش کر کے فخر سے کہتی ہے "یہ میرا بیٹا ہے" اسی طرح کل کیا بہو کو فخر سے ہر ایک کو دکھاتی نہ پھرے گی۔

کبھی کبھی کٹی کے وہمی دماغ میں عجیب عجیب اور ڈراؤنے وسوسے پیدا ہوتے" ایسے میں اتنی ضد کر کے رتنا سے شادی کر رہا ہوں، کیا یہ ٹھیک ہے۔ ضد سے پائی ہوئی چیز اگر اچھی نہ نکلے تو کیا مذاق نہ اڑے گا؟ اگر اچھی طرح سوچ سمجھ کر میں ضد کرتا تو اچھا نہ رہتا؟ میں نے اسے صرف نرک چتردشی کے دن ہی اچھی طرح دیکھا تھا۔ اس کے بعد جب بھی اس پر نظر پڑی تو وہ فوراً پردہ میں چھپ گئی۔ اتنی!! عاقبت اندیشی میں جو کام کیا ہے پتہ نہیں کہ اس کا آئندہ کیا انجام ہو؟ بہرحال اب جو ہو سو ہو۔"

کسی نے سچ ہی کہا ہے شادی کرنے والا ہی شادی کی مصیبت کو جانتا ہے دوسروں کو تو صرف لڈو کھانے سے مطلب ہوتا ہے۔ متبنیٰ ہونے کی بات سے کٹی بھی بہت خوش تھا۔ یہ خیال ماما جی کے دل میں تھا لیکن نہ معلوم اب تک انھوں نے اسے کیوں نہیں بتایا۔ یہ سوچ کر کہ ماموں اور ممانی اُسے اپنا بیٹا سمجھتے رہے ہیں وہ جذباتی ہو جاتا تھا۔ نرک چتردشی کے دن اس کے ماما کا یہ کہنا "کھانا یہیں کھا کر جاؤ، یہ تمھارا گھر نہیں ہے کیا؟" اور ممانی کا خود آکر اس کی

کٹوری گھی سے بھرنا۔ ان باتوں میں اسے ایک نیا مفہوم پوشیدہ نظر آنے لگا۔
کٹی کے سامنے اب دو بڑے مسئلے تھے۔ ایک شادی کے خرچ کا معاملہ اور دوسرا رتنا کو شادی سے پہلے ہی تمام اونچ نیچ سمجھانے کا معاملہ۔ گنگوا کا یہ اصرار کہ راگھیا ہی دونوں طرف کا شادی کا خرچ اٹھائے، کٹی کو کچھ بے تکا معلوم ہوا لیکن خود خرچ نہ کرکے ہوٹل میں کھانے کی عادت پڑ جانے کے سبب مجموعی طور پر اُسے یہ ٹھیک ہی لگا۔ اس کے علاوہ اسے اس بات کا بھی یقین ہوا کہ راگھیا اسے اپنا بیٹا سمجھ کر خوشی خوشی یہ خرچ اٹھائے گا — پھر بھی کیا اس کے اپنے ہاتھ میں بیاہ کے خرچ کے لیے پانچ سات سو روپیہ نہیں ہونا چاہیے۔ کپڑے، لتے، سونا، لڑکی والوں کو دینے کے لیے ساڑیاں، دوستوں کا چائے پانی، چپراسی، پیادوں کا انعام، ایسے کتنے ہی خرچ ہیں۔ بردکشنا تو شادی کے دن ہی ملے گی۔ اس وقت تک کا خرچ کہاں سے چلے گا ماں نے تو چپ سادھ لی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ تمام رنجشوں اور شکوے شکایتوں کو بھول کر ان تمام باتوں کا حل مجھے بتا دیں لیکن جس ماں نے مجھے خاکی نیکر میں دفتر بھیجا کیا وہ بدل سکتی ہے۔ اس شادی میں اگر میری بے عزتی بھی ہو جائے تو اسے کیا؟ مجھے خود ہی میدان میں آکر اس شادی کو کامیاب بنا کر دکھانا ہوگا۔ اس نے بیاہ کی منظوری دے دی ہے، یہ سوچ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا اور آگے کی فکر کیے بغیر اسی طرح شادی کے منڈپ میں چلا جانا رسوائی کا باعث ہوگا۔ مجھے دھوکے میں نہ رہنا چاہیے۔ ماں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اب سمجھدار ہو گیا ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے ماں سے پوچھا "ماں شادی کے اخراجات کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟"

گنگوا بولی "تمھارا ماما کرے گا — لڑکی دے رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، پر کتنا کرے گا؟ لڑکے کے لیے کپڑے بنوائے گا، کھانے پینے پر خرچ کرے گا کیا کیا کرے گا؟ کپڑے لتے، سونا وغیرہ وغیرہ یہ سب ہمیں نہیں سوچنا ہے کیا؟"

"یہ سب باتیں تو بیاہ کرنے والے کو سوچنی چاہئیں۔"

"تو ایسا کہو۔ صاف صاف کہہ دو تم نہیں کرنا چاہتیں — خیر! میں کروں گا!"

"اس میں میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے . . . . . آنکھوں سے نہیں دیکھتے؟" وہ بولی

"میں کہاں سے کروں؟ تم کما رہے ہو، کرو۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ آخر کٹی تھوک نگلتا ہوا ہمت کرکے بولا "سنا ہے دیسائی جی

پاس تمھارے ایک ہزار روپیہ رکھے ہیں۔"

"ہزار روپیہ کہاں سے آئے؟ نیرا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ کہاں سے آئیں گے ہزار روپیہ ۔ ہزار روپے ہوتے ہوئے ایسی دھوتی پہنتی .... ؟"

گنگوا نے اپنی لال ساڑھی پر جابجا لگے ہوئے پیوند دکھائے۔ اس دن کٹی کے گھر سے نکلتے ہی گنگوا سیدھی ڈیسائی جی کے گھر گئی اور انھیں اپنی اور کٹی کی گفتگو کے متعلق بتایا۔ اس کے بعد ان سے یہ عہد لیا کہ اگر کٹی ان سے پوچھے تو وہ اس سے صاف صاف کہہ دیں کہ تمھاری ماں نے میرے پاس کوئی پیسے نہیں رکھے۔

کٹی اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے کی خاطر پانچ چھ بار اپنے ماما کے گھر گیا۔ چاء ناشتہ تو اسے ہر بار ملا لیکن رتنا سے تنہائی میں ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کی جھلک البتہ دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ اب رتنا لانگ والی ساری پہننے لگی تھی۔ ایک بار محبوب جان نے گندھر ولانگ والی دھوتی باندھنا سکھادیا تھا لیکن نیا تجربہ ہونے کی وجہ سے اس انداز کی ساڑی وہ ابھی ٹھیک سے باندھ نہیں پاتی تھی۔ اوٹ پٹانگ طریقہ پر وہ ساری لپیٹ کر چلتی تو کٹی کو اس پر لنگڑی ہونے کا شبہ ہوا۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا لیکن جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو اس کا شبہ دور ہوگیا۔ ایک بار اسے ایسا محسوس ہوا جیسے رتنا بھینگی ہے۔ ایک بار دوران گفتگو اسے ایسا لگا کہ وہ ہکلاتی ہے۔ اس کے حسن کے بارے میں بھی کبھی اس کے دل میں شک پیدا ہوجاتا۔ ان دنوں شادی طے ہوجانے کی خوشی میں اس کا بدن بھر سا گیا تھا! اور وہ بے حد حسین ہوگئی تھی۔ لیکن کٹی کو اس کے بدن کے رنگ پر بھی شبہ ہوا۔ یہ اصلی ہے یا میک اپ ہے؟ اگر اس میں محبوب جان کی تعلیم کا اثر ہوا تو؟ آخر میں اپنے وسوسوں پر اسے خود غصہ آنے لگا۔ مگر اس نے اپنے ہوش و حواس مجتمع کیے آخر کار! ایک دن اُسے رتنا سے تنہائی میں ملنے کا موقع مل ہی گیا۔ کٹی کو بار بار گھر کے چکر کاٹتے دیکھ کر ہوشیار راگھپا اس کا مقصد بھانپ گیا اور اس نے اشاروں اشاروں میں ساری بات چمپکا کو بتادی۔ اُسے ایسے معاملات سے بہت ڈر لگتا تھا۔ دور سے ہی کٹی کو آتے دیکھ کر ایک دن چمپکا رتنا سے بولی "ایسا لگتا ہے نیرا دولھا تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے میں پچھواڑے کی طرف رہوں گی۔ تو ڈرنا نہیں۔ زیادہ باتیں نہ کرنا پھر رتنا کے کان میں بھی چمپکا نے کچھ کہا اور پچھواڑے چلی گئی۔ رتنا اخبار لے کر آنگن کے پاس والے کمرے میں جا بیٹھی۔

اخبار میں محو اپنی ہونے والی بیوی کو تنہائی میں دیکھ کر کٹی امید و بیم سے پسینے پسینے ہو گیا کوئی پُر لطف بات ذہن میں نہ آئی تو پوچھا "پتا جی نہیں ہیں؟"

رتنا اس طرح ہڑبڑا کر اٹھی جیسے اس سے کٹی کو اسی وقت دیکھا ہو اور بولی "نہیں۔"

"ماں کہاں ہیں؟"

"پچھواڑے نیم کی پتیاں توڑ رہی ہیں۔"

تنہائی کی وجہ سے دونوں بے قرار ہو گئے اس لیے تھوڑی دیر سکوت رہا۔

"تم نے میری ماں کو دیکھا ہے ؟"

"نہیں تو"

"تمھارے ماں باپ چاہے جو کہیں لیکن میری ماں جیسی شریف عورت ساری دنیا میں دوسری نہ ملے گی۔"

"اپنی اپنی ماں سب کو ایسی ہی لگتی ہے"

"نہیں نہیں، میری ماں تو دیوی ہے۔ اس نے شادی کی منظوری دے دی ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ کیا تم سوچ سکتی ہو۔"

"نہیں"

"جب گھر آجاؤ گی تو انھیں خوش رکھنا، تم ان کی خدمت کرو گی تو مجھے بھی اطمینان رہے گا۔"

"تو پھر آپ کی خدمت کون کرے گا؟"

"میری بھی کرنا مگر ان کی بھی کرنا ہوگی، اور ان کی خاص طور سے۔ ان کو خوش رکھو گی تو مجھے بھی خوشی ہوگی۔"

"ہم سے جتنا ہو سکے گا کریں گے۔"

"یہ تو تم میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہو۔"

"ان سے بھی اتنا کہہ دیجیے گا کہ بہو کو پریشان کر کے رلائیں نہیں"

کٹی کچھ سٹپٹا سا گیا۔ چڑ کر ذرا اونچی آواز میں بولا۔

"ہاں ان کی سیوا کروں گی۔ اتنا صاف صاف کہہ دینے میں تمہارا کیا چلا جاتا۔"

"ہاں سیوا کروں گی" رتنا نے دہرایا اور سسکیاں لینے لگی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ڈھلک کر گالوں تک آگئے۔ ساڑھی کے پلو سے وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ . . . تمہارا دل دکھانے کو میں نے یہ نہیں کہا تھا۔ تمہاری بھلائی کے لیے۔"
"کیوں؟ . . . . اپنی ساس کی خدمت نہ کرنا۔ کیا یہ سکھا کر میرے ماں باپ بھیجیں گے۔"
یہ کہہ کر وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔
کٹی کو اطمینان ہوا۔ اس کو معلوم ہو گیا کہ رتنا خدمت کرنے کو تیار ہے۔ میرے شکی دل نے ہی مجھے اس سے ایسے سوالات کرنے پر اکسایا جن سے اس کے پاکیزہ دل کی توہین ہوئی۔ مسرت کے اس بے ساختہ تموج میں اس نے رتنا کے آنسو پونچھنے کو ہاتھ آگے بڑھایا۔ ماں نے کان میں جو باتیں کہی تھیں وہ رتنا کو فوراً یاد آگئیں اور ایک دم سے پیچھے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کٹی کی انگلیوں میں اس کے گرم گرم آنسو لگ گئے جنھیں اس نے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔
کٹی شادی کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ ماں کی عدم دلچسپی کے باوجود شادی کی دھوم دھام میں کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔ ابھی ایک ماہ قبل اس کی جان پہچان ایک ایسے بیوپاری سے ہوئی تھی جو دلالی کا کام کرتا تھا۔ اس کے ایک کام کے سلسلہ میں کٹی کو بیس روپیہ ہاتھ آئے تھے۔ کٹی سیدھا اس کی دوکان پر آ گیا۔ اس نے اُسے بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا۔ وہ گاؤتکیہ سے پیٹھ لگائے اپنی گدی پر بیٹھا تھا۔ مگر اس کی توجہ بیک وقت اپنے کام کی طرف بھی تھی اور کٹی کی باتوں کی طرف بھی۔ کٹی فوراً ہی اپنا حرف مطلب زبان پر لے آیا اور اس سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگا یہ سوچ کر کہ ایک ہزار مانگنے پر چار پانچ سو تو مل ہی جائیں گے۔ شیٹی الٹا اسی کے گلے پڑ گیا، کہنے لگا "کیا صاحب، گڑ کے ٹرانسپورٹ کا آپ نے ہی لائسنس دیا۔ جو کچھ پیسہ تھا وہ اس میں لگا دیا۔ ایک مہینہ رک جائیے کچھ نہیں تو دو چار سو تو دے ہی دوں گا۔" پھر وہ اپنی تجارتی مشکلات کا رونا لے کر بیٹھ گیا۔ کٹی کو اپنی توہین محسوس ہوئی لیکن شیٹی نے خاطر مدارات کر کے اس کمی کو پورا کر دیا۔ ڈبل روٹی، چائے، مکھن وغیرہ سے اس کی تواضع کی۔ جب کٹی واپس لوٹنے لگا تو شیٹی نے پوچھا: "ہمیں شادی پر بلائیے گا؟"
کٹی نے کہا "آپ کے بغیر ہمارا بیاہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔"
"اگر بلایا تو کچھ بھینٹ کر آؤں گا ورنہ دفتر میں تو بھینٹ ہو گی ہی" یہ کہہ کر شیٹی ہنس دیا۔
کٹی کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔
دو ایک جگہیں اور بھی تھیں لیکن یہ سوچ کر کہ اگر شیٹی کی طرح انھوں نے بھی جھنڈی دکھا دی تو کیا ہو گا، کٹی نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پیسہ کی فکر اس کے دل پر ایک بوجھ

بن گئی تھی۔ ایک دن بہت پریشان ہوکر وہ دیسائی جی کے پاس گیا اور ان کے سامنے اپنی مشکلات بیان کیں۔

دیسائی جی اس سے بولے "ارے ہاں، روپیہ کا کیا انتظام ہے یہ جاننے کے لیے میں تمھیں بلانے والا ہی تھا لیکن اس لیے خاموش تھا کہ پہلے سامان کی فہرست تو بن جائے۔"

اب کٹی کو ذرا کھل کر بات کرنی پڑی۔ اس نے کہا" گوپنا جی، یہ رنجش اب تو ماں کو چھوڑ ہی دینا چاہیے۔ بیاہ کے خرچ کی کوئی بات نہیں کیا؟ پتہ نہیں وہ اس معاملہ میں اتنا خاموش کیوں ہیں؟"

"وہ نہیں پوچھتی تو تمھیں پوچھنا چاہیے۔ کیوں؟ ماں سے پوچھنے میں تمھیں شرم آتی ہے کیا؟"

"پوچھا تھا لیکن وہ کہتی ہے اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ اب اس حالت میں ان کا یہ کہنا میرے دل میں شبہ پیدا کرتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ میرے پتا جی کے پاس بہت دولت تھی۔ کیا وہ سب چلا گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ کم از کم ایک ہزار روپیہ تو۔ ۔ ۔ ۔"

دیسائی جی اپنے چہرے پر کسی تبدیلی کو لائے بغیر بولے "اپنی ماں سے پوچھو۔ ہوگا تو دیگی اگر ویسے تم کو ضرورت ہو تو دو چار سو روپیہ میں تمہیں دیتا ہوں۔ اپنی بردکشنا آنے کے بعد واپس کر دینا۔"

"آپ جیسے بزرگوں کا ہی سہارا ہے مجھے۔ اس بات کی تقویت تو ہے لیکن ہمارے گھر میں ایک ہی شادی تو ہونی ہے اس کے لیے بھی اگر ماں خرچ نہ کرے تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ ویسے قاعدے میں انھیں کو زیادہ دلچسپی لینا چاہیے۔ مگر وہ کہتی ہیں "میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے" اتنا تھا، آج کیا ایک ہزار بھی نہیں بچا ہے۔ اسے میری بدنصیبی ہی کہنا چاہیے۔"

"کچھ بچا ہے کیا؟ اپنی ماں سے پوچھو۔ پوچھنے میں شرم کاہے کی۔ تم صاحب ہوگئے تو کچہری کے لیے۔ ماں سے کیا شرم ہے۔"

"میری ماں نے آپ کے پاس کچھ روپیہ رکھے ہیں کیا؟" یہ سوال کٹی کی زبان کی نوک پر آیا لیکن وہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دوسرے یہ کہ یہ شادی دیسائی جی کی معرفت ہی طے ہوئی تھی۔ ان سے اس قسم کی گستاخی ٹھیک نہ تھی۔

جب کٹی چلنے لگا تو دیسائی جی اپنے تکیہ پر ذرا اور بوجھ دیتے ہوئے بولے:

"ویسے قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ لڑکی تم نے پسند کی ہے اس لیے روپیہ بھی تم ہی خرچ کرو۔

ہم بھی یہ بات کہہ سکتے ہیں لیکن ابھی تک ہم میں یہ گھمنڈ باقی ہے کہ لڑکا ہمارا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ تم اسی طرح چلوگے ؟" یہ کہتے ہوئے انھوں نے جملہ پورا کردیا۔

دیسائی جی میں اتنا کھرا پن بھی ہے، کٹی کو اس کا علم نہ تھا۔ پیسے کے معاملے میں ساری دنیا ایک جیسی ہے۔ یہ سوچتا ہوا اداس ہو کر وہ باہر آیا۔ "افسوس، اپنے گھر کا پیسہ مجھے دوسروں سے مانگنے میں یوں خفت اٹھانا پڑے گی"، وہ یہ سوچ کر دل برداشتہ ہوا۔

فہرست بناتے وقت لڑکی دکھانے کی رسم بھی دیسائی جی کے گھر میں انجام پائی۔ محلے کے چار چھ معززین بھی شریک ہوئے۔ گنگوا لڑکی نہ دیکھنے کی اپنی ضد پر اڑی رہی اور کمرے کے باہر ہی بیٹھی رہی لیکن رتنا نے اس کے پاس آکر جب سلام کیا تو گنگوا نے اسے ایک بار کنکھیوں سے دیکھا اور پھر دوسری طرف منھ پھیر لیا۔ لیکن اس ایک اچٹتی سی نظر میں ہی رتنا کے حسن کا نقش اس کے دل میں بیٹھ گیا۔ اسے یہ اطمینان ہوا کہ بہو دیکھنے میں خوبصورت ہے اور بھلی دکھائی دیتی ہے۔ جیسی بھی ہے ٹھیک ہے۔

دیسائی جی کی ساری شرطوں کو راگھپا نے خوشی خوشی مان لیا۔ متبنیٰ کے معاملہ میں اس نے کُل دیوتا شری وین کٹیش کی قسم کھائی۔ کٹی نے بھی قسم کھائی کہ وہ متبنیٰ ہونے کے بعد بھی الگ گھر نہ بسائے گا اور ماں کے ساتھ ہی رہے گا۔ کٹی کو یہ بات توہین آمیز معلوم ہوئی کہ اتنے لوگوں کے سامنے گھر کی راز کی باتیں ظاہر کی گئیں اور اس سے قسم لے کر اس پر ایک طرح کا عدم اعتماد ظاہر کیا گیا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ یہ کام ایک طرح سے ضروری بھی تھا۔ بہر حال اس بات سے اسے اطمینان ہوا کہ چلو سب کام بخیر و خوبی انجام پا گیا۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ روپیوں کی فکر بڑھنے لگی۔ لاابالی، متلون، ڈرپوک اور طفل مزاج اس صاحب کو اتنے روپیہ قرض دینے کو کوئی پارٹی تیار نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کٹی سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ پھر انھیں یہ بھی یقین تھا کہ اگر ان کے انکار سے وہ خفا بھی ہوا تو اسے ڈبل روٹی، مکھن اور کرسناپا کے مشہور دونے کھلا کر فوراً منایا جاسکتا ہے۔ یہ بات ان کی آزمودہ تھی اس لیے کٹی کو اپنے دفتری "حق" سے زیادہ ایک پائی بھی کہیں سے نہ مل سکی۔

اب شادی میں صرف دو ایک ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ ایک دن کٹی کچہری میں اپنی میز پر منھ ٹکائے بیٹھا تھا کہ جارج اسے چائے پینے کے لیے لے گیا۔ کٹی کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ کبھی کبھی چار بجے سے پہلے چائے نہ پینے والا جارج از خود آج اُسے اس وقت چائے پلانے کیوں

لیے جا رہا ہے۔ کینٹین کے راستے میں جارج نے کٹی کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا: "بھائی" کٹی کی آنکھوں سے آنسو بہے بہت دن ہو گئے تھے۔ وہ دُکھی رہا لیکن خاموشی سے سہتا رہا۔ لاتیں کھاتا رہا، دوسروں کے پاؤں پکڑتا رہا لیکن کبھی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ ایک انگریز شاعر کا قول ہے۔ "رونے کے لیے بھی خدا کی مہربانی کی ضرورت ہے۔" اسی دن جارج نے اُسے اپنے ساتھ لے جا کر پانچ سو روپیہ قرض دلائے۔

19

خوشی کے نغموں کے درمیان ایک بے سرا راگ

محبوب جان کو شادی کے گھر میں بہت سی دقتوں کا سامنا تھا۔ اُسے عزت کی نظر سے دیکھنے والا صرف راگھپا ہی تھا۔ کبھی کبھی بھاری ساری میں ملبوس لنگڑاتی ہوئی ادھر سے اُدھر چکر لگاتی ہوئی چمپکا اس سے دو ایک باتیں کر لیتی۔ اس کے کمزور جسم کو شادی کی دوڑ دھوپ نے اور بھی مضمحل کر دیا تھا اس لیے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر چراغ پا ہو جاتی تھی۔ جب وہ محبوب کے سامنے کسی کو ڈانٹتی تو محبوب کو ایسا لگتا جیسے وہ اسی کو کہہ رہی ہے۔ یہ سوچ کر کہ شادی کے گھر میں اُسے نہ تو آرام ملے گا اور نہ ہی اس سے کسی کو کچھ فائدہ ہوگا محبوب جان نے راگھپا سے کہا تھا کہ وہ پھیروں کے وقت ہی آئے گی، لیکن راگھپا بھلا ماننے والا تھا۔ اس سے ضد کر کے، غصہ کر کے، اس کے ہاتھ کا پان کھانے سے انکار کر کے آخر کار اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ شادی سے کم از کم چار دن پہلے وہاں آجائے۔ محبوب جان جانتی تھی کہ اس کی وجہ سے شادی کے گھر میں سب کو پریشانی ہوگی لیکن روز بروز اس کے اندازے سے بھی زیادہ دقتیں پیدا ہونے لگیں: ایک تو ہر وقت کی چھوت چھات، اپنے کھانے کی پتل اُسے خود پھینکنا پڑتی تھی۔ روز گوبر سے صفائی کرنی پڑتی تھی۔ ذرا ذرا سی چیز کے لیے گھنٹوں گھر کی لڑکیوں کا منہ تکنا پڑتا تھا۔ ان سب باتوں سے وہ گھبرا گئی۔ چھوت چھات برتنے والی عورتیں اُسے نفرت سے دیکھتیں۔ منڈپ میں شریر جوان لڑکیاں ایک تو اس سے پان سپاری مانگ مانگ کر اسے پریشان کرتیں دوسرے راگھپا کا نام لے لے کر اسے چڑاتیں۔ محبوب کو دن میں پندرہ بیس مرتبہ چائے پینے کی

عادت تھی لیکن اس افراتفری میں دو تین بار بھی چائے ملنا مشکل تھا۔ راگھپا کے آنے پر البتہ اسے ایک بار ضرور چائے مل جاتی تھی۔ اپنی زبان سے چائے کا تقاضا کرنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس لیے چائے کی کسر تمبا کو سے پوری کرنا پڑتی ـــــ اس کے علاوہ اسے صبح سے شام تک کوئی کام نہ تھا۔ شادی میں جو کام اُسے کرنا تھا وہ ایک ہی دن میں ختم ہوگیا۔ وہ کام تھا شادی کے منڈپ کی تیاری اور سجاوٹ۔ اس نے خود سامنے کھڑے ہو کر منڈپ کو سجوایا۔ چھ سال سات پہلے وہ شیشائی ناٹک کمپنی میں کام کر چکی تھی۔ ان دنوں وہ کمپنی دھارواڑ آئی ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ تانگہ کر کے وہاں پہونچی۔ کمپنی کے مالک پر مبشور بھٹ سے ملی اور اصرار کر کے کمپنی کے کچھ پردے ان سے مانگ لیے۔ ان پردوں سے اس نے منڈپ کو اسٹیج کی طرف سجادیا۔ ناٹک کمپنی سے وہ رنگین کاغذ کی جھالریں بھی مانگ لائی تھی۔ کمپنی کے سجاوٹ کار چنا ریڈی کو بلا لائی تھی اور چاء اور پان سے اس کی خوب تواضع کر کے ایک رنگین کپڑے پر روئی سے "سواگت" لکھوایا اور شادی کے منڈپ کے باہر دو بانس گاڑ کر اُن پر ٹنگوا دیا۔ خود کھڑے ہو کر اس نے اپنی نگرانی میں کاغذ کے پھولوں کے گچھے اور جھالریں لگوائیں اور آرائشی محرابیں بنوائیں۔ اُسے بیاہ منڈپ سجانے کا تجربہ نہ تھا لیکن وہ اسٹیج کی سجاوٹ سے اچھی طرح واقف تھی چنانچہ اس منڈپ کو بھی رنگ شالے کی طرح سجایا۔ راگھپا نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ بہرحال منڈپ اس خوبصورتی سے سجایا گیا تھا کہ راستہ چلتے لوگ خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور ہر شخص محبوب کی تعریف کرتا تھا۔ دو تین دن بعد مہمانوں کی تعداد گھر میں اور بھی بڑھ گئی اور اس سے کھانے پینے کی چھوت چھات کا جھنجھٹ بھی اور زیادہ تکلیف دہ ہو گیا۔ لوگ منڈپ کی سجاوٹ کو بھول گئے اور محبوب جان کی اہمیت بھی کم ہو گئی۔

اس کے بعد محبوب کے لیے دوسرا کام تھا دلہن کا بناؤ سنگار۔ رتنا کو وہ ڈرامائی طرز پر الگ الگ وقت کے لیے الگ الگ ساریاں پہناتی۔ بالوں کی سجاوٹ کرتی، کم کم کو طرح طرح سے لگاتی اور اس طرح اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرتی۔ یہ باتیں گھر کی بڑی بوڑھیوں کو اچھی نہ لگتی تھیں لیکن رتنا سنگار تو محبوب کے بغیر ہوتا ہی نہ تھا۔ کوئی کتنا ہی اسے ڈانٹے وہ تو محبوب کتا کے پاس جا کر ان سے ہی زری کی ساری بندھواتی۔ اسی لیے اس نے محبوب کو تاکید کر رکھی تھی کہ وہ صحن کے بائیں جانب والے کمرے کو چھوڑ کر کہیں نہ جائے۔ رتنا کے آنے پر محبوب کو یہ لگتا کہ وہ بھی شادی کے کام میں کچھ ہاتھ بٹا رہی ہے۔ رتنا کے جانے کے

بعد پھر وہ خالی خالی سا محسوس کرتی۔ پان سپاری میں بھی اسے کوئی مزا نہ آتا۔ جب وہ اپنا چاندی کا پاندان کھول کر پان بناتی تو اس کے گرد بچوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی' ان کی مائیں نفرت سے ان کو مارتیں اور گھسیٹتی ہوئی اس کے پاس سے ہٹالے جاتیں۔

اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی تھا اور وہ تھا سونے کی جگہ کا۔ پہلے دن سب لوگ تھک کر جس کو جہاں جگہ ملی وہاں پڑ رہا۔ محبوب کو یہ پوچھتے ہوئے شرم آئی کہ وہ کہاں سوئے آخر میں جب اس نے گھر کے پچھواڑے کھلی ہوئی جگہ میں ایک مہری کو سوتے دیکھا تو اس نے بھی اپنی چادر وہیں بچھادی اور اپنا ہرے رنگ کا شال اوڑھ کر سو گئی۔ صبح سویرے اٹھ کر راگھپا نے اس کی شال دیکھ کر اسے پہچان لیا اور آگ بگولا ہو کر بیوی پر گرجنے لگا۔ ایک طرح سے پچھواڑے کا آنگن آرام دہ تھا لیکن راگھپا کے اٹل حکم کی وجہ سے اسے دوسری عورتوں کے ساتھ بڑے ہال کے ایک کونہ میں ہی سونا پڑا۔ وہاں اسے سب لوگوں کی لعن طعن' اور توہین آمیز کلمات برداشت کرنے پڑتے تھے۔

اسے ابھی ایک اور بہت اہم کام انجام دینا تھا اسی وجہ سے وہ یہ باتیں خاموشی سے سہہ گئی۔ شادی کے بعد گونے کی رسم بھی راگھپا کے گھر ہی میں ہونا تھی۔ کیٹی کا گھر بہت چھوٹا تھا اس سے پہلے دیسائی جی کے ہاں انتظام کرنے کی تجویز ہوئی لیکن راگھپا کی ضد کی وجہ سے آخر کار یہی طے پایا کہ گونا اسی کے گھر میں ہوگا۔ اس دن اس کی سیج کو پھولوں سے سجانے کی محبوب کو بڑی آرزو تھی۔ اس کا دل اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سہاگ کے کمرے کو بسانے کے لیے وہ خود اپنے ہاتھ سے ایک خاص قسم کی اگر بتی تیار کر کے بڑی احتیاط سے اپنے چھوٹے سے بکس میں رکھ لائی تھی اور اسی دن کے انتظار میں وہ خاموشی سے یہ سب تکلیفیں برداشت کر رہی تھی۔

ابھی بھیرے پڑنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس نے رتنا کے جوڑے میں گیارہ قسم کے پھولوں سے آدھے چاند کی شکل کا گجرا بنا کر لگایا تھا۔ محبوب جان نے رتنا کو بڑے چاؤ سے سجایا سنوارا اور اس کو اپنے سامنے تھوڑی دور چلا کر دیکھا۔ خوب بناؤ سنگار کرنے کے بعد ہی اس نے رتنا کو مزید رسموں کے لیے جانے دیا۔ اس کام سے فرصت پانے کے بعد اس نے اپنا پاندان نکالا۔ چاروں طرف کے شور وغل اور ہنگامے کی طرف اس کی توجہ ذرا بھی نہ تھی۔ باہر شہنائی نوازوں کو بلایا گیا تھا اور راگ کا الاپ بڑے خوبصورت ڈھنگ سے شروع ہوا تھا۔

محبوب جان باہر کی دیوار کی جانب کنکھیوں سے دیکھتی، پان پر چونا لگا رہی تھی اور محویت کے عالم میں شہنائی سن رہی تھی۔ دھیمے سُر میں کومل الاپ کی دُھن دھیرے دھیرے فضا میں ندی کی لہروں کی طرح پھیل رہی تھی ــــ ارے یہ کیا ــــ یہ بے سری آوازیں کیسی ــــ محبوب جان نے بوکھلاہٹ میں بغیر سپاری کا پان منھ میں رکھ لیا۔ یہ کوئی بے سرا راگ نہیں ہے۔ منڈپ کی طرف سے کوئی تیز آواز آ رہی تھی۔ اتنے میں کسی نے غصے سے شہنائی بند کرنے کو کہا۔ شہنائی بند ہونے سے شور کی آواز صاف صاف سنائی دینے لگی۔

محبوب جان نے نہایت اطمینان سے پاندان کو بکس میں رکھا اور گلے میں ٹنگی ہوئی کنجی سے بکس کا تالا بند کیا پھر بکس پر کہنی ٹکا کر وہ آہستہ سے اٹھی۔ اپنا آنچل درست کیا اور ہچکیاں لیتی ہوئی باہر آئی۔

سب لوگ ایک جھنڈ کی شکل میں منڈپ کی ایک طرف کھڑے تھے۔ ان کے بیچ میں حائل ہونے کی وجہ سے محبوب جان کو آگے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اپنے پاس کھڑی لڑکیوں میں سے ایک سے اس نے معلوم کرنا چاہا تو اس نے منھ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ باقی لڑکیوں سے پوچھا انھیں بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ اتنے میں بھیڑ کو چیرتی ہوئی تمتمائے ہوئے چہرہ والی ایک عورت باہر آ کر منڈپ کے دروازے کی طرف چلی گئی۔ محبوب اُسے پہچان گئی۔ پچھلے دن اس نے کسی شخص کو اسے گنگوا کہہ کر پکارتے ہوئے سنا تھا۔ اسی بھلی مانس نے چمپیا کے نام پر فاتحہ پڑھ دیا تھا۔ اب اسی گنگوا کے پیچھے راگھیا بھی لوگوں کو ہٹاتا ہوا آیا اور گنگوا کو روک کر اپنی پگڑی اس کے پاؤں پر رکھ دی۔ دولہا بھی دوڑا ہوا آیا اور بڑی لجاجت سے بولا "ماں، جاؤ نہیں۔" محبوب ان باتوں کو سمجھ نہ سکی۔ پیچھے سے ایک اور شخص زری کی پگڑی پہنے ہوئے آیا اور وہاں کھڑا ہو گیا۔ گنگوا اس آدمی سے ہاتھ اٹھا اٹھا کر زور زور سے کچھ کہنے لگی۔ لوگوں کے شور و غل میں اس کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا غصہ اور چیخ پکار کچھ کم ہوئی اور وہ گھر کے باہر کے چبوترے پر جا بیٹھی۔ اس کے چاروں طرف آپس میں کھسر پھسر کرتی عورتیں جمع ہو گئیں لیکن وہ کسی کی طرف دھیان دیے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ راگھیا زری کی پگڑی والے کو لے کر آنگن کے پاس والے کمرے میں چلا گیا۔ اتنے میں بھیڑ میں سے ایک بھانڈ نکل کر ادھر آیا۔ محبوب اسے پہچانتی تھی۔ کل ہی اس نے تمبا کو مانگ کر کھائی تھی اور مذاق کر کے گیا تھا۔ محبوب جان نے اسے روک کر پوچھا "کیا ہوا؟"

"ہوتا کیا، تمہارے چاہنے والے کی کرتوت ہے۔"

"کیوں کیا ہو گیا، کچھ بتاؤ تو سہی۔ تمبا کو دیتی ہوں۔"

"ہونا کیا ہے۔ سب کو معلوم ہی ہے۔ ایک ہزار روپیہ بردکشنا دینے کا تحریری اقرار کیا تھا تمھارے گھر والے نے۔ اب جب پھیروں میں ایک گھنٹہ رہ گیا ہے تو کہتا ہے پانچ سو روپیہ اب لے لو باقی آئندہ مہینہ دوں گا۔ اگلے مہینے کون دیتا ہے۔ یہ تو بس راگھپا بھراری کی ایک چال ہے۔"

محبوب نے بوڑھے برہمن کو تمبا کو نکال کر دیا اور اس دوران اس سے اور بھی بہت سی باتیں معلوم کر لیں۔ بیاہ میں خرچ زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بردکشنا کے لیے جو پیسہ الگ رکھا تھا وہ راگھپا نے خرچ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں سے انھیں مزید پیسہ ملنے کی امید تھی وہاں سے پیسہ ملا نہیں۔ بردکشنا کے روپوں میں سے کل سات آٹھ سو روپیہ بچے تھے ان میں سے بھی کچھ روپوں کی دوسرے مصارف کے لیے ضرورت تھی اس لیے راگھپا اپنی سمدھن اور دیسائی جی سے یہ اصرار کر رہا تھا کہ پانچ سو روپیہ فی الحال لے لو۔ وہ کہتا تھا کہ لڑکے کو متبنیٰ کرنے کی قسم میں کھا چکا ہوں اس لیے میری تمام دولت تمہاری ہی ہے پھر ایک مہینہ ٹھہرنے میں کیا حرج ہے لیکن پہلے سے تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ سے بھی اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ راگھپا نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی پھیروں سے صرف ایک گھنٹہ پہلے کیوں کہی، گنگوا اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ مصر تھی کہ ابھی ایک ہزار گن دو گے تو پھیرے پڑیں گے ورنہ نہیں۔ احمق کٹی جب ماں کی خوشامد کرنے گیا تو وہ بگڑ کر بولی:

"مجھے چھوڑ کر تو بیاہ رچالے، میں گھر چلی جاؤں گی۔" راگھپا کمرے میں دیسائی جی سے بات کر رہا ہے ــــ کیسی حماقت ہے ــــ راگھپا بھراری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شادی میں رکاوٹ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے عزتی کی بات۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

محبوب جان نے اپنی ساری جمع پونجی اپنے بھانجے کو کرانے کی دوکان کھلوانے میں لگا دی تھی اور وہ یہاں صرف سو روپیہ شگن کے اور پچیس روپیہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے لائی تھی۔

کمرے میں دیسائی جی کو سامنے بٹھا کر راگھپا کہہ رہا تھا:

"رائے صاحب، گنگوا میرے لیے پرائی ہے کیا۔ کتنا برا یا ہے کیا۔ بہن کو دھوکا دینے کا

میرا ذرا بھی ارادہ نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شادی بیاہ میں ایسا ہو جاتا ہے۔ ہمارا ایک دانت والا ہنومنت بھٹ کل کہہ رہا تھا " راگھوپا، تمہارے گھر کی برات کی دھوم دھام دیکھ کر تو جمکھنڈی کے مہاراج کی شادی یاد آگئی ـــــ کیا کروں۔ خرچ ضرورت سے زیادہ ہو گیا۔ رات جب بکس سے نکال کر پیسے گنے تو صرف آٹھ سو دس روپے نکلے۔ پہلے سوچا کہیں چوری تو نہیں ہو گئی لیکن جب حساب دیکھا تو بالکل ٹھیک نکلا۔ ایک پائی کا بھی فرق نہیں تھا۔ میری بہت سے بڑے بڑے لوگوں سے جان پہچان ہے۔ مبارک کام سمجھ کر کھلے ہاتھ سے خرچ کر دیا لیکن خرچ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہو گیا۔ کل ہی رات آپ کے پاس آنا چاہتا تھا لیکن دس بج چکے تھے اس لیے آپکی نیند خراب کرنے کے خیال سے نہ آیا۔ صبح آپ کے آتے ہی تمام حقیقت آپ کو بتادی، کچھ پوشیدہ نہیں رکھا۔"

"آپ کی بات ٹھیک ہے راگھپا۔ جب آپ میں اور گنگوا میں اَن بَن ہے تو آپ کو شادی کی دھوم دھام کی اتنی پروانہ کرنا چاہیے تھی بلکہ اپنے وعدے کو پورا کرنے کی۔ اس معاملے میں مجھے گنگوا کا کوئی قصور نظر نہیں آتا۔"

" رائے صاحب نینپّا کو بند گوڑہ بھیجا ہے۔ ہنومنت گوپال کے پاس راہپّا کو اور شیٹی کے پاس رام کو دوڑایا ہے۔ اب نو بجے کا مہورت بھلے ہی ٹل جائے لیکن ایک اور بھی اچھا مہورت ہے سوا گیارہ بجے کا۔ ان دو گھنٹوں میں پیسے جمع کرنے کی میں جان توڑ کوشش کروں گا لیکن اگر اس وقت تک بھی انتظام نہ ہو سکے تو کم سے کم سوا گیارہ والے مہورت کو نہ ٹلنے دیجیے گا۔ ایک بار میرا یقین اور کر لیجیے میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ ابھی تو لین دین کے موقعے اور بھی ہیں۔ گونا باقی ہے۔ لڑکی والوں کی نکیل تو ہمیشہ لڑکے والوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ کسی بھی طرح سے اس پریشانی سے مجھے نجات دلائیے۔ مبارک کاموں میں آپ جیسے بزرگوں کو آگے بڑھ کر ہماری عزت رکھنا چاہیے۔"

راگھپا کی طرف سے دیسائی جی کے دل میں کافی بے یقینی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بار انکے دل میں آیا بھی کہ کہہ دیں ہم دیے دیتے ہیں، لیکن ان کو اس پر اعتماد نہ تھا۔ پھر کٹّی کو دینا کچھ اور بات تھی اور راگھپا کو دینا کچھ اور۔ یہ بھی امکان تھا کہ راگھپا کے پاس پیسے موجود ہوں لیکن بے وقوف بنانے کے لیے یہ ڈھونگ رچا رہا ہو۔

راگھپا نے جو کچھ بھی دیسائی جی سے کہا تھا اس میں اگر آدھا جھوٹ تھا تو کچھ سچ بھی تھا۔

راگھپا کے پاس صرف آٹھ سو دس روپے بچے تھے یہ سچ تھا اور یہ بھی سچ تھا کہ اس نے دو ایک جگہ روپیہ مل جانے کی امید میں ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے خرچ زیادہ ہو گیا تھا لیکن یہ بات اسے پندرہ دن پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی۔ ہنومنت گوڑ کے معاملے میں کچھ عرصہ پہلے وہ درمیان میں پڑا تھا وہاں سے کچھ پیسہ ملنے کی امید تھی اور راگھپا اس پر تکیہ کیے ہوئے تھا لیکن اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں سے کچھ بھی ہاتھ لگنے والا نہیں۔ شادی کے تین چار دن رہ گئے تھے کٹی کے ذریعہ راگھپا کو یہ معلوم ہی ہو چکا تھا کہ گنگوا کا ایک ہزار روپیہ دیسائی جی کے پاس جمع ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد اس کے دل میں آیا تھا کہ وقت پر ان لوگوں سے کہہ دوں گا کہ پیسے کا انتظام نہیں ہو سکا اور ربرد کشنا کی رقم میں سے پانچ سو روپیہ کم کراوں گا۔ کٹی ویسے تو بھلا لڑکا ہے لیکن ہزار روپیہ بردکشنا دیے جانے کا اہل نہیں ہے۔ اگر گنگوا نے اصرار کیا تو پھر دیدوں گا کہہ کر اسی کو نیچا دکھا دوں گا۔ اس طرح سب اسی کو ٹھوکیں گے ـــ ہو سکا تو دیسائی جی کو درمیان میں ڈال کر دس پانچ دن کے وعدہ پر ان سے ہی پانچ سو روپیہ قرض لے کر دے دوں گا۔ اگر دیسائی جی نے کٹی کے ایک ہزار روپیہ اسے لوٹانے میں آنا کانی کی تو یہ پانچ سو روپیہ اس وقت ان کی گردن دبانے کے کام آئیں گے۔

شادی کی دھوم دھام سے متاثر مہمانوں کو ان حالات کا پتہ چلنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا لیکن گنگوا کے دل میں پتہ نہیں کیوں کچھ شک پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے پھیروں سے ایک دن پہلے دیسائی جی کے گھر جا کر یہ بات اٹھائی: "گوپنا، بردکشنا کے معاملے میں اگر وہ کچھ کمی بیشی کرے گا تو میں چپ رہنے والی نہیں ہوں۔ یہ کان کھول کر سن لو۔"

"گنگوا، بیاہ کی تیاری کا رنگ ڈھنگ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہزار روپیہ دینے میں کوئی ہیر پھیر نہ کرے گا"

"اس کی شان و شوکت کیا مجھ سے چھپی ہے گوپنا۔ سب کچھ ہے۔ کرتا بھی ہے۔ جی چاہے گا تو اپنی داشتہ پر بھی پیسہ لٹا دے گا لیکن ہمارے ساتھ ایمانداری برتے گا اس بات کا مجھے یقین نہیں۔ میری بے عزتی کرنے کے لیے وہ ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ منتی کرنے کی بات پر گنگوا جھک گئی، سب سے اس بات کی ڈینگ مارتا پھرتا ہے میں بے عزتی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر کسی بھی بات میں کمی بیشی ہوئی تو میں صاف کہہ دوں گی "کٹی اگر واقعی تو میرا بیٹا ہے تو منڈپ چھوڑ کر میرے ساتھ چل" اس پر بھی اگر وہ نہ آیا تو میں اکیلی چل دوں گی۔ اگر میرے بغیر

شادی کرتا ہے تو شوق سے کرلے۔"

گنگوا نے جیسا کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ گنگوا کی اس گفتگو کے اثر سے ہی انھوں نے راگھپا کو روپیہ قرض دینے کی پیش کش نہیں کی بلکہ اس کی بات کا دو ٹوک جواب دیا "راگھپا اس معاملہ میں اب میری ذمہ داری ختم ہو گئی۔"

راگھپا کو بات ہاتھ سے نکلتی دکھائی دی اس لیے اس نے اشاروں میں قرض کی بات اٹھائی "رائے صاحب آپ سمجھ دار ہو کر ایسی بات کر رہے ہیں۔ میں اور آپ دونوں مل کر کوئی راستہ نکالیں گے۔ دو جگہ پیسوں کے واسطے آدمی بھیج رکھے ہیں لیکن میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ اس مبارک کام میں رکاوٹ نہ پڑنی چاہیے۔ میں تو ہمیشہ آپ کے اختیار میں ہوں آپ کے سوا اور کون میرا ہے" اس کھلے اشارے کے بعد دیسائی نے اور بھی چپ سادھ لی۔ راگھپا نے مجبور ہو کر بہن کو آنگن میں بٹھایا۔ وہ سوا گیارہ بجے تک انتظار کرنے کو تیار ہو گئی۔ مہمان لوگ وقت پر آگئے۔ کمٹی بھی ماں کی ضد سے اپنی توہین محسوس کر کے جھلاہٹ میں جارج کے ساتھ چائے کی دوکان پر جا بیٹھا۔ مہمانوں کو بٹھا کر راگھپا ان کے لیے چائے کا انتظام کرنے باورچی خانے کی طرف گیا۔ وہاں روتی ہوئی چمپکا اس پر برس پڑی۔ باہر آیا تو بارانیوں کی گفتگو سن کر اس کا دل اداس ہو گیا۔ اتنے میں شیٹی سے روپیہ لینے گیا ہوا رام سامنے سے واپس آتا دکھائی دیا۔ وہ دور ہی سے شیٹی کی کہی ہوئی باتیں زور زور سے دہرانے لگا: "اس نے کیسے پانچ سو روپیہ کا پھٹکر قرض مانگ بھیجا ہے۔ پرسوں ہی تو تین سو روپیہ لے گیا ہے۔ کیا بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔" ذرا توقف کر کے رام پھر بولا "شیٹی نے آپ کو ہی بلایا ہے۔"

راگھپا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود پھنس رہا ہے۔ ہنومنت گوڑ کے پاس گئے ہوئے تپنّا کو اگر موٹر مل گئی تو اس کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ اور لگ جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ شیٹی نے اسے کھری کھری سنانے کے لیے بلایا تھا۔ دیسائی جی تو جال میں پھنسے نہیں۔ اس شور و غل سے اگر وہ دس منٹ کو باہر نکل جائے تو کوئی ترکیب دماغ میں آسکتی ہے یہ سوچ کر اس نے شیٹی کے پاس جانے کے لیے کوٹ اور پگڑی سنبھالی۔

راگھپا منڈپ سے باہر آیا ہی تھا کہ ایک تانگہ تیزی سے آکر دروازے پر رکا۔ تانگے میں محبوب جان بیٹھی تھی۔ وہ اپنے بھاری بدن کو پھرتی سے سنبھالتے ہوئے "اللہ اللہ" کہتی ہوئی تانگے سے اتری، راگھپا کو سامنے آتا دیکھ کر اس سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا: "آپ

کہاں جارہے ہیں؟"

راگھپا اپنی بے عزتی کا حال اُسے بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس کو تانگے سے اترتا دیکھ کر اسے یک گونہ اطمینان سا ہوا تھا کہ چلو اچھا ہوا یہ فضیحتے کے وقت یہاں موجود نہیں تھی۔ بات کو بدلنے کی خاطر اس نے اتنا ہی کہا "تم کہاں گئی تھیں؟"

محبوب بولی "ذرا اندر تو چلیے" اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے اندر چلی گئی۔ راگھپا یہ کہنے کو تھا کہ ذرا کام نمٹا کر آتا ہوں لیکن وہ جا چکی تھی وہ بھی اندر چلا گیا۔

محبوب نے کمرے میں پہونچتے ہی اپنے چھوٹے سے بکس کو کھولا اور اس میں دس دس روپے کے دس نوٹوں کی گڈی نکالی۔ پھر اس نے اپنے بلاؤز میں سے کاغذ کا ایک پیکٹ نکالا۔ اس کو کھول کر دیکھا اور بکس سے نکالے ہوئے نوٹ بھی اس میں رکھ دیے اور راگھپا کا انتظار کرنے لگی جیسے ہی راگھپا اندر آیا محبوب نے اس سے کہا "ذرا بہن جی کو تو بلائیے" راگھپا نے حیران ہو کر ایک بچے کو آواز دی اور اس سے کہا "اُسے بلا لا رے" پھر محبوب سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "محبوب .... کیوں.... کیا کر آئی؟"

محبوب نے کوئی جواب نہ دیا۔ چمپکا کی راہ دیکھنے لگی۔ اُسے یاد آیا کہ چمپکا نے کچھ عرصہ پہلے ایک بار جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا اسے پورا کر کے آج اس قرض کے ادا کر دینے کا وقت آپہنچا تھا۔ چمپکا کے اندر آتے ہی محبوب نے وہ پیکٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا "دیدی، یہ شگن سنبھالیے۔ چمپکا نے لفافے کو کھول کر دیکھا اور دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس میں سو سو کے چار اور دس دس کے دس نوٹ تھے۔

محبوب راگھپا کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے اگربتیوں کا وہ بنڈل دیا جواب تک اس نے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "محبوب کیا کر آئی ہو سچ سچ کہو" راگھپا نے رُندھی آواز میں کہا۔

چالاک محبوب فوراً بول پڑی "کیوں؟..... میں نے تو شگن دیا ہے۔ کیا شگن واپس کر دو گے؟"

نو بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ زیادہ سوال جواب کرنے کا وقت نہ تھا۔ راگھپا کا دل ایک نامعلوم غم سے بھر گیا تھا۔ اُدھر لالچی چمپکا کے منہ سے شکریے کے الفاظ نکل رہے تھے لیکن اس بوجھل فضا میں کلام سے زیادہ سکوت کی ضرورت تھی۔ نو بجے پھیرے پڑیں گے۔ راگھپا نے زور سے

اعلان کیا۔ اس کی آواز سے سارا پنڈال گونج گیا۔ دیسائی جی کے سامنے ایک ہزار روپیہ گن دیے گئے۔ چائے کی دوکان سے کٹّی کو بلایا گیا۔ چائے کے لیے رکھا گیا پانی باورچی خانے میں ہی دھرا رہ گیا۔ پھیرے پڑنا شروع ہوئے۔ منتروں کی آواز آنے لگی۔ سب لوگ اسی جگہ پر جمع ہو گئے۔ اس شور و غل میں راکھیا کو محبوب جان سے یہ پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا کہ اگربتیاں اس نے کس واسطے دی اس ہنگامے میں محبوب پیچھے ہی کھڑی رہ گئی۔ اُسے دولہا دولہن پر آشیرواد کی کونپلین ڈالنے کی بڑی خواہش تھی۔ اس کو یہ یقین تھا کہ اگر اس کی کونپلیں دولہا دولہن پر جا کر سیدھی گریں تو اس کا آشیرواد پورا ہوگا لیکن اس بھیڑ میں گھس کر آگے پہونچنا اس کے بس کا نہ تھا۔ دوسرے اسے چھوت چھات کا بھی ڈر تھا۔ پھر اس نے سوچا بھیڑ چھٹ جائے گی تو وہ شگن پورا کرلے گی اتنے میں برہمنوں نے آخری منتر پڑھا۔ یہ سن کر سب نے اپنے اپنے اکشت دولہا دولہن پر ڈال دیے۔ وہ پھر بھی آگے نہ جا سکی اور وہیں سے زور لگا کر نشانہ باندھ کر اپنے اکشت پھینک دیے اس کے پھینکے ہوئے اکشت کچھ شریر لڑکوں کے سر پر جا کر گرے۔ محبوب جو پہلے ہی اداس تھی اس سے اور بھی زیادہ اداس ہو گئی۔ جانے سے پہلے وہ راکھیا کو یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ اگربتی سہاگ کی سیج کے پاس جلائے لیکن وہ بھیڑ کے اندر تھا ادھر تانگے والا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اکشت کی رسم کے بعد اس نے نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ محبوب نے تانگے والے سے اپنا بستر اور بکس اٹھوایا اور تانگے پر بیٹھ کر چلی گئی۔ شور و غل میں اس کے جانے کا پتہ کسی کو نہ چلا۔ اس کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد چمپکا نے کھانے کے لیے اسے سارے گھر میں تلاش کیا۔

اُسی شام شادی کی شہنائی سے بھی بڑھ کر زور زور سے بجنے والا ایک بینڈ باجہ اس گھر کے سامنے سے گزرا۔ چبوترے پر ایک دانت والا ہنومنت بھٹ گپوں میں مشغول تھا۔ اس کے ہاتھ میں کسی نے ایک اشتہار دے دیا۔ اس کو پڑھتے ہی وہ تیزی سے اندر گیا اور وہ اشتہار راکھیا کی طرف بڑھا دیا۔ راکھیا نے بے دلی سے اشتہار پڑھنا شروع کیا لیکن جب وہ اس کے آخری حصّہ کو پڑھنے لگا تو اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اشتہار یہ تھا:

”شری کل دیوتا پرسی دتو

شری شیشائی ناٹک کمپنی ہبلی کیمپ دھارواڑ کمپنی آپ کی خدمت میں شری بسویشور کے میلے کے موقع پر مندرجہ ذیل ناٹک پیش کر رہی ہے۔

آج سے تین دن تک	دین کیٹش پاری جات
آگے " " "	گل بکاولی
" " "	رکمنی ہرن
" " "	گاندھی ٹوپی سنگل چائے
" " "	ساتھ رہوں گا

اہم اعلان: اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ آگے کا پروگرام پھر بتایا جائے گا مکرر کہنے پر تعمیل گانا گانے والی کی مرضی پر۔

خاص طور پر اس میلے کے لیے ہبلی کی مشہور گلوکارہ محبوب جان مرج کران سبھی ناٹکوں میں ہیروئن کا رول ادا کریں گی چھ سال کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر دھارواڑ کے شائقین کے سامنے اپنا سریلا سنگیت پیش کریں گی۔ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

مقام: وشویشور مندر کے پیچھے اپنے ذاتی شامیانوں والا تھیٹر۔

المشتہر
پرمیشور بھٹ، مالک
شیشائی ناٹک کمپنی

راگھپا پسینہ پسینہ ہوگیا۔ اسے یہ امید نہ تھی۔ محبوب کی عمر کافی ہوگئی تھی۔ بدن بھی بھاری ہوگیا تھا اسے ہچکیوں کی بھی شکایت تھی۔ ناٹک کی محنت کو برداشت کرنے کی طاقت اب اس میں نہ تھی۔ راگھپا نے اس کو ناٹک میں حصہ لینے کے لیے منع کیا تھا اس کی صرف ایک وجہ نہ تھی۔ چھ سال قبل وہ اسی کمپنی میں کام کرتی تھی۔ اس وقت ہبلی میں جانوروں کے میلے کے موقع پر ایک بار لگاتار دس گیارہ دن بغیر آرام کے اور بغیر سوئے ہوئے اس نے کام کیا اور آخر ایک دن ناچ گا کر فارغ ہوئی تو فوراً اسے الٹی ہوئی اور وہ چکر کھا کر گر پڑی اس کے بعد ہی اس کو ٹائیفائڈ ہوگیا اور وہ ایک مہینے تک پلنگ پر پڑی رہی۔ مالک کمپنی پرمیشور بھٹ کو ایک عجیب عادت تھی۔ وہ بہت ملنسار آدمی تھا اور بہت متواضع تھا۔ اچھے آرٹسٹ اس کے ہاتھ پڑ جاتے تو وہ نہ صرف انھیں زبردستی کھلاتا بلکہ پینے پر بھی زور دیتا۔ ناٹک ختم ہوتے ہی سب کو اکٹھا کر کے گھنٹہ آدھ گھنٹہ ان سے گپیں کرتا اور پلاتا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ اچھے آرٹسٹوں کو

اپنے پاس بنائے رکھنے یا نیند خراب ہونے پر بھی دوسرے دن ناٹک میں حصہ لینے کا جوش قایم رکھنے کے لیے۔ چاہے جو بھی ہو وہ اس بات پر بہت زور دیتا تھا۔ محبوب کو بھی تھوڑی پینے کی ضرورت پڑتی لیکن اس کے اصرار پر کبھی کبھی بہت پی جاتی اس کی وجہ سے اس کی سانس پھولنے لگی اور ہچکیاں آنے لگیں۔ جب راگھیا کو پتہ چلا تو اس نے اپنی عاشقی بالائے طاق رکھ کر اسے ناٹک میں حصہ لینے سے منع کر دیا۔ اس طرح چھ سال بیت گئے تھے۔ محبوب پہلے کے مقابلے میں موٹی ہوگئی تھی اور اتنی محنت اب اس کے بس کی نہ تھی۔ پہلے سے ہچکیاں بھی زیادہ آنے لگی تھیں۔ ایسے میں اس کے لیے پانچ سو روپیہ کا انتظام کر کے کیا اُسے اپنی جان کی بازی لگانی ہو گی۔

راگھیا سارا کام کاج ویسے ہی چھوڑ اور تانگہ کر کے گرانڈ ہوٹل پہونچا اور ناٹک کمپنی کے مالک پرمیشور بھٹ سے ملا۔ پرمیشور محبوب کو سامنے بٹھا کر پدماوتی کا پارٹ سن رہا تھا۔ متعدد بار کھیلے اس ناٹک میں چھ سال کی مدت گزر جانے کے سبب محبوب مکالمات میں، کچھ آگے پیچھے کر جاتی تھی۔ ایک ہی لفظ سے شروع ہونے والے دو مکالموں میں وہ کبھی ایک کو دوسرے کی جگہ بول جاتی۔ تکرار والے جملوں کی ادائیگی میں غلطی کر جاتی مگر اسے پرامپٹر کے ذریعہ یاد دلایا جا سکتا تھا پارٹ یاد کرنے میں محبوب غبی نہ تھی لیکن مطلب نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ایک لفظ کی جگہ دوسرا استعمال کر جاتی۔ اس بات کو سمجھنے والا پرمیشور بھٹ ایک تجربہ کار مبصر کی طرح اس سے تمام مکالمات دھیمی آواز میں سن رہا تھا اور جہاں ضرورت پڑتی وہاں اس کو بتا تا جاتا۔ محبوب جیسی تجربہ کار آرٹسٹ کی مکالموں کی ریہرسل کے ان تین چار گھنٹوں میں ہی مکالمات کی ادائیگی میں کافی سدھار پیدا ہو گیا تھا۔ آڑی مانگ نکالے، پھولدار ساری پہنے بیٹھی محبوب کے چہرے پر اسٹیج کی پدماوتی کی تمام کیفیات طاری تھیں۔

راگھیا کمرے میں گھستا چلا گیا۔ پرمیشور بھٹ راگھیا کو بہت احترام کرتا تھا اور اس سے ڈرتا بھی تھا۔ ویسے اس نے احتیاطاً محبوب سے کاغذوں پر دستخط کرا لیے تھے لیکن اگر اس کے باوجود راگھیا محبوب سے گھر چلنے کو کہتا تو قصہ وہیں ختم ہو جاتا اور کاغذات دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ راگھیا ضرورت پڑنے پر عدالت کچہری تک پہونچ سکتا تھا اور رکاوٹ بھی کھڑی کر سکتا تھا اس لیے بھٹ نے خوش دلی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اس سے بیٹھنے کو کہا لیکن راگھیا کھڑے کھڑے غصہ سے گرج کر بولا ''اے بھٹ، میں تمہارے ساتھ بات کرنے نہیں آیا ہوں۔ اس وقت محبوب تمہارے ہاتھ آ گئی ہے ٹھیک ہے، لیکن اگر تم نے اسے شراب پلائی تو میں دو دن

میں تمہیں شہر سے بھگا دوں گا اور تمہارے ڈیرے تمبو پھکوا ڈالوں گا، سمجھ گئے؟"

پچھلی بار جب محبوب بیمار ہوئی تھی تو راگھپا نے جوڑ توڑ کر کے بھٹ کا لائسنس منسوخ کروا دیا تھا۔ بھٹ کو یہی بات بہت غنیمت معلوم ہوئی کہ وہ محبوب کو لیے نہیں جا رہا تھا ورنہ ناٹک کا ستیاناس ہو جاتا تا چنانچہ وہ خوشی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا "ارے ارے راگھپا یہ کیسی باتیں کرتے ہو۔ محبوب جان آپ کی امانت ہے۔ جیسا آپ کا حکم ہو گا ویسا ہی کروں گا۔ اس کے طلب کرنے پر بھی نہ پلاؤں اس سلسلے میں بھی واضح ہدایت دیتے جائیے۔"

"وہ جتنی مانگے اتنی دو لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر اصرار کر کے اسے پلائی ہے تو تمہاری ایسی درگت بناؤں گا کہ یاد کرو گے۔"

محبوب سے بات کرنا تو درکنار اس سے آنکھ ملانے کی بھی راگھپا کو ہمت نہ ہوئی اور وہ پرمیشور کو یہ تنبیہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

محبوب کے رہنے سے شادی کا گھر بھرا پرا سا لگتا تھا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد گویا شادی کے گھر کی رونق ہی کم ہو گئی۔ عاشق مزاج بھٹ اور شریر نوجوانوں کو مذاق کرنے کے لیے کوئی نہ رہا۔ عورتوں کو اپنا غصہ اتارنے کے لیے اب کوئی نہ تھا۔ چھوت چھات کرنے والی بیوائیں بھی کہنے لگیں "اُس کے رہنے سے سارا پنڈال بھرا بھرا سا لگتا تھا اس کے جانے سے بھائیں بھائیں کرنے لگا ہے۔ بے چاری دلہن بھی کپڑے پہنتے وقت اسے یاد کرتی۔ لڑکیاں محبوب کو ملنسار کہتیں تو چمپکا اپنی توہین محسوس کرتی اور راگھپا کا جوش خروش تو کم ہو ہی گیا تھا۔ محبوب اس کی محبت اور فخر دونوں کا مرکز تھی۔ اس کے جانے سے اس کی ساری قوت گھٹ گئی۔ رات کو نیند ٹھیک سے نہ آتی۔ شادی کے پنڈال کی رونق ہی غائب ہو گئی تھی۔

20

کٹی کی ازدواجی زندگی

بہو گھر آ گئی۔ گھر بھر گیا۔ گنگو انے پیار سے اس کا خیر مقدم کیا۔ جہاں تک ہو سکا اس نے اپنی بیزاری ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے دیبائی جی کی نصیحت پر عمل کرنے کی پوری کوشش

کی بہو کی چھوٹی موٹی غلطیاں سامنے آئیں تو وہ اپنا ہی دل ٹٹولتی کہ کہیں اسے راگھیا سے رنجش کے سبب تو لڑکی میں یہ عیب نظر نہیں آرہے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے حالات میں تبدیلی کے پیش نظر اُسے اپنے تفکرات چھوڑنا پڑے۔ شروع شروع اُسے کچھ دکھ بھی ہوا.....
کٹی نے تین چار سال سے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی تھی۔ گھر پر زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ بیوی گھر پر آئی تو گویا اس کی زبان کھل گئی۔ وہ بیوی کے ساتھ راز و نیاز کی خوب باتیں کرتا لیکن گنگوا کو اب بھی نظر انداز کر دیتا۔ گنگوا کے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ دو مہینے کے اندر ہی بہو کا اثر بیٹے پر دکھائی دینے لگا۔ اس کو محسوس ہوا کہ بہو کی وجہ سے ہی کٹی نے گھر پر بات چیت کرنا شروع کی ہے اس نئی صورت حال سے سمجھوتہ کرنا گنگوا کو بہت مشکل معلوم ہوا۔ اسے اپنی زندگی ہیچ معلوم ہونے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کھو بیٹھی ہو۔ اس کے دل میں بے شمار وسوسے پیدا ہوتے یا پھر وہ اپنے دل و دماغ میں ایک خوفناک خلا سا محسوس کرتی۔ بہو کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی اس نے ایک اور تدبیر سوچی۔ دو چار دن اسے ساتھ لے کر پرانی سہیلیوں سے اس کی ملاقات کرا لائی لیکن بہو کی بدمزاجی پھر کچھ دن میں عود کر آئی۔ باپ کے متعلق اگر کچھ پوچھا جاتا تو رتنا اس کا غلط مطلب نکال کر فوراً برافروختہ ہو جاتی اور اپنی جھنجھلاہٹ کا صاف صاف اظہار کر دیتی۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ کسی کے گھر سے واپس ہوتے ہوئے اس کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے "بہو بہت تیز ہے۔ بہو بہت زبردست ہے"، یہ کلمات سن کر رتنا اور بھی تیکھی ہو گئی۔ ایسے ہی بے شمار چھوٹے موٹے واقعات گنگوا کی آشفتگی کو بڑھاتے رہے۔ چھوٹا سا گھر، بے شمار دقتیں، ایک ہی کمرہ اور رسوئی والا گھر۔ اب وہ سیلی ہوئی رسوئی میں تین تختے برابر برابر رکھ کر ان پر ہی اپنا بستر لگا لیتی تھی لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے اسے کٹی کے کمرے کے قریب سونا دوبھر ہوتا گیا۔

گھر میں معمولی معمولی باتوں پر جھگڑے پیدا ہونے لگے۔ رتنا کو اپنی ماں سے گنگوا کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا تھا اس کی بنا پر اس نے گنگوا کا ایک بھیانک تصور قایم کر رکھا تھا۔ گنگوا کے لیے رتنا کے دل میں آدھا خوف تھا اور آدھی نفرت۔ پانچ سو روپیہ کے لیے شادی میں رکاوٹ ڈالنے والی بدشکل بڑھیا کے بارے میں اس لڑکی کے دل میں اور کیا جذبات ہو سکتے تھے۔ شروع شروع میں گنگوا اسی کے فائدے کے لیے اگر کوئی بات بتاتی تو وہ اس کا الٹا مطلب نکال کر دل میں جلا کرتی لیکن گنگوا کے سامنے زبان نہ کھولتی تھی کیونکہ چمپا نے رخصتی کے وقت آنکھوں

میں آنسو بھر کر اُسے یہ نصیحت کی تھی کہ وہ چاہے کچھ بھی کرے تم جواب مت دینا۔ ماں کی اس نصیحت کو بھولنے کے لیے ایک ڈیڑھ مہینہ تو درکار ہی تھا۔ شروع شروع گنگوا کی اچھی باتوں کے متعلق بھی وہ سوچتی "کہیں ان میں طنز تو نہیں" اکثر بلا سبب یہ فرض کر کے کہ ان باتوں میں طنز ہے وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ اگر بظاہر ان باتوں میں طنز کا کوئی شائبہ نظر نہ آتا تو یہ سمجھتی کہ شاید وہ بات کی گہرائی تک نہیں پہونچ سکی۔ یہ سوچ کر اس کا ڈر اور بھی بڑھ جاتا۔ جب بھی وہ گنگوا سے بات کرتی تو مدافعت کرنے کے انداز میں بات کرتی۔

"رتنا، نئی ساری پہن کر چوکا برتن نہ کرنا۔"

"باہر پھٹی ساری پہن کر برتن مانجھوں، ٹھیک ہے کل سے ایسا ہی ہوگا۔"

"رتنا، نمک اس طرف مت رکھا کرو۔"

"آپ جہاں کہیں گی وہاں رکھ دوں گی، بیچ میں کھسکا دوں۔"

"رتنا، رسوئی میں کنگھی نہ کرو۔ کھانے میں بال پڑ جائیں گے۔"

"باہر وہ بیٹھے ہیں، وہاں کنگھی کرنے کو کہتی ہیں تو کر لوں گی۔"

اس قسم کی بات چیت کا غلط مطلب نکالنے کی وجہ سے پیدا شدہ غلط فہمی کی فضا نے رفتہ رفتہ ساس بہو کے درمیان فاصلے کو اور بھی بڑھا دیا۔ گنگوا نے شروع میں اس سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اسے ماں کہہ کر پکار سکتی ہے لیکن رتنا نے ایک بار بھی اُسے ماں یا بوا کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ جب کبھی اسے گنگوا کو پکارنے کی ضرورت پیش آتی تو وہ اس کے قریب جا کر زور سے کہتی "بھنڈی کاٹوں یا کچھ اور، چولہے میں آگ جلا دوں،" وغیرہ وغیرہ۔ رتنا اتنی زور سے چلا کر یہ باتیں کہتی جیسے وہ کسی بہرے سے بات کر رہی ہو۔

اس طرح زہر کی وہ دھار جو اب تک پوشیدہ تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرح نمودار ہوئی کہ کسی کے روکے نہ رک سکی۔ ایک دن گنگوا آہستہ سے بولی "کتنا ہری توری بازار میں آگئی ہے۔ ایک دن لے آؤ نا، سبزی بنائیں گے" میاں بیوی دونوں نے ہی گنگوا کی اس بات کو سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پچھلی رات کو یہی بات رتنا نے شوہر کے کان میں کہی تھی اس نے کٹی سے کہا کہ اس کے میکے میں 'توری' کی سبزی بنی تھی، ان کے گھر میں بھی وہ پکنی چاہیے۔ اچھی مزیدار سبزی ہوتی ہے۔ سب باتیں کٹی کو تفصیل سے بتائی تھیں۔

گنگوا کی بات کا کٹی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رسوئی میں کھڑکی نہ ہونے کے سبب

رات میں گرمی ہونے کے باوجود گنگوا کمرے کے دروازے سے کافی دور ہٹ کر بالکل چولھے کے پاس سوتی تھی لیکن اس دن اتنا دور ہونے پر بھی ان کی کھسر پھسر اس کے کانوں میں پڑ گئی۔
"دھیرے بولیے، دروازہ کے سوراخ میں سے سنتی رہتی ہے۔"

گنگوا کو ساری رات نیند نہ آئی۔ اگلے دن وہ یہ عذر کر کے کہ باورچی خانے میں بہت گرمی ہوتی ہے اپنا بستر کاشی کے ماں کے گھر لے آئی۔ "اس نے رات بھر کو تو گھر چھڑوا دیا ہے۔ اب دیکھو دن کے لیے کیا شاخسانہ کھڑا کرتی ہے۔" یہ سوچ کر اداس ہوتی ہوئی گنگوا کو دیسائی جی کی بات یاد آئی اور وہ خاموش رہنے لگی۔ اس نے اپنے دل کو سمجھایا، ناخن سے کبھی گوشت جدا نہیں ہو سکتا۔

رتنا کو جہاں ورثہ میں اپنی ماں کا حسن اور کچھ دوسری خوبیاں ملی تھیں وہیں راگھیا کی بھی کچھ باتیں اس میں موجود تھیں۔ بظاہر سیدھی معلوم ہونے پر بھی وہ چالاک تھی اور راگھیا کی طرح اپنی چالاکی کا استعمال بھی کرنا جانتی تھی۔ اس رات کی بات اس کی چالاکی ہی کی پیداوار تھی۔ اس نے جو نشانہ لگایا تھا وہ خطا نہیں ہوا حالانکہ شوہر اس بات کو سمجھ نہیں پایا۔ اپنی اس کامیابی پر وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ اسے اس بات پر فخر کا احساس ہوا کہ ساس کا مقابلہ کرنے کے قابل تیز عقل بھی بھگوان نے اسے دی ہے۔ گنگوا نے بھی بہت سے گھروں کی بہوئیں دیکھی تھیں اس لیے اسے رتنا میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ اس بات کا دکھ البتہ ہوا کہ رتنا بھی عام بہوؤں جیسی نکلی۔ اس الجھن کا بھی اُسے خود ہی حل نکالنا تھا منھ کھولنے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔

جب سے وہ کاشی کی ماں کے گھر سونے لگی تھی نئی مشکلات پیدا ہونے لگی تھیں۔ گنگوا کو صبح پانچ بجے اٹھنے کی عادت تھی۔ آواز دے کر دروازہ کھلوانے میں آدھا گھنٹہ لگ جاتا۔ اتنی جلدی جگائے جانے پر کٹی بڑبڑاتا۔ پھر محلے کی عورتیں اُسے گھر کا دروازہ پیٹتے دیکھتیں تو ہنستیں اور اس کا مذاق اڑاتیں۔ گنگوا کے لیے یہ تمام باتیں برداشت کرنا ناممکن سا ہو گیا۔ سیدھی سادی لکشو بائی ستابائی تک نے ایک دن یہ کہہ دیا، "بہو کے آجانے پر ساس کا یہی حشر ہوتا ہے۔" اس پر بھی گنگوا کا گھمنڈ نہیں ٹوٹا۔ حقیقت میں اگر بہو اس کے اختیار میں ہوتی تو وہ ان لطیفوں سے لطف اندوز ہو سکتی تھی لیکن یہ سوچ کر کہ اصلیت کا تو کسی کو علم ہی نہیں وہ چڑ جاتی تھی۔

آخر تنگ آکر اس نے باہر سے تالا لگا کر جانا شروع کر دیا اور کٹی کو بھی اس سے باخبر کر دیا۔ وہ باہر سے تالا لگا دیتی اور چابی اپنے ساتھ لے جاتی کچھ دن چین سے گزر گئے لیکن ایک دن چابی کہیں گر گئی۔ گنگوا ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک گئی لیکن چابی نہیں ملی۔ آخر کار تالا تڑوانے کی نوبت آئی۔ تالا لوہے کا تھا اور بہت مضبوط تھا اس کے ٹوٹنے میں پورے چار گھنٹے لگ گئے اس واقعہ پر کٹی نے گنگوا کو جو پہلے ہی سے رنجیدہ تھی، رتنا کے سامنے ہی خوب لتاڑا جس کے باعث اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

بہو کے ساتھ اندرون خانہ چلتی ہوئی چشمک نے اب باقاعدہ لڑائی کی شکل اختیار کرلی۔ رتنا جب یہ محسوس کرتی کہ وہ حق پر ہے تو خوب جواب دیتی ورنہ کسی کونے میں جا کر خوب روتی۔ حال ہی میں رتنا ایک دن دوپہر کو میکے گئی تو شام کو گھر واپس آئی۔ گنگوا نے یہ بات ایک دن کٹی کو بتانا چاہی لیکن اسی شام اس نے تانگے میں کٹی کو بھی اس کے ساتھ ہنسی خوشی واپس آتے دیکھا۔ اس طرح گویا اب میکے جانے کے لیے اسے کٹی کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ ایک اسی معاملے میں نہیں ہر بات میں وہ شوہر کی مدد سے ساس پر فتح پانے لگی۔ تیوہاروں پر اب وہ پاس پڑوس کے لوگوں کو بلانے سے بھی منع کرنے لگی۔ ایک دن کٹی نے زور دے کر اسے دیبائی جی کے یہاں بھیج دیا تاکہ وہ ہلدی کم کم کی رسم کے لیے وینو بائی کو بلا لائے۔ وینو بائی نے اسے دیکھتے ہی نہایت صفائی سے کہہ دیا "کیوں ری، تو ساس کی برابری کرتی ہے۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں تجھے تو اسے ماں کی طرح رکھنا چاہیے" یہ سن کر کماؤ شوہر رکھنے والی رتنا کو اپنی توہین محسوس ہوئی۔

اگلی بار جب وینو بائی نے رتنا کو پان پھول[1] کے لیے بلا بھیجا تو وہ کٹی کے اصرار کے باوجود وہاں نہ گئی۔ پاس پڑوس میں وہ کسی سے بات نہ کرتی۔ کٹی اگر کچھ کہتا تو وہ اپنی ماں کی کہی ہوئی بات دہرا دیتی "یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ تمہارے برسر روزگار ہونے کے باوجود ہمارے اس گھر میں رہنے کی وجہ سے سب لوگ ہمارا ہی مذاق اڑاتے ہیں اور ہمیں چھوٹا سمجھتے ہیں۔ آپ تو کہیں اور مکان تلاش کیجیے۔"

ایک دن رتنا حد سے تجاوز کر گئی۔ کہنے لگی "میاں بیوی کا پیار دیکھ کر لوگ جلے جاتے

---

[1] جنوبی ہند میں سہاگن کو ہلدی، اور سبز دار پان پھول وغیرہ دینے کی رسم۔

ہیں۔ اس رات گنگوا نے کھانا نہیں کھایا۔ کٹی نے بیوی کو پیٹا۔ وہ ساری رات روتی رہی۔ شوہر کے تسلی دینے پر وہ بولی "بوا جی کہہ رہی تھیں میں نے شوہر پر جادو کر دیا ہے۔ اسی لیے میں نے انہیں جواب دیا" کٹی کے لیے ان کے جھگڑوں میں منصف کا کردار ادا کرنا مشکل تھا دونوں دو متضاد خصائل کی نمائندگی کر رہی تھیں اور دونوں اپنے موقف سے سر موہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ گنگوا اپنے بیٹے کے سامنے چیخ چیخ کر گلا سکھا لیتی لیکن رتنا ان سب باتوں کا صرف اتنا جواب دیتی "بات یہ ہے کہ میں بند گوڑہ کے راگھپا کی بیٹی ہوں۔ مجھ پر آپ کو کیسے بھروسہ ہو سکتا ہے" یہ کہہ کر رونا شروع کر دیتی اور اس طرح فتح اسی کے ہاتھ رہتی۔ نالایق کٹی اس کے رونے میں آجاتا اور اس کی موافقت میں فیصلہ دیتا۔ اس نے ایک دن اپنی بیوی کے سامنے اپنی ماں کے احسانات کے متعلق ایک تقریر کر ڈالی۔ اس کا رتنا نے صرف اتنا جواب دیا "میرے ماں باپ کی پرانی باتوں کولے کر میرے اوپر انگارے برساتی ہے۔ کیا تم نے مجھ سے اس لیے شادی کی ہے کہ تمہاری ماں مجھے مار ڈالے، تم بھی ان کی حمایت کر کر کے انھیں اور ڈھیل دیتے رہو تاکہ میں کنویں میں کود کر جان دینے پر مجبور ہو جاؤں۔"

ان سبھی لڑائی جھگڑوں کے باوجود گنگوا نے ایک بہت سخت عہد کر رکھا تھا اور وہ یہ تھا کہ "کچھ بھی ہو جائے وہ کٹی کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ بہو کا ظلم کتنا ہی بڑھ جائے۔ اس کو گھر چھوڑنے پر مجبور کرنے کے لیے بہو کتنے ہی جتن کیوں نہ کرے وہ گھر نہیں چھوڑے گی۔ گھر چھوڑ کر اگر کٹی سے الگ ہو گئی تو ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔ ایک بار بچے کو گود میں لینے کے بعد اچھل کود مچا تا دیکھ کر کیا اسے منجھدار میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ابھی تو راگھپا کے کٹی کو متبنی کرنے کا مسئلہ ہی باقی ہے۔ اس معاملے میں راگھپا اس سے پرانا بیر نکالنا چاہے گا۔ اس کو اپنے منصوبوں میں کامیاب ہونے کا موقع نہ دینا چاہیے۔ کتنی بھی بے عزتی کیوں نہ ہو، کتنی بھی تکلیف کیوں نہ ہو اس کمزور بیٹے کے مفادات کا تحفظ میں ہی کر سکتی ہوں۔ مجھے اس کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ آج اگر میں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو راگھپا کل ہی اسے نگل جائے گا" اپنے اس عہد کی مضبوطی اور اس کی عطا کردہ قوت کے سامنے اسے یہ جھگڑے، یہ مکر و فریب، دکھ، ستم سب سمندر کی اوپری لہروں کی طرح ہیچ معلوم ہونے لگے۔ وہ ان باتوں پر سوچتی، اپنے دماغ کو سمجھاتی اور ایک نئی قوت اور عزم کے ساتھ اپنے عہد پر قایم رہنے کو ہی اپنا مقصود و منتہا سمجھتی تھی۔

21

دیسائی جی کے دُکھ سُکھ

دیسائی جی کے سب سے بڑے بیٹے کو بی کام کرنے بمبئی گئے ہوئے دو سال ہو چکے تھے
چھوٹا بیٹا پرشوتم ابھی کم عمر تھا اور انگریزی اسکول میں پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ یہ لڑکا
بہت ذہین تھا۔ دیسائی جی اسی کی وجہ سے دھارواڑ میں مزید دو سال تک رہنے کا فیصلہ کر چکے
تھے۔ لیکن گاؤں سے اُنھیں جو خبریں مل رہی تھیں ان کی وجہ سے وہ سوچنے لگے کہ شاید انہیں
اپنا یہ فیصلہ بدلنا پڑے۔ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتے کہ پرشوتم کو اچیوت کے پاس بمبئی بھیجدیں اور
خود جا کر گاؤں میں رہنے لگیں۔ اسی کشش و پنج میں دن گذرتے رہے۔ شہر میں رہنے کی عادت
پڑ جانے کے بعد ایک دم سے گاؤں جانا آسان نہیں ہوتا۔ ادھر وسنت کے بارے میں انھیں
کوئی فیصلہ کرنا ضروری ہوتا جا رہا تھا کیونکہ گاؤں سے آئے دن نئی نئی خبریں آتی رہتی تھیں
اور ہر دسویں پندرھویں دن وسنت کے متعلق کوئی نئی خبر انھیں ضرور مل جاتی۔ بہت سی باتیں
ایسی بھی تھیں جو ان کے کان تک نہیں بھی پہونچتی تھیں لیکن دیسائی جی کو ان کا بھی خدشہ رہتا تھا۔
خبر لانے والے گاؤں کے بوڑھے کسان باپ کے سامنے کہنے کے قابل بات کو بھی بڑی احتیاط
سے کہتے تھے۔ دیسائی جی ان کی بات سنتے اور با وقار طریقہ پر ان کو کھل کر بات کرنے کا بھی موقع
دیتے لیکن پھر بھی پوری بات اگر ان تک نہ پہونچتی تو وہ اپنے تخیل کی مدد سے اس کو پورا کر لیتے
تھے۔ کسانوں نے انھیں بتایا کہ وسنت راؤ شہدے جوانوں کو جمع کر کے ان کے ساتھ تاش کھیلنے
میں وقت گزارتا ہے۔ لیکن وسنت راؤ کے ان دوستوں کے نام سن کر انھوں نے اپنے
ذہن سے یہ اندازہ کر لیا کہ اُسے پینے پلانے کی لت بھی پڑ گئی ہوگی۔ گاؤں پہونچنے کے کچھ ہی دنوں
بعد وسنت راؤ نے گاؤں والوں کے دکھ سکھ میں غیر معمولی دلچسپی دکھانی شروع کر دی۔ عام
گاؤں والوں کو اپنے بیلوں پر بہت ناز ہوتا ہے، ان کی دیکھا دیکھی وسنت بھی بیلوں کو پیار
کرنے لگا۔ وہ بیلوں کو پندرہ دن میں ایک بار دھارواڑ کے لائن بازار کے پیڑے کھلاتا۔
بیلوں کو پیڑے کھلانا اس کے اپنے دماغ کی ایجاد تھی اسی کے ساتھ اُسے اپنے کھیتوں پر بھی گھمنڈ

ہونے لگا۔ وہ فصل کی کٹائی کے زمانے میں کبھی کبھی کھیت پر ہی سو جاتا۔ ایک بار صبح صبح اس کے کھیت کے برابر والے کھیت کے مالک کے لڑکے نے اس کے کھیت سے جوار کی چھ سات بالیں توڑ لیں۔ وسنت کو لڑکے کے اس قصور پر اتنا غصہ آیا کہ اُسے چوپال پر لاکر کوڑوں سے مارا۔ وسنت راؤ کے اس طرزِ عمل کے نتیجہ میں گاؤں والوں کے دل میں اس کے خلاف غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ یہ خبر بھی دیسائی جی کے کانوں تک پہونچی لیکن اس زمانے میں جو دوسری خبریں وسنت کے بارے میں انھیں موصول ہو رہی تھیں ان کی وجہ سے انھیں بہت ڈر سا لگنے لگا تھا اگر ساری باتیں ٹھیک ٹھیک انھیں معلوم ہو گئیں تو کیا وہ انھیں برداشت کر سکیں گے۔ اس ڈر سے انھوں نے وسنت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کی اصلاح یا اس کی حرکتوں کے پیدا کردہ اثرات کے تدارک کے لیے وہ گاؤں نہ گئے۔ وسنت کے بارے میں انھیں جو اطلاعات ملی تھیں ان میں سے کچھ انھوں نے اپنی بیوی کو بھی بتائیں۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر وہ ان اطلاعات کا دسواں حصہ بھی بیوی کو بتا دیں تو اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ اس لیے گانے والوں کی منڈلی بنانے کے بجائے انھوں نے بیوی سے اس کا تذکرہ یوں کیا کہ وسنت نے دو چار دوست بنا لیے ہیں۔ کھیت کی رکھوالی کے سلسلہ میں لڑکے کو کوڑے لگانے کی بات کو یوں بتایا کہ وسنت کھیت کی طرف بہت توجہ دے رہا ہے۔ ان باتوں کو سن کر اپنے میں مگن وینو بائی بیٹے کے متعلق بڑے خوش آیند خواب دیکھنے لگی۔ وسنت کے متعلق حال ہی میں ملنے والی ایک خبر اور بھی زیادہ تشویشناک تھی۔ وسنت نے نہ صرف گھر میں رکھا ہوا اناج فروخت کر ڈالا تھا بلکہ بھنڈار میں رکھا ہوا اناج کا ذخیرہ بھی بیچ دیا۔ اس کے چند موقع پرست دوستوں نے اپنے گھر بھر لیے۔ گاؤں کے کچھ وضعدار لوگوں نے دیسائی جی کے لحاظ سے نرخ کی کمی کے باوجود اناج نہیں خریدا تو وسنت ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا۔ یہ خبر بھی دیسائی جی سے پوشیدہ نہ رہی۔ دیسائی جی نے بیوی کو کچھ نہ بتایا صرف یہ کہہ کر کہ فصل دیکھ آؤں، اور وہ گاؤں چلے گئے۔ باہر والوں کو ان تشویشناک حالات کا پتہ نہ چلتا تھا لیکن وسنت کو قریب سے جاننے والے دیسائی جی کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ گاؤں میں پارٹیاں بنی گئی تھیں۔ رام گوڑ ایک بڑا کسان تھا۔ اس کے ملکی امتحان پاس بڑے بیٹے اور میٹرک فیل وسنت میں جانی دشمنی ہو گئی تھی۔ دونوں تھوڑا بہت پڑھے لکھے تھے۔ دونوں دولت مند تھے۔ دونوں بڑے کسان تھے۔ جو بات مقابلے کے جذبے کے طور پر شروع ہوئی تھی وہ جلد ہی دشمنی میں بدل گئی۔ رام گوڑ کے لڑکے نے جیسے

ہی اپنے محلے کے لوگوں کو جمع کرکے بیلاٹ مٹا[1] کھیلنے کی تیاری کی' وسنت کے لفنگے دوستوں نے وسنت کو بھی اکسایا اگر گوڑ بیلاٹ مٹا کھیل سکتا ہے تو ہمیں ناٹک کھیلنا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرکے وسنت نے پڑوس کے گاؤں سے ایک گلوکار کو بلایا اور گھر پر ہی تیاری شروع کردی۔ بھاگوت آپ پنا بھٹ رات رات بھر ناٹک میں حصہ لینے والوں کو موسیقی کی تعلیم دیتا گھر میں دن رات دھن تا تھئی تھئی ہونے لگا۔ رات کی نیند حرام ہوگئی لیکن نفرت کا پیدا کردہ یہ شوق مختلف شکلوں میں آگے بڑھتا رہا۔

دیسائی جی جب گاؤں پہونچے تو گھر کی دھما چوکڑی ختم گئی لیکن ساتھ ہی وسنت بھی اپنے میں سمٹ گیا۔ وہ گھر میں رہتے ہوئے بھی باپ کے سامنے بچتا ہے۔ دیسائی جی اگر گھر کے پچھلے حصے میں جاتے تو وہ سامنے کے حصہ میں آجاتا اور اگر وہ سامنے کے حصے میں ہوتے تو وسنت پچھواڑے کی طرف چلا جاتا۔ دیسائی جی کے ڈر سے ناٹک میں شریک اس کے تمام دوست گھر سے بھاگ نکلے تو دیسائی جی یہ سمجھے کہ یہ کھیل یہیں پر ختم ہو جائے گا لیکن انھیں دو تین دن میں یہ پتہ چل گیا کہ گلی کے نکڑ پر "بھوتوں والے گھر" کے نام سے جو مکان مشہور ہے اس میں بلاناغہ ناٹک کی تیاری ہورہی ہے۔ دیسائی جی جب بھی وسنت کو بلاتے وہ نہ آتا۔ جو نوکر اسے بلانے جاتا اس سے بڑی شان سے کہتا کہ جاؤ کہہ دو نہیں آتا لیکن نوکر یا تو دیسائی جی کے ڈر سے یا کسی مصلحت سے دیسائی جی سے یہ کہتے "ابھی آتا ہوں کہہ کر گئے ہیں صاحب" وسنت اگر ان سے کہتا کہ جاؤ ان سے کہہ دو "میں ملا نہیں" تو وہ دیسائی جی سے کہتے "ہم نے کہا پتا جی بلا رہے ہیں تو وہ پچھواڑے سے کہیں چلے گئے صاحب" وغیرہ وغیرہ۔ دیسائی جی نے سوچا اسے پکڑ بلائیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کل وسنت کو ہی بہادر دیسائی بننا ہے اتنا سخت قدم اٹھانے سے باز رہے۔

اب انھوں نے دوسری ترکیب سوچی۔ اس کے ساتھ آنکھ مچولی کم کردی۔ انھوں نے بھاگوت آپ پنا بھٹ کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں پندرہ روپیہ دے کر اسے گاؤں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا۔ اپ پنا بھٹ کے بھاگ جانے کی خبر سن کر راما گوڑ کے گھر خوب خوشی منائی گئی۔ وسنت کی توہین ہوئی اور وہ مغموم ہو کر باپ سے ملنے آیا۔ دیسائی جی نے اسے تنبیہہ کی کہ آئندہ ان کی اطلاع کے بغیر اناج نہ فروخت کرے اور اپ پنا بھٹ کو بلانے کی اجازت دے دی۔ وسنت کے پاس اناج فروخت کرنے سے جو رقم آئی تھی اس میں سے اب بھی تھوڑی رقم موجود تھی دیسائی

---

[1] میسور کے علاقے کا ایک مقبول رقص و موسیقی کا آمیزہ۔

جی نے وہ رقم اسی کے پاس رہنے دی۔ اپنی رعیت کو بلا کر کہا کہ وہ وسنت پر نظر رکھیں۔ اس کے بعد لگان وغیرہ وصول کر کے وہ پندرہ دن گاؤں میں رہ کر واپس آگئے۔ دھارواڑ میں یہ خط ان کا منتظر تھا۔

بدھوار مورخہ 23 ،
بمبئی

محترم والد صاحب کی خدمت میں مؤدبانہ سلام کے بعد عرض ہے کہ میں بخیریت ہوں۔ میں نے کامرس کالج چھوڑ دیا ہے اور دوسری پڑھائی شروع کر دی ہے۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ کالج کی پڑھائی سے کوئی فائدہ نہیں ہے اس لیے کالج چھوڑ دیا۔ آپ کو اب تک اطلاع نہ دے سکا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں نے دوسرا کام سیکھنا شروع کر دیا ہے۔ نئے سرے سے شروع کرنے کے سبب پیسہ کی پریشانی ہے اس لیے مہربانی فرما کر مندرجہ ذیل پتے پر سو روپیہ بھیج دیں۔ دیر نہ کریں۔ باقی سب خیریت ہے۔ ماتا جی کو میرا مؤدبانہ سلام۔ اُن کی اور بھائیوں کی خیریت سے مطلع فرمائیے۔ فقط آپ کا

اچیوت

اس خط کا مطلب دیسائی جی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے کالج کیوں چھوڑ دیا؟ اپنے آپ ہی تو یہ کہہ کر کامرس پڑھنے گیا تھا کہ آرٹس پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب کالج کی پڑھائی بھی کیوں بے فائدہ نظر آنے لگی؟ نیا کام کیا ہو سکتا ہے؟ یہ نیا پتہ کس کا ہے؟ آٹے کی چکی پریس کا کیا کام۔ کہیں کچھ حماقت تو نہیں کر بیٹھا؟ بمبئی کی کافی خبریں اخباروں میں چھپ رہی تھیں انہوں نے تہیہ کیا کہ چاہے جو بھی ہو وہ خود جا کر حالات معلوم کریں گے۔ تار سے روپیہ بھیجنے کے دو تین دن بعد انہوں نے بیوی سے کہا کہ میں اچیوت سے ملنے جا رہا ہوں اور وہ بمبئی روانہ ہو گئے۔ بوری بندر پر اتر کر انھوں نے لال باغ جانے کا خیال ترک کر دیا اور وکٹوریہ کر کے کامرس کالج کے ہوسٹل پہونچے۔ وہاں وہ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سے ملے تو انہیں اچیوت کی حماقت کا حال معلوم ہوا۔

نمک ستیہ گرہ!

اچیوت نے ایک بار کچھ دوستوں کے ساتھ کالج کے سامنے پکٹنگ کی تو کالج کے افسران

نے اسے وارننگ دی۔ اس کے دوسرے دن اچھوت سپرنٹنڈنٹ سے ملا اور ان سے کہا کہ وہ گاؤں جانا چاہتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کو کچھ شک ہوا تو اس نے اچھوت سے مزید پوچھ گچھ کی لیکن وہ ان کے پاس سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ میں گھر ہی جا رہا ہوں، کہیں اور نہیں جا رہا ہوں۔ ہوسٹل سے جانے کے بعد اس نے کھل کر ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور گرفتار ہو گیا۔ اس کے دو ساتھیوں نے تین دن جیل میں رہ کر معافی مانگ لی اور چھوٹ کر گھر چلے آئے۔ ان کو پھر سے کالج میں بھی داخلہ مل گیا اور ہوسٹل میں بھی لیکن اچھوت نے معافی نہ مانگی اس لیے اسے ایک مہینے تک جیل کاٹنا پڑی۔ جیل سے چھوٹ کر وہ کالج آیا لیکن حکومت نے اس کی رہائی سے پہلے ہی کالج کو اس کے متعلق رپورٹ بھیج دی تھی جس کی وجہ سے اسے داخلہ نہ مل سکا۔ ہوسٹل سے اپنا سامان لے جاتے ہوئے اُسے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ دیسائی جی نے اچھوت کے دونوں دوستوں کو بلا کر ان سے ساری معلومات حاصل کی۔ انھوں نے بھی وہی بات بتائی۔ انھوں نے دیسائی جی کو بتایا کہ ان کے بہت کہنے سننے پر بھی اس نے معافی نہیں مانگی اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اب وہ کہاں ہے یہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دیسائی جی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنے دوستوں کو سخت تاکید کر دی تھی کہ دیسائی جی کو اس سلسلہ میں کوئی خط نہ لکھا جائے۔ اب دیسائی جی نے نہایت نرمی کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا کہ کالج یا ہوسٹل کی طرف سے انہیں خط کیوں نہ لکھا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ بولا " لکھا تو تھا میں نے ہی خط تیار کیا تھا اور پرنسپل صاحب نے اس پر دستخط کیے تھے۔ بعد میں انہوں نے باہر جانے والی ڈاک کا رجسٹر دیکھا تو اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کی طرف سے رپورٹ آتے ہی خط لکھا گیا تھا۔ پھر آخر انہیں خط نہ ملنے کا کیا سبب ہے؟ انہوں نے خود ڈاک کا رجسٹر غور سے دیکھا۔ تب معلوم ہوا کہ اس میں ان کا نام تو ٹھیک درج تھا لیکن مقام کا نام غلطی سے دھارواڑ کی بجائے دھاری وال لکھ دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ خط دھاری وال کا چکر کاٹ کر اب تک ڈیڈ لیٹر آفس میں پہونچ گیا ہوگا۔

ایسی حالت میں کس کو الزام دیا جا سکتا تھا؟ انھوں نے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا! اگر اب بھی معافی مانگ لی جائے تو داخلہ مل سکتا ہے۔ اس کا جواب فوراً ہی نہیں ملا سرکاری رپورٹ بلاشبہ اس کے خلاف تھی لیکن سپرنٹنڈنٹ اور پرنسپل دونوں کو اس بات کا فخر تھا کہ اچھوت ایک اچھا طالب علم ہے۔ سپرنٹنڈنٹ نے دیسائی جی سے دو منٹ توقف کرنے کو کہا اور پرنسپل صاحب سے ٹیلی فون ملایا۔ اس کے بعد بولے :" اس کی حاضری بہت کم ہو گی۔ آج کل حکومت اس

معاملے میں بہت سخت ہوگئی ہے۔ خصوصاً جب سے طلبا معافی مانگ کر دوبارہ تحریک میں شامل ہوگئے ہیں۔ اچھوت کے بارے میں ہماری بہت اچھی رائے ہے اس لیے خاص طور پر سفارش کرکے اسے داخلہ دلایا جا سکتا ہے لیکن اسے یہ لکھ کر دینا ہوگا کہ وہ پھر کسی اندولن میں حصہ نہیں لے گا۔"

یہ جان کر کہ اچھوت کو کالج میں سب ہی لوگ پسند کرتے ہیں دیسائی جی کو خوشی اور فخر کے احساس کے ساتھ تشویش بھی ہوئی کہ انہیں اس بات کا ڈر بھی ہوا کہ اس کے جیل جانے کی بات کل نہیں تو پرسوں دھاروا ڑ میں ضرور پھیل جائے گی۔ اس وقت کیا ہوگا۔

اچھوت کے معافی نہ مانگنے کی بات سن کر ان کو بے حد خوشی ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ ان کا بیٹا صحیح معنی میں بہادر دیسائی ہے ان کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ لیکن جیل جانے والی بات نے ان میں توہین اور خوف کے جذبات پیدا کیے۔

سپرنٹنڈنٹ نے آخر میں دیسائی جی کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ اتنے اچھے طالب علم کی زندگی برباد ہوتے دیکھ کر انہیں اور پرنسپل دونوں کو بہت دکھ ہوا ہے۔ انھوں نے دیسائی جی کو یقین دلایا کہ آپ معافی نامہ لے آئیے آگے میں دیکھ لوں گا۔

دیسائی جی کچھ کہے بغیر وہاں سے چلے آئے اور لال باغ پہونچے۔ لال باغ سے تانگہ لے کر دیوی داس فلورمل تلاش کیا۔ دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ لال باغ میں کسی کا گھر تلاش کرنا بہت مشکل کام تھا۔ آدھا میل تک چکیوں اور فیکٹریوں کے چوکور احاطے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے ختم ہونے کے بعد بے ترتیب بنے گھروں اور جھونپڑیوں کا جھنڈ تھا۔ آخر ڈاکیہ کی مدد سے انہیں دیوی داس فلورمل کا پتہ چل گیا۔ یہ ایک جھونپڑی نما گھر تھا۔ باہر بڑے بڑے گجراتی حروف میں دیوی داس فلورمل لکھا تھا۔ اس کی چھت ٹین کی تھی۔ پاس ہی روئی کا کاروبار ہونے کی وجہ سے ٹین کی دیواروں کے جوڑوں میں روئی کے ریشے جم گئے تھے جو بہت پرانے اور میلے نظر آرہے تھے۔ کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ ایک عجیب سا شخص بیٹھا مکھیاں مار رہا تھا۔ اپنے نکونے ماتھے، توتے جیسی ناک، تالوں جیسی بڑی بڑی سرخ آنکھیں سر پر ابھری ہوئی نسوں کی وجہ وہ ایک عجیب الخلقت شخص نظر آتا تھا۔ اُسے دیکھ کر دیسائی جی کو ایسا لگا جیسے اس سے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہو۔ اس نے پوربی بھائیوں کی طرح بغیر آستین کی بنڈی اور گھٹنوں تک کی آدھی دھوتی پہن رکھی تھی لیکن اس کے کپڑوں پر ذرہ برابر دھول نہ تھی۔ بمبئی میں ایک گندی جگہ پر آٹے کی چکی میں اس کے جیسے صاف کپڑے دیکھ کر دیسائی جی بڑے متعجب ہوئے۔ اس میں جو

اور عجیب باتیں تھیں یہ بھی ان میں سے ہی ایک تھی۔ اس لیے وہ پورا پورا بیا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بھی دیسائی جی کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بڑے خشک لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے ؟"

"یہاں کوئی بہادر دیسائی نام کا شخص ہے ؟"

"آپ کون ہیں، آپ ان کے بزرگ ہیں کیا ؟" اس نے کنڑ میں پوچھا۔ دیسائی جی کی حیرت اور بڑھ گئی۔ وہ بہت تیزی سے بولتا تھا۔

"ہاں، وہ ہیں کیا ؟"

"ابھی گئے ہیں .... ہاں ..... ابھی ابھی تو گئے ہیں ..... ابھی تک تو یہیں تھے۔ ابھی اس پیٹے کی مرمت کی ہے .... کر کے چلے گئے۔"

"کہاں گئے ؟"

"پریس میں گئے ہیں۔ نو سے بارہ تک ہمارے یہاں رہتے ہیں۔ بارہ سے دو تک پریس میں۔"

"کون سے پریس میں"

"یہ سب ہمیں نہیں معلوم"

یہ سوچ کر کہ اسے غصہ دلانا ٹھیک نہیں ہے دیسائی جی اسے خوش کرنے کے لیے بولے:

"آپ کا نام کیا ہے ؟ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں ؟"

"یہ سب مجھے نہیں معلوم" دیسائی جی کو ایسا محسوس ہوا گویا اس کا غصہ اور بھی بڑھ گیا ہو۔

"ان سے کہاں ملاقات ہو سکے گی"

"رات کو سات بجے آئیے سات بجے ..... نہیں نہیں ساڑھے سات بجے آئیے، ساڑھے سات بجے ..... اس وقت تک آجائیں گے۔ ہمارے گھر میں ہی سوتے ہیں۔"

بیٹے کا اتنا پتہ چلا کر اور شام کو پھر آنے کا ارادہ کر کے دیسائی جی نے کہا "اب میں چلتا ہوں" اور وہاں سے چلنے لگے تو اس شخص نے پھر ان کو مخاطب کیا۔

"شام کو آئیے ..... مل کر چلے جائیے گا۔ سونے کے لیے ہمارے پاس بس ان کے لیے جگہ ہے اوروں کے لیے جگہ نہیں۔ اپنے سونے کا انتظام آپ کو خود کرنا ہوگا۔ آپ کو جگہ ڈھونڈھنا ہوگی اور ....."

دیسائی جی کو اس کی دونوں باتیں سن کر ہنسی آگئی لیکن وہ وہاں سے کھسک گئے۔ شام کو

تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔ انہیں اس بات کا ڈر نہ تھا کہ اچیوت وسنت کی طرح چھپ کر بھاگ جائے گا۔ اب تک تفکرات کی وجہ سے ان کو بھوک کا احساس نہیں ہوا تھا مگر اب یکسوئی ہو جانے کے بعد انہیں شدت سے بھوک محسوس ہونے لگی۔ دیسائی جی بس پر بیٹھ کر فورٹ پہونچے اور وہاں جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے اس میں جا کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ دو تین گھنٹے سوتے رہے۔ شام کو اٹھ کر وہ لال باغ روانہ ہوئے اور سات بجتے بجتے دیوی داس فلور مل پہونچ گئے۔ فلور مل کے بالمقابل ایک ایرانی ہوٹل تھا۔ انھوں نے وہاں پہونچ کر چائے منگوائی اور مل کے دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔ لگ بھگ ساڑھے سات بجے کھدر کا کرتا پاجامہ پہنے اور ٹوپی لگائے پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل گھسیٹتا ہوا اچیوت فلور مل میں داخل ہوا۔ دیسائی جی نے اسے پہچان تو لیا لیکن انہیں محسوس ہوا کہ اچیوت پہلے سے کافی بدل گیا تھا۔ باپ نے دل کی آنکھو سے اس ڈھیلے ڈھالے کرتے میں بھی بیٹے کی گری ہوئی صحت کا اندازہ لگا لیا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں اس کا جسم بھرا بھرا دکھائی دیتا تھا لیکن دیسائی جی نے ایک ہی نظر میں اس کی اصلی حالت کا اندازہ کر لیا۔ اسے فلور مل میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ بھی ہوٹل سے نکل کر فلور مل کے دروازے پر پہونچے۔ اس وقت انہیں اندر ہوتی ہوئی یہ گفتگو سنائی دی:

"کیا پٹہ ٹھیک کام کر رہا ہے؟"

"ت۔ت۔ت... تمہارے باپ آئے ہیں۔"

"کون؟"

دیسائی جی نے پیچھے سے اچیوت کا کندھا تھپتھپایا۔

چوپائی کی ریت پر بیٹھ کر باپ بیٹے نے بہت دیر تک باتیں کیں۔ کئی بار دیسائی جی کا دل چاہا کہ اس سے معافی مانگنے کے لیے کہیں لیکن ان کی زبان نہ کھلی۔ وہ شروع سے آخر تک تمام باتیں اسی سے سنتے رہے۔ اچیوت کو اپنی بہادری کی داستان سناتے ہوئے حجاب آ رہا تھا۔ باپ ساری باتیں خندہ پیشانی سے سن رہے تھے۔ وطن پرستی کی اُس فضا میں اچیوت کو ان باتوں کے علاوہ اور کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی۔ اس نے جھینپتے جھینپتے تمام باتیں دیسائی جی کے سامنے کہیں: گاندھی جی کی نمک ستیہ گرہ کی باتیں۔ ان کا ڈانڈی مارچ، جوں جوں یہ باتیں اخباروں کے ذریعہ عوام تک پہونچتی رہیں ان میں جوش پھیلتا گیا۔ اچیوت کے کالج کے طالبعلم

بھی جوش سے سرشار تھے۔ اس زمانے میں چاہے سیاسی اندولن ہوں یا کوئی اور مذہبی یا سماجی جلسے ہر معاملہ میں طالب علم ہی پیش پیش رہتے تھے۔ دوسرے تمام کالجوں کی طرح کامرس کالج کے سامنے بھی پکٹنگ ہوتی۔ ایک دن پکٹنگ بہت زبردست طریقہ پر ہوئی اس میں حصہ لینے کے خلاف جب سختی سے وارننگ دی گئی تو تنظیم ٹوٹ گئی۔ کامرس کالج جیسے چھوٹے ادارے میں طلباء کا ایک دوسرے کے خلاف شکایت کرنا ایک قدرتی بات تھی۔ اس پر اندولن اندر ہی اندر زور پکڑتا رہا۔ کالج کو بند کرانے کی روزانہ کی یہ لاحاصل کوشش اچھوت کو اچھی نہ لگتی تھی۔ کالج سے باہر آکر طالبعلموں کا سینما چلا جانا یا اپنے اپنے گھروں میں گھس جانا اسے اور بھی کھلتا تھا۔ اس لیے اس نے طالب علموں کو نمک ستیہ گرہ میں حصہ لینے کے لیے اکسانا شروع کیا۔ اس اقدام کی بعض وطن پرست طالب علموں نے بھی مخالفت کی اور اپنے دعوٰی کی دلیل میں یہ کہا کہ خود گاندھی جی نے طالب علموں کو ستیہ گرہ میں شریک ہونے سے منع کیا ہے۔ لیکن اچھوت کا خیال تھا کہ گاندھی جی نے صرف ایسے ڈرپوک طالبعلموں کو ستیہ گرہ میں شرکت کرنے سے منع کیا ہے جو بعد میں جھیلا بھیلاتے ہیں لیکن ستیہ گرہ کی صحیح حقیقت کو سمجھنے والے طالب علم اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔
کامرس کالج میں ایک دو ہی ایسے طلبا ملے لیکن دوسرے کالجوں سے ستیہ گرہ کرنے کے لیے ہزاروں طالب علموں کا ہجوم سمندر کے کنارے تک جانے والے راستے تک جلوس بنا کر گیا اور نمک لوٹا۔ ان میں سے کچھ جیل خانے میں معافی مانگ کر چھوٹ گئے لیکن جیل کاٹنے والے طالب علموں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ یہ طالب علم آج کل کی تعلیم سے بھی چڑے ہوئے تھے۔

"دیکھو، ایک بار ڈگری لینے کے بعد جتنا چاہو سیاست میں حصہ لے لینا۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ تو تمہارا خیال کیا ہے؟ کیا پڑھائی چھوڑ دینی چاہیے"۔

"کالج والے اگر دوبارہ داخلہ دے دیں تو اپنا کورس پورا کر لوں"

"وہ لوگ تمہیں واپس لینے کو تیار ہیں۔ میں صبح ہی تمہارے سپرنٹنڈنٹ سے مل کر آیا ہوں"۔

"تو۔۔۔۔۔"

"ہاں، معافی نامہ دینا ہوگا"۔

"معافی کس بات کی پتا جی۔"۔۔۔۔ اس سے آگے وہ شرم کے مارے کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اپنی اُس دھواں دھار تقریر کا ذکر بھی ان کے سامنے نہ کر سکا جو اس نے ایک بار وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر طالب علموں کے سامنے کی تھی وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی علمیت

باپ کی نیم خواندہ عقل، قوتِ کردار اور مضبوط شخصیت کے سامنے لنگڑانے لگتی ہے۔ دھارواڑ میں گھر پر رہنے کے زمانے میں وہ باپ سے بہت کم بات کرتا تھا۔ ہر معاملے میں ماں اس کی رفیق تھی۔ بہت عرصہ بعد ملنے اور کچھ بڑا ہو جانے کے سبب اور سب سے بڑھ کر جیل میں رہ کر آنے اور پردیس میں رہنے کے سبب اس کی شخصیت میں جو ارتقا ہوا تھا اس کی وجہ سے وہ اتنی بہت سی باتیں ان سے کہہ گیا تھا۔

اس کی باتوں کو سن کر، اس کی مونچھیں، گاندھی ٹوپی اور پُر اشتیاق چہرہ کو دیکھ کر دیسائی جی نے محسوس کیا کہ لڑکا بڑا ہو گیا ہے۔ اسی اثناء میں اچھوت نے اپنا منھ لٹکا لیا۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرکے دیسائی جی بولے "اگر تمہارا دل نہیں چاہتا تو رہنے دو"۔۔۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر دیسائی جی بولے "آگے کیا کرنے کا خیال ہے؟"

"آج کل بامبے گزٹ اخبار میں کام کر رہا ہوں۔ اخبار نیا ہے۔ اس کے سب ایڈیٹر سے جیل میں جان پہچان ہو گئی تھی۔ اس کے پاس تین گھنٹہ کام کرتا ہوں۔"

"کون سا کام؟"

"مددگار ایڈیٹر کا کام۔ وہ پچیس روپیہ دیتے ہیں۔ دو سے پانچ بجے تک یہ کام کرتا ہوں قریب ہی اخبار کا پریس بھی ہے۔ وہاں پریس چلانے کا کام بھی سیکھتا ہوں۔"

"تو پھر اس چکی میں؟"

"ہاں۔۔۔۔ وہاں کوئی کام نہیں۔ صرف اس آدمی سے جان پہچان ہے۔ اس کے کمرہ میں رہتا ہوں۔ ویسے کبھی کبھی چکی کا کام بھی دیکھ لیتا ہوں۔ ایک بار مشین کا بھوت سر پر سوار ہو گیا تو بس۔۔۔۔"

"یہ سب سیکھنے میں ابھی کتنے دن لگیں گے؟"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ یہیں رہ کر اخبار میں کام بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اخبار اپنا ہی ہے۔ نوکری تو برائے نام ہے۔ وہاں کام کرنے والے سب ایسا ہی سمجھتے ہیں۔۔۔۔" اتنا کہہ کر اچھوت خاموش ہو گیا۔ دیسائی جی یہ سن کر بولے: "ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن تم اگر یہیں رہو گے تو گھر، کھیت اور جائداد کون سنبھالے گا۔ ان باتوں کا تجربہ بھی تمہیں ہونا چاہیے۔"

"تو میں کیا کروں" اچھوت اپنے دل کی بات باپ کی زبان سے ہی سننا چاہتا تھا۔

"یہاں تمہیں جو کچھ سیکھنا ہے وہ سیکھ کر دھارواڑ سے ایک اخبار نکال سکتے ہو" تھوڑے

سے تامل کے بعد دیسائی جی نے کہا۔

"میں بھی اسی خیال سے چھاپے خانے کا کام سیکھ رہا ہوں۔"

"چھاپے خانے کے کام میں کتنا پیسہ چاہیے۔ کچھ سوچا ہے کیا؟"

"نئے کے لیے تو تین ساڑھے تین ہزار روپیہ چاہیے۔ لیکن ایک چھوٹا سا پریس بک ورکنگ ہمارے اخبار کے پریس میں رکھا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس بک ورکنگ سے کوئی فائدہ نہیں ہے اُسے فروخت بھی کیا جاسکتا ہے۔ میں نے فورمین سے دریافت کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ہو گی۔"

"اس میں کوئی خرابی تو نہیں ہے؟"

"نہیں وہ پرانی ہو کر اور اچھا کام کرنے لگی ہے۔"

دیسائی جی نے فیصلہ کن انداز میں کہا "تو ایسا کرو تم دو ایک سال یہ کام سیکھو۔ ابھی تمہاری عمر کم ہے۔ ابھی تم تن تنہا اخبار کو سنبھال نہیں سکتے ہو اور یہ ٹھیک بھی نہیں ہے۔ دو چار لوگوں کے ساتھ کام کر کے جب تم تجربہ کار ہو جاؤ گے تو تمہارے اخبار کی وقعت ہو گی۔ تمہارے خیالات کی قدر ہونی چاہیے۔ جیسے جیسے تم کام کرو گے اس کام کے تمام اصول اور قاعدے تمہاری سمجھ میں آتے جائیں گے۔ تمہاری زبان میں وزن ہوگا، اور دوسری باتیں از خود تمہیں معلوم ہوتی چلی جائیں گی اسی لیے میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان سب باتوں کے لیے اگر تمہاری پڑھائی پوری ہو جاتی تو اچھا تھا خیر جب تمہیں اچھی طرح یقین آجائے کہ تم اخبار کے کام سے پوری طرح واقف ہو گئے ہو، تب ہی دھارواڑ آنا۔ اس وقت پریس لگانے کے متعلق بھی سوچیں گے وہیں پھواڑے پریس لگا لینا۔ وہیں کالج میں داخلہ لے کر ڈگری لے لو۔ بعد میں چاہو تو اخبار بھی جاری کر دینا۔"

اچیوت بہت خوش ہوا لیکن اتنے دن انتظار کرنا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ بولا "یہیں آرٹس میں آئندہ سال داخلہ لے لوں؟"

"دو تین کام بیک وقت کر سکو گے۔ اخبار۔ پریس۔ پڑھائی؟"

"کر لوں گا۔"

"یہاں کی آب و ہوا خراب ہے۔ زیادہ محنت نہیں کرنا چاہیے۔"

"نہیں تو! ان پانچ چھ مہینوں میں پریس کا کافی کام سیکھ گیا ہوں۔ اگلے جون سے بس کالج اور اخبار کا کام ہی رہ جائے گا۔"

دیسائی جی مشتبہ ہو کر بولے "تم سے ہو سکے تو کر لو لیکن تمہاری ماں کو تمہاری طرف سے بہت تشویش ہے۔ تم یہیں آٹے کی چکی اور پریس کے بارے میں سوچ رہے ہو"۔

پیدائشی رئیس ہونے پر بھی گاندھی جی کے اثر کے تحت اچیوت کے دل میں غریبی کے خلاف زبردست جذبات پیدا ہوتے اور سماج سے اسے بعض وقت بڑی مایوسی ہوتی۔ اس کے مردانہ جسم میں چھپے ہوئے مضبوط دل میں کبھی کبھی ایک نسوانی گداز سا پیدا ہو جاتا جو مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا۔ کبھی اسے اپنے امیر گھرانے میں پیدا ہونے پر شرم آتی کبھی وہ اپنے ماں باپ کی جدائی پر رونے لگتا، کبھی وہ اپنے طرز عمل کو دیکھ کر اس بات پر کڑھتا کہ وہ ماں باپ کے تئیں اپنا فرض پورا نہیں کر رہا ہے۔ بمبئی جیسے کثیر آبادی والے شہر کے ایک کونہ میں اسکی حیثیت کیا تھی۔ یہ شہر تو انسانوں کا جنگل تھا۔ جہاں لوگوں کی اتنی کثرت کے باوجود ہر آدمی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اسی جان لیوا تنہائی کو مذاق میں "بمبئی بخار" بھی کہا جاتا ہے۔

جب اچیوت پر اس طرح کے خیالات کی یلغار ہوتی تو وہ اپنے کمرے میں چادر سے منھ ڈھانپ کر لیٹ رہتا اور اندر ہی اندر رو لیتا۔ اس کے ہوسٹل کے ساتھی چادر کھینچ کر اسے طعنہ دیتے "یہ امیری کا اثر ہے"۔ اچیوت کو ان کی بات سچ ہی معلوم ہوتی۔ غریبوں کے لیے باپ کہاں، ماں کہاں، وہ اپنے میں ہی مگن رہتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ محنت ہی کرنا پڑتی ہے۔ بعض وقت سوچا: کاش میں بھی ان غریبوں کی طرح سخت بن سکتا تاکہ اپنی محنت کشی میں اپنے غموں کو فراموش کر سکتا۔ اس نے اس اصول کی صداقت کو اپنے تجربہ سے دریافت کیا تھا۔ وہ جسمانی محنت کے ذریعہ اپنی ذہنی اور جذباتی بیزاری اور آشفتگی کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے ماں باپ کی جدائی کو اپنی کوشش سے یا دوسروں کی کوشش سے بھولنے کی مشق کرتا پہلے وہ دوسرے لوگوں کو اپنے باپ، ماں یا بہن بھائی کے یاد آنے پر صبر کرنے کی نصیحت کرتا لیکن اگر وہ لوگ موقع پڑنے پر اُس سے یہی کہتے تو وہ برداشت نہ کر پاتا۔ انھیں چکروں میں پریس کے فورمین اور چکی کے دیوانے شخص سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ ماں کی یاد نے ایک بار پھر اس کے دل کو تڑپا دیا۔

اس کا خالی خالی نظروں سے سمندر کی طرف دیکھنا دیسائی جی نے فوراً محسوس کر لیا۔ اچیوت کی یہ کمزوری انہیں پہلے سے معلوم تھی۔ اگر وہ بھی ایک بار اپنا ذہنی توازن نہ کھوتے تو ماں کے بارے میں اس طرح اچیوت سے بات نہ کرتے۔ اس نے جب بمبئی جا کر کامرس پڑھنے کی بات کہی تھی تو دیسائی جی نے یہی سوچ کر اُسے بمبئی جانے کی منظوری دے دی تھی کہ اکیلے رہنے سے اس میں

ہمت پیدا ہوگی۔ بات بدلنے کے لیے انہوں نے پوچھا:

"یہ چکی والا آدمی کنٹر بولتا ہے؟"

"ہاں، وہ دھارواڑ کا رہنے والا ہے، اسے یہاں آئے بہت زمانہ ہوگیا ہے۔ اس چکی کے سیٹھ کو اُس پر بہت اعتماد ہے۔ اسے رہنے کے لیے ایک کمرہ دے رکھا ہے۔ نیم پاگل ہونے پر بھی اچھا آدمی ہے۔"

"تمہاری اس کی جان پہچان کہاں ہوئی؟"

"ایک بار ریل گاڑی میں میں کنڑ ناول پڑھ رہا تھا۔ اس ناول پر میں نے اپنے نام کے ساتھ دھارواڑ لکھ رکھا تھا وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے کتاب پر لکھا ہوا دھارواڑ کا لفظ دیکھ کر مجھ سے پوچھا 'آپ دھارواڑ کے ہیں؟' میں نے کہا 'ہاں' تو وہ بولا 'میں بھی دھارواڑ کا ہوں میری چکی دیکھنے آنا۔' وہ چکی اسے جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ باہر کتنی ہی گندگی کیوں نہ ہو لیکن وہ مشین کو ہر ہفتہ تیل ضرور دیتا ہے اور اسے کھول کر صاف کرتا ہے۔ ہر پورن ماشی کو ایک بار، بنتر پوجا' کرتا ہے۔ غرض یہ کہ اس چکی سے اُسے گویا عشق ہے۔ سیٹھ کے گھر والے اس کو بلا کر کھانا کھلاتے ہیں۔ بہت مزے میں ہے۔"

" دکھ تو عقل والوں کو ہوتا ہے۔ اُس جیسے لوگوں کو دکھ کہاں۔ یہ لوگ تو بھگوان کی طرح ہوتے ہیں۔" اُن کی بات کا یہی مطلب تھا۔

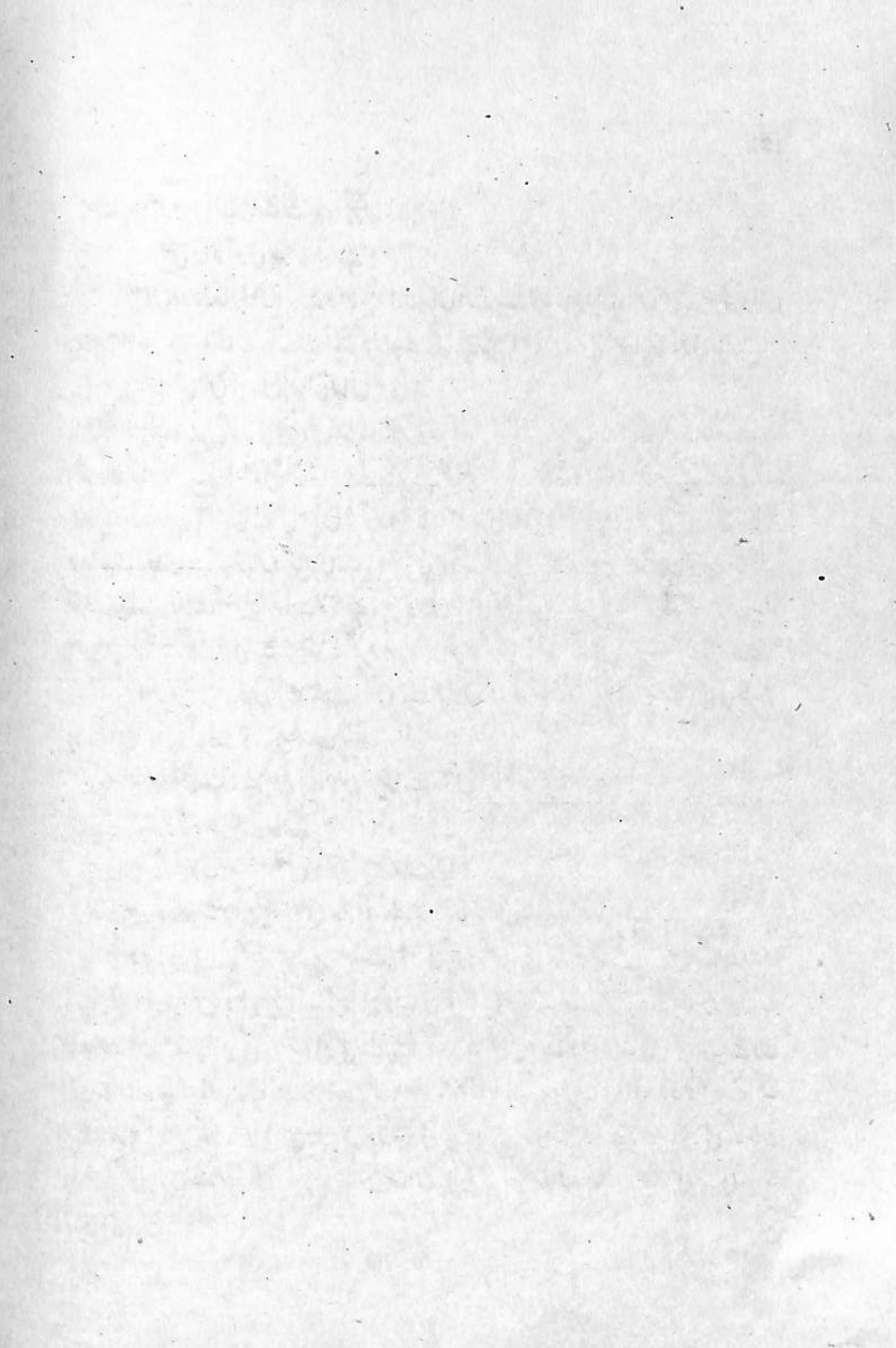
"ایسا لگتا ہے اسے میں نے کہیں دیکھا ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"بندگوڑہ دینکٹ رائے۔"

"بندگوڑہ راگھپا سے اس کا کوئی رشتہ ہے کیا؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں لیکن اس نے ایک بار بتایا تھا کہ اس کا ایک بھائی ہے۔"

دیسائی جی نے مختصر طور پر وسنت راؤ کی کچھ باتیں اچیوت کو بتائیں۔ اس کے بعد دونوں باپ بیٹے اٹھ کر اس ہوٹل میں آئے جہاں دیسائی جی کا قیام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں نے مزید دو گھنٹے تک گفتگو کی۔ دیسائی جی نے بیٹے کو تندرستی کی طرف توجہ دینے کی تاکید کی۔ اگلے دن اچیوت نے باپ کو مالا بارہل اور دوسرے خوبصورت مقامات کی سیر کرائی اور دونوں نے ایک اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اسی دن شام دیسائی جی بمبئی سے رخصت ہوگئے۔ دیسائی جی کے ساتھ دو دن اتنی تیزی سے گزر گئے کہ اچیوت کو احساس بھی نہ ہوا۔ اب وہ تھا اور پھر وہی جدائی.... وہی اکیلا پن!



دوسرا حصہ

22

کھٹے میٹھے تجربے

شادی ایک طرح سے جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ایک ڈھلوان پل ہے۔ شادی کے بعد جس آدمی میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی اس کو نامکمل ہی کہنا چاہیے۔ نئی امیدیں، آرزوئیں اور امنگیں دو چار سال تک اپنا رنگین چہرہ دکھاتے ہیں اور بعد میں اپنے پرتو سے خوابوں کی دنیا کو ترش اور شیریں بنانے لگتے ہیں۔ آدمی یہی سوچتا رہتا ہے کہ آرام کا زمانہ آگے ہے اور ابھی تو جو بھی اس پر پڑے اسے برداشت کرنا چاہیے۔

کٹی اپنی ذات کے حصار میں اسیر تھا۔ اس حصار کو توڑنے یا اس کی دیواروں سے بلند ہو جانے کی خواہش اسے کبھی نہ تھی۔ وہ اسی تنگ دائرہ میں رہ کر سوچتا تھا کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے۔ شادی کے ابتدائی زمانہ میں خواہشات پوری ہونے کے بعد محبت صرف جسم کی مانگ بن کر رہ جاتی ہے جسم بھی جب تھک جاتا ہے (لیکن عقل نہیں تھکتی) تو وہ ذہنی قربت اور ہم آہنگی کی مشق کرتے ہیں۔ اس کام میں بچے ان کے مددگار ہوتے ہیں اگر اولاد نہ ہو تو اولاد کی کمی ایک غم بن جاتی ہے اور میاں بیوی غم کے اس رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

شادی کے پانچ سال بعد بھی کٹی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اب جسم کی مانگ اولاد کی خواہش کے روپ میں ڈھل گئی۔ کٹی کے چہرے سے اس کے دل کی بزدلی ظاہر ہونے لگی۔

رتنا کو بھی یہ خاموش دکھ تھا اور بزدلی بھی اس میں موجود تھی وہ کبھی کبھی کہہ بیٹھتی کہ میرے ساتھ کی کئی لڑکیاں دو دو بچے لے کر گھوم رہی ہیں۔ اور تو اور اس مردانی گوداوری کے بھی شادی کے بعد دو بچے ہو چکے ہیں۔ گوداوری جب میکے آئی تو رانگپا کے گھر اپنے بدشکل بچوں کو لے کر رتنا سے ملنے آئی۔ اس کے بچوں کو دیکھ رتنا کے دل میں حسرت، رشک، امید اور محبت سب ایک ساتھ پیدا ہوئے۔

بچوں کے لیے کٹی کو بھگوان سے لگن پیدا ہوئی۔ اس دنیا دار شخص کو عبادت میں

یقین نہ تھا لیکن وطن پرستی کی جو عام ہوا اس زمانے میں چل رہی تھی اس کے نتیجہ میں ماں کی محبت عقیدت کی حد تک اس میں پیدا ہوگئی تھی۔ ماں کا احترام بھی اس کے دل میں بڑھتا رہا۔ پوتے پوتیوں کی تمنا گنگو اکو بھی تھی اس طرح گویا اولاد کی کمی نے تینوں کے دل میں ایک قسم کا باہمی اعتماد پیدا کر دیا تھا۔

کٹی کے گھر میں دیوی دیوتاؤں کی جو مورتیاں تھیں ان میں اس کے باپ کی پوجا کا ایک کالے رنگ کا شا لگ رام بھی تھا۔ ان کے مرنے کے بعد اسے ایک بکس میں رکھ دیا گیا تھا اور صرف چند مورتیاں ہی پوجا کے لیے باہر رکھی گئی تھیں۔ جنیو پہننے کی رسم کے بعد سے کٹی ہی ان کی پوجا کیا کرتا تھا۔ نوراتر میں ایک بار سب دیوی دیوتاؤں کو نکال کر اور مانجھ دھو کر ان کی پوجا کی جاتی اور پوجا کے بعد دوبارہ انہیں بکس میں رکھ دیا جاتا۔ کٹی کو شا لگ رام سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ اس کا سیاہ رنگ، خوفناک چہرہ اور چہرہ پر پڑی ہوئی لکیریں دیکھ کر کٹی ڈر جاتا تھا کٹی کی ماں شا لگ رام کا خصوصی احترام کرتی تھی اس لیے بچپن ہی سے کٹی کے دل پر اس کا اثر تھا ایک دن وہ شا لگ رام میں کھو گیا۔

یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے۔ کٹی دریا کے پل پر جا رہا تھا۔ بکس سر پر رکھا تھا۔ گاڑی کی پٹری پر ہی چل رہا تھا۔ جاتے جاتے اس نے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو ڈاک گاڑی چلی آ رہی تھی۔ کٹی پٹری پر ہی آگے بھاگا لیکن گاڑی کی رفتار کا وہ بھلا کیا مقابلہ کر سکتا۔ دوسرے اس کے سر پر بھگوان کی مورتیوں کا بھاری بکس تھا۔ پل کے دونوں جانب لگے ہوئے لکڑی کے بلیپر آگے کی طرف چھوٹے ہوتے چلے گئے تھے اور ان کے سہارے بھی کھڑا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ اتنا بھاگنے کے باوجود بھی پل ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا آخر کٹی بھگوان کا نام لے کر ریل کی پٹری پر پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ بکس کے ڈھکن کو مضبوطی سے دبائے ہوئے تھے۔ اتنے میں گاڑی دھڑ دھڑاتی ہوئی سامنے سے گزرنے لگی۔ ڈر کے مارے کٹی نے اپنا سانس تک روک لیا تھا۔ اس کا سارا جسم پسینے پسینے ہو گیا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بھگوان نے اُسے مصیبت سے نجات دے دی کہ گاڑی کا آخری ڈبہ یعنی گارڈ کا ڈبہ سامنے سے گزرا۔ اس ڈبے میں جارج، ہیڈ کلرک جوشی، آنگڑی تحصیلدار، دیپائی جی وغیرہ گارڈ کے ساتھ کھڑے تھے۔ جارج گارڈ کا ہاتھ پکڑے "نہیں نہیں" کہے جا رہا تھا لیکن گارڈ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اپنا موٹا ڈنڈا کٹی کی پیٹھ پر دے مارا۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ اس افراتفری میں کٹی کے سنبھلنے کے باوجود مورتیوں کے

بکس کا ڈھکن کھل گیا اور تمام مورتیاں ندی میں گر گئیں کٹی نے ان کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن شا لگ رام کے علاوہ کسی مورتی کو اپنی گرفت میں نہ لے سکا۔ کٹی نے شا لگ رام کو مضبوطی سے اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ شا لگ رام بچ گیا تو ساری مورتیاں بچ گئیں۔ یہ سوچ کر وہ اسے جیب میں رکھنے جا رہا تھا کہ شا لگ رام نے اس کے ہاتھ میں کلبلانا شروع کر دیا۔

"ارے اس میں جان ہے کیا؟" کہہ کر کٹی نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھی۔

"مجھے کیوں پکڑ لیا؟ اتنے دنوں تم نے میری پوجا کی۔ اب مجھے چھوڑ دو۔ نالے میں روزانہ مجھ پر تھوڑا بہت پانی تو پڑتا رہے گا" یہ کہہ کر شا لگ رام نے اس کے ہاتھ سے نکل جانا چاہا۔ کٹی نے اس ڈر سے کہ کہیں یہ گر نہ جائے پھر اپنی مٹھی بند کر لی۔ لیکن شا لگ رام کٹی کی التجاؤں کے باوجود اس کی مٹھی میں کلبلاتا رہا اور آخر کار اس کی گرفت سے نکل گیا۔ کٹی بری طرح کانپنے لگا۔ اس کے سارے بدن پر پسینہ پانی کی طرح بہنے لگا۔ اس کی گھگی بندھ گئی اور وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کٹی کی آواز سے رتنا کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اور وہ شوہر کو خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی کٹی نے کہا "کتنا بھیانک خواب تھا" اور ٹارچ جلا کر گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بجے تھے۔ بیوی کے سامنے خواب بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کٹی اب بھی خوف کے مارے کانپ رہا تھا چنانچہ اس نے دروازہ کھول کر ماں کو جگایا۔

بہت دن سے کٹی نے ماں سے دل کھول کر بات نہیں کی تھی۔ بیوی سے باتیں کرنے پر ماں غصہ ہو گی یہ سوچ کر اس سے بھی کھلے طور پر بات چیت کم کرتا تھا لیکن اس رات ماں کو جگا کر اپنا خواب اسے تفصیل سے سنایا۔ خوفزدہ رتنا نے بھی رسوئی گھر میں دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر سب باتیں سنیں۔ خوف نے تینوں کے دلوں کو ایک رشتہ میں پرو دیا تھا۔

گنگوا نے بھی اتنے دن بعد اپنے پورے دل سے بات کی۔ بیٹے کا ڈر دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھائی۔ "کٹنا، تم ڈرو نہیں بیٹا، شا لگ رام ہمارے خاص دیوتا ہیں۔ تمہارے پتا جب تک زندہ رہے انہیں اس پر بہت اعتقاد رہا۔ جب وہ مرے تو تم بہت چھوٹے تھے۔ یہ سوچ کر کہ شا لگ رام کی پوجا میں کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے تو میں نے اسے ٹرنک میں رکھ دیا تھا۔ دیوتا غصہ نہیں کرتے ہیں۔ یکساں اعتقاد رہنے سے تمام دیوتا خوش رہتے ہیں۔ تم ڈرو نہیں۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو اب تم میری پوجا کرو، یہی آگاہی بھگوان شا لگ رام نے تمہیں دی ہے۔ اسے تم اپنے بزرگوں کی نیکیوں کا ثمرہ سمجھو۔ ابھی تم چھوٹے ہو۔ شا لگ رام کو بھول گئے ہو لیکن میں کیسے

بھول سکتی ہوں بھیا۔۔۔۔۔ ہمیں پہلے دولت دینے والا بھی وہی تھا۔ غریبی میں ہماری حفاظت کرنے والا بھی وہی ہے۔ تمہاری پوجا کے بعد روزانہ میں گھی کا ایک دیا جلاتی ہوں بھیا۔ اگر وہ ناراض بھی ہیں تو زیادہ ناراض نہیں ہوں گے۔"

"وہ دیا تم شا لگ رام کے نام سے جلاتی ہو کیا؟"

ماں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ بات سننے کے بعد خوف زدہ رتنا کے دل میں اس تلخ گفتار بڑھیا کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ کٹی کو ایسا محسوس ہوا گویا ماں نے ہی اس کی حفاظت کی ہے۔ ماں اسے زہد و تقویٰ کا جیتا جاگتا پیکر نظر آئی۔ اسی دن شا لگ رام بکس سے نکل کر اپنی پرانی تانبے کی تھالی میں پھر سے براجمان ہو گئے۔ گنگوا بھی ماں کے درجہ پر فائز ہو گئی۔

کچہری جانے سے پہلے کٹی شا لگ رام کی پوجا کرتا اور دعا مانگتا کہ آج مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو۔ میری عقل ٹھیک رہے۔ میرا اثر کم نہ ہو، میری جیب میں پیسے بھی آتے رہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ گھر سے نکلتا۔ کبھی کبھی وہ شا لگ رام پر چڑھائی ہوئی تلسی کی پتیاں بھی اپنی جیب میں رکھ کر لے جاتا۔

دیوتاؤں میں شا لگ رام اور گھر میں ماں جس طرح مقدس تھے اسی طرح کچہری میں اس کے لیے جارج تھا۔ کٹی کی شادی کے چار پانچ مہینے بعد ہی جارج کی شادی ہو گئی۔ اب اس کے ایک لڑکا بھی تھا۔ جارج کسی ستون کی طرح غیر متحرک تھا۔ تلون اور اضطراب کے ہاتھوں آشفتہ کٹی کے لیے وہ پرسکون زندگی کا ایک نمونہ تھا اور اس طرح غیر محسوس طور پر وہ کٹی کے لیے ایک سہارے کا کام دیتا تھا۔ جس طرح گھر میں شا لگ رام کے سامنے ماں بلا ناغہ گھی کا دیا جلانے والی ماں تھی اسی طرح دفتر میں جارج تھا جو شام کو دوبارہ چائے نہیں پیتا تھا۔ کام کیے بغیر کسی سے پیسہ نہ لیتا تھا۔ اُمید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا اور کسی کو نصیحت نہیں کرتا تھا۔ یہ دونوں ہستیاں کٹی کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی تھیں لیکن ان کی بلندی تک پہونچ جانا کٹی کے بس کی بات نہ تھی۔ نیکی کا سر چشمہ کیا ہے؟ اس کے علماء نے بے شمار جوابات دیے ہیں۔ نیکی کا جنم اگر معاشرتی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہوا ہے تو مختلف معاشروں میں نیکی کا معیار اور تصور مختلف ہونا چاہیے تھا لیکن نیکی کا حقیقی تعلق کردار سے ہے۔ کچھ لوگ کوشش کے بغیر ہی اس کو حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی حقیقت میں عالی مرتبت ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کے سکون کو دیکھ کر ہی

بے چینی سے پریشان لوگ اس اصول کا مطلب سمجھتے ہیں کہ سکون میں ہی راحت ہے۔ اگر کوئی یہ نظریہ پیش کرے کہ شام کو ایک بار چائے پی کر ہی سکون حاصل کیا جا سکتا ہے تو یہ ایک انتہائی احمقانہ اور مضحکہ خیز تصور ہوگا۔ یا اصولوں کو ڈھونڈھے بغیر جارج کی شخصیت کو نمونہ بنا سکتے ہیں۔ اس صورت میں شخصیت پرستی کا الزام آتا ہے۔ کٹی جیسے لوگ اپنی بے بضاعتی کی مذمت کرتے ہوئے ایسے لوگوں کی تعریف کرتے ہیں اور ان کی زندگی کے مقابلے میں انھیں اپنی زندگی افسوسناک معلوم ہوتی ہے لیکن اگر خوش قسمتی سے شالگ رام کی مدد شامل ہو جائے تو اس قسم کے لوگ بھی کسی نہ کسی طرح کچھ سکون حاصل کر لیتے ہیں۔

نادانستہ طور پر جارج نے کٹی کو خود احتسابی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ ایک دن کٹی کو ایک بڑا اسٹیٹمنٹ چھٹی سے پہلے ہی تیار کر کے دینا تھا۔ کچہری کا وقت ختم ہوتے ہی جارج کٹی کے پاس آیا۔ کٹی نے یونہی ہنسی میں اس سے کہا: "جارج، ذرا تم اسے پڑھ کر بولتے جاؤ، اگر تم میری مدد کرو گے تو کرشن اپا کے یہاں کے دوسے کھلاؤں گا۔" جارج نے خندہ پیشانی سے وہیں کھڑے کھڑے بولنا شروع کر دیا۔ اس میں ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ سات بج چکے تھے کام ختم ہوا تو کٹی کے سامنے ایک اخلاقی دشواری پیدا ہوئی۔ جارج شام کو کچھ نہیں کھاتا تھا لیکن جارج نے ڈیڑھ گھنٹہ تک اس کی مدد کی اور پھر کٹی اس سے دوسہ کھلانے کا وعدہ بھی کر چکا تھا۔ اس لیے کچھ بھی ہو اسے اصرار کر کے دوسہ ضرور کھلانا چاہیے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ جارج کے ساتھ چل پڑا۔ مشن کمپاؤنڈ کے موڑ پر جارج مڑنے لگا۔ کٹی نے جارج کو ہوٹل کی طرف لے جانے کی کوشش کی اس پر جارج نے اس سے کہا "گھر میں اسٹیفن انتظار کر رہا ہوگا۔ ہوٹل جاؤں گا تو گھر پہونچنے میں اور بھی دیر ہو جائے گی"۔ . . . یہ سن کر کٹی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ساری دنیا اس کا مضحکہ اڑانے کے لیے اندر ہی اندر منصوبہ بنا رہی ہے۔ اسٹیفن (جارج کا دوسرا بیٹا) بیمار تھا۔ یہ بات جارج نے اسے پہلے نہیں بتائی تھی۔ خندہ پیشانی سے ڈیڑھ گھنٹہ تک کٹی کا کام کرتا رہا اس لیے وہ اسے دوسا کھلانا چاہتا تھا۔ یہ تمام باتیں سوچ کر کٹی دل ہی دل میں حیران ہو گیا۔

ایک بار کٹی بڑے دن پر ان کے گھر گیا۔ جارج بیوی کے ہر حکم کی خوشی خوشی تعمیل کر رہا تھا۔ جارج کی اس کیفیت کو دیکھ کر اس نے دل میں سوچا "یہ تو پورے درجے کا زن مرید ہے گھر میں بیوی کا ہی بول بالا ہے۔" اس سے کٹی کو یہ اطمینان ہوا کہ چلو کچھ اور نہیں تو اتنی خامی تو بہرحال جارج میں موجود ہے کہ وہ جورو کا غلام ہے۔ کٹی کے گھر میں صورت حال اس کے

بالکل برعکس تھی۔ شادی کے ابتدائی زمانے کا جوش ختم ہو جانے کے بعد رتنا بھی دوسری عام بیویوں کی طرح ہو گئی تھی لیکن رتنا جب بیمار پڑی تو کٹی رات دن متفکر رہنے لگا۔ اس زمانے میں وہ کچہری کا کام بھی ٹھیک سے نہ کر پاتا تھا۔

سارا کے بچہ پیدا ہوتے وقت کٹی سائیکل پر بیٹھ کر سول اسپتال پہونچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ جارج ویٹنگ روم میں بیٹھا نہایت اطمینان سے اخبار پڑھ رہا ہے۔ پاس کے وارڈ سے سارا کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی سارا کی چیخیں سن سن کر کٹی کا دل ہلا جا رہا تھا لیکن جارج بے فکری سے ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی میں منہمک تھا گویا یہ کوئی ایسی بات ہی نہ تھی جس کے لیے آدمی اپنے ہاتھ پاؤں پھلائے۔

23

کٹی کا دورہ

بغیر خواہش کے بھی انسان کو گناہ پر راغب کرنے والی طاقت کون سی ہے۔ انسان روز ازل سے یہ سوال پوچھتا چلا آ رہا ہے۔ اس سوال کا جواب جو کچھ بھی ہو لیکن ایسے لوگوں کو دھرماتما ہی کہنا چاہیے جنہیں گناہ سرزد ہو جانے کے بعد اس پر ندامت کا سچا احساس ہو۔ سرکاری دوروں کے موقع پر جس افسر کا پاؤں نہ پھسلے وہ یا تو بہت بڑا عبادت گزار ہے یا پھر نرا احمق!

اس زمانے میں دورہ پر جانے والے محکمۂ مال کے ملازمین کی وہی حالت ہوتی تھی جو چھاؤنی سے چھوٹے ہوئے فوجیوں کی ہوتی ہے۔ گھر کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی روزانہ مرغن مال کھانا، لوگوں پر رعب جمانا، گپ شپ، اپنے اختیارات کو بار بار آزمانے کی خواہش، یہ سب مل کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان دوروں کے زمانے میں افسروں سے ہر وقت ایک قریبی تعلق بنا رہتا ہے، ماتحت ہرکارہ گوڑا، کلکرنی آگے پیچھے دوڑتے ہیں۔ دورے کے اس بے فکری کے زمانے میں اگر ایک تجربہ کار کلرک ساتھ ہو تو پھر کیا کہنا!

اس بار دورہ پر ہیڈ کلرک جوشی رام رائے کے ساتھ کٹی کو جانا پڑا۔ جوشی کے دورے مشہور تھے اس کے کارنامے محکمۂ مال کے ریکارڈ میں سنہری حروف میں درج کیے جانے کے

قابل تھے۔ ایک بار اس نے چری کے کھیت میں گاؤں کی ایک عورت کو یہ کہہ کر دھمکا دیا تھا کہ تم پر جرمانہ لگاؤں گا۔ ایک دوسری بار تحصیلدار کو چوپال پر بٹھا کر خود پچھواڑے کے کمرے میں محبت کا کھیل رچا یا تھا۔ غرض اس کے متعلق ایسی بے شمار کہانیاں مشہور تھیں۔ اکثر رات کو تاش کھیلتے وقت اس کے دوست ان کے ان کارناموں کا ذکر کرتے۔ اس کا وہ یہی جواب دیتا "ا دئے تم لوگوں کا کچا چٹھا بھی مجھے خوب معلوم ہے۔ سناؤں تمہارا ایک آدھ کارنامہ" لیکن وہ ان لوگوں کے مذاق کا کبھی برا نہیں مانتا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں ایک بار کٹی نے بھی اس کو چھیڑا لیکن جونہی رام رائے کو اس سب سے جونیر کلرک کا مذاق اچھا نہ لگا۔ فوراً اس کی طرف رخ کر کے اسے للکارتے ہوئے بولا "کرشنا جی، دوسروں کو دیکھ کر ملامت کرو تمہیں کھایا ہوا ہضم نہ ہوگا۔ تمہاری بھی پول کھول دوں۔" جب کٹی نے اس سے یہ کہا کہ "یہ سب تمہیں کو مبارک ہو" تو رام رائے نے لحاظ کیے بغیر اس سے کہا "مجھے معلوم ہے تو مرد نہیں ہے!" یہ سن کر تاش کھیلنے والے سب ہی لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ رام رائے اس قسم کا پست مذاق کرتا تھا لیکن کٹی کو ایسا لگا جیسے وہ اس کے لاولد ہونے پر طنز کر رہا ہے اس لیے وہ فوراً گمبھیر ہو گیا۔ اتنا ہی نہیں ایک دوسرے کلرک نے بھی کٹی کو یہ کہہ کر چھیڑا "رامنا، کیوں جلد بازی کرتے ہو، بچوں کا سکھ ہی کیا ہوتا ہے! چار دن موج کرنے دو۔ ایک بار بچے پیدا کرنے شروع کیے تو تمہیں بھی پیچھے چھوڑ دے گا۔" ایک اور کلرک یوں گل افشانی کرنے لگا "کٹا جی، اپنے سسر کو دیکھ کر سبق حاصل کرو، بڈھا ہو گیا پر لت نہیں گئی۔ اس کے داماد بن کر بھی تم نے اپنی لٹیا ڈبو دی۔" جونہی رام رائے صرف باتوں کی حد تک ہی کٹی کو ڈھیلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ایک باقاعدہ منصوبہ تھا۔ جو بھی اس کے جال میں پھنس جاتا وہ کوئی نہ کوئی غلطی ایسی کر بیٹھتا جس سے رام رائے کو اسے کھری کھری سنانے کا موقع مل جاتا۔ اسی وجہ سے جب وہ رام رائے کو چھیڑنا شروع کرتے تو وہ ان لوگوں کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیتا تھا کہ اسے بھی ان کی پول پٹی اچھی طرح معلوم ہے۔ کٹی کے سلسلے میں بھی رام رائے نے اپنے دوستوں کے سامنے یہ عہد کر رکھا تھا۔ "اس لونڈے کو بہت مستی چڑھی ہے۔ اس بار میں اس کی ساری مستی جھاڑ دوں گا۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ اس کی ساری مستی جھاڑ دی گئی۔

اس بھیانک تجربے نے کٹی کو جڑ سے ہلا دیا۔ پتہ نہیں اس کے لیے وہ تیار کیسے ہو گیا۔ یہ وہ خود نہ سمجھ سکا۔ اس گندگی، اس غلاظت کو دیکھ کر بھی پتہ نہیں وہ کیوں پیچھے نہیں ہٹا۔

پتہ نہیں راگھپا کا داماد ہونے کا غرہ تھا یا دورے کا اثر یا رام رائے کے طعنوں کا نتیجہ یا نئے تجربہ کرنے کا شوق ـــــ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا وہ اکثر سوچتا تھا کہ یہ حرکت اس سے کیسے سرزد ہوئی۔ وہ رازداری، وہ خوف، وہ گندگی اور پھر اس کے ضمیر کی ملامت۔ ایک ایک بات کو یاد کرکے وہ لرزجاتا ایک ایک بات اُسے بار بار یاد آتی۔

"کرشنا جی، تم پہلے ہو آؤ، میں یہاں کھڑا ہوں" یہ یاد کرکے وہ تھو تھو کہہ کر تھوک دیتا کلرکوں میں اس واقعہ کی بڑی جلدی شہرت ہوگئی۔ اُن کے سامنے اپنے کاغذات دیکھتے ہوئے بھی وہ تھو تھو کرتا جاتا۔ وہ اکثر سوچا کرتا "کیا وہ یہ گندگی سہ پائے گا۔" رام رائے کی چوکڑی میں اس کا نام "تھو کلکرنی" پڑ گیا۔

کیمپ کے ختم ہونے کا دن تھا۔ اتنا کچھ کرڈا لینے والے، چھوت چھات کے پابند کلکرنی نے گھی میں تلے پکوڑے کھا کر کیمپ اٹھانے کی تیاری کی۔ رام رائے نے گوڑ پر رعب جماتے ہوئے کہا "گوڑ جی، آج عمدہ قسم کا مکھن آنا چاہیے لیکن ہو ایک ہی گھر کا۔ دلالوں کی طرح ادھر ادھر کا اکٹھا کرکے، تھوڑا گائے کا تھوڑا بھینس کا، تھوڑا بکری کا، تھوڑا گدھی کا ملا کر لاؤگے تو تحصیلدار صاحب کیسے کھائیں گے، یہ سوچ لو" گوڑ نے حکم کی تعمیل میں اپنے معتمد کسان کے گھر سے ہی مکھن لاکر دیا۔ تو پنا کا مکھن سارے گاؤں میں مشہور تھا۔ مکھن گرم کرنے پر آگ پر رکھا گیا۔ گھی گرم ہو کر خوشنما گلابی رنگ کا ہو گیا۔ رام رائے نے کہا "ایسا اچھا گھی سارے دورے میں کہیں نہیں دیکھا۔ جانے سے پہلے اس مکھن کو دینے والے گوڑ سے دو روپیہ نقد انعام اور جھاڑنا چاہیے۔ اس پر چپا کو ایک بات سوجھی۔ وہ بولا، ایسے گھی میں ایک دو پتے امباڑی پان کے ڈال دیے جائیں تو مزا آجائے" ــــ فوراً ایک آدمی کو پان لینے بھیجا گیا لیکن معلوم ہوا کہ امباڑی پان ختم ہوچکے ہیں رام رائے نے ایک اور آدمی کو پان لینے بھیجا لیکن سارے گاؤں میں کہیں بھی امباڑی پان نہ ملے تو وہ کالے پان کے پتے ہی لے آیا۔ کچھ دیر پہلے معلوم ہوتا تو ہرکارہ کو دوسرے گاؤں بھیج کر پان منگائے جاسکتے تھے ــــ لیکن اب وقت نہ تھا۔ ادھر گھی خوب کھولنے لگا تھا۔ رام رائے چلایا "ڈالو، کالے پان ہی ڈالو۔ سالا ہمارا کیا جائے گا"

اس کے ساتھیوں میں سے ہر ایک نے ایک ایک دو دو پان اپنے اپنے نام کے گھی میں ڈال دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچیس تیس پان گھی میں پڑ گئے۔ گھی کی خوشبو کے ساتھ جلتے ہوئے

پانوں کی خوشبو بھی سارے چوپال میں پھیل گئی۔ چولھے پر سے پتیلا اتارا گیا۔ گھی کی چمک کم ہوگئی تھی اور اس میں جھاگ اٹھ رہے تھے۔" ارے یہ کیا ــــ سارا گھی ہرا ہوگیا" رام رائے بولا۔ "گھی کیا کرے گا ایک سو پان تو اس میں ڈال دیے۔"

تب لچیا بولا "مکھن میں اس نے کہیں زہر تو نہیں ملا دیا"

اسے سن کر رام رائے نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولا "اسے بلا کر لاؤ۔" ہرکارہ آیا تو اس سے کہا "جاؤ اس مکھن دینے والے کو بلا کر لاؤ اور اس گوڑ کو بھی بلا کر لے آنا۔"

وہ بدبخت کھانا کھانے بیٹھا ہی تھا کہ بلاوا آگیا۔ گھبرا کر دوڑا ہوا آیا۔ گوڑ پہلے ہی وہاں پہونچ چکا تھا۔ رام رائے نے تحقیقات شروع کی۔

"کیوں بھائی، تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام تونپا ہے صاحب"

"اسی گاؤں کے رہنے والے ہو کیا؟"

"جی صاحب"

"تمہارے کھیت کا لگان اس بار زیادہ لگا ہے کیا؟"

یہ سوچ کر کہ مکھن سے خوش ہو کر صاحب لگان کم کر دیں گے تونپا خوشی سے بولا "جی صاحب"

"تو تم نے ہمیں زہر کھلانے کو سوچا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں صاحب" تونپا نے بات نہ سمجھ پانے کی وجہ سے پوچھا۔

رام رائے نے ایک دم سے طیش میں آکر کہا:

"زہر ہے رے ۔ ۔ ۔ تیری جورو کی ۔ ۔ ۔ ۔ زہر کھا کر مر جائیں گے۔ دیکھا۔ ابھی پاگل کتے کو کھلا کر دکھاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ سچ بتا۔ بدمعاش کہیں کا ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ اس پتیلے میں۔"

ہکا بکا ہو کر تونپا نے پتیلے میں جھانک کر دیکھا۔ گھی کے ہرے رنگ کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

"باپ رے، یہ کیا ہوگیا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا صاحب"

"تیری سمجھ میں کیسے آئے گا رے، تو تو بہت ایماندار آدمی ہے نا۔ تو سرکاری افسروں کو زہر دینے والا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں رے افسروں کو مار کر بڑا بنے گا اچھی بات ہے۔ کچھ دن جیل کاٹے گا تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔ لکشمن راؤ شکایت لکھواؤ۔ اس کا بیان لو۔ پولیس کے چاٹیل صاحب بھی یہیں ہیں۔ گوڑ صاحب آپ کو اس معاملے میں گواہی دینی پڑے گی۔"

"باپ رے۔ مجھے کیوں جیل ۔ ۔ ۔ ۔"

"گوڑ صاحب، بتائیے اسے اس نے کیا کیا ہے۔"

گوڑ نے تونپا کو سمجھایا: "سرکاری افسروں کو لگان زیادہ لگانے کے سبب زہر دے کر مارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ فوجداری کا مقدمہ اس پر کیا جا رہا ہے"۔ ۔ ۔ ۔ گھبرا کر تونپا نے رام رائے کے پاؤں پکڑ لیے۔ رام رائے نے گوڑ کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ اس سے پچیس روپیہ جرمانہ وصول کیا جائے۔ تونپا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور نہ معلوم کہاں کہاں سے اکٹھا کر کے پچیس روپیہ پورے کیے اور بھاگا ہوا آیا اور روپیہ رام رائے کے قدموں میں ڈال کر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ رام رائے نے بڑی گمبھیرتا سے کہا۔ "صرف جرمانہ دینے سے کام نہیں چلے گا تونپا' پھر کبھی ایسا نہیں کرو گے' اس بات کی اپنے کل دیوتا کے نام سے قسم کھانا ہوگی۔ چلو قسم کھاؤ"۔ تونپا نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر قسم کھائی اور یہ سوچ کر کہ ایک بڑی بلا ٹل گئی وہ فوراً وہاں سے کھسک گیا۔

گوڑ صاحب اپنے گھر چلے گئے تو اسی گھی میں سارے افسروں نے تونپا کا نام لے کر دعا دیتے ہوئے خوب تر بتر کھانا کھایا۔ پچیس روپیے جو نقد ہاتھ آئے تھے انھیں آپس میں برابر تقسیم کر لیا۔ کٹی کے حصہ میں بھی تین روپیہ آئے۔ اس نے شرم کو تو رخصت کر ہی دیا تھا۔ جو آتا ہے آنے دو یہ سوچ کر روپیہ چپکے سے جیب میں ڈال لیے۔

دورے سے واپسی پر کچہری میں کٹی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے رام رائے نے کہا۔ "واقعی تم سچے مرد ہو، ہمارے جیسے لوگ بھی پہلے ہی دورے میں اتنی گہرائی میں نہیں اترے تھے۔ تم نے تو ریکارڈ ہی توڑ دیا۔"

دوسرے لوگوں نے بھی کٹی سے کہا "تمہاری جتنی ہمت ہم میں نہیں ہے۔"

کٹی نے یہ سوچا تھا کہ اس نے بھی وہی کیا ہے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں لیکن اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ سب سے آگے بڑھ گیا تھا۔

جب کٹی کوئی غلطی کرتا تھا اور دوسروں سے ڈانٹ کھاتا تھا تو اسے کم از کم یہ طمانیت ضرور رہتی تھی کہ وہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو لیکن جارج کو چھوڑ کر باقی سب سے ضرور اچھا ہے۔ اسے اس خیال سے بڑی تقویت ملتی تھی لیکن اب یہ بات مع ثبوت ثابت ہو گئی تھی کہ اس کا یہ گھمنڈ جھوٹا تھا۔ لیکن اصولی طور پر وہ اب بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ وہ رام رائے سے

نیچا ہے لیکن حقیقت حال سے انکار ممکن نہ تھا۔ اس کے اپنے چاروں طرف بیٹھے ہوئے عام لوگوں کی بھی ایک بڑائی ہوتی ہے کیا وہ اس کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ سوال بار بار اس کے دل میں آتا لیکن بہت سوچنے پر بھی وہ اس کا کوئی جواب نہ تلاش کر سکا۔

رتنا کے پاس جاتے ہوئے اسے ڈر سا لگنے لگا۔ ماں سے بات کرنے میں اسے شرم آنے لگی تھی۔ اُسے یہ ڈر لگنے لگا کہ پوجا میں اس کے چھونے سے کہیں شالگ رام ناپاک تو نہ ہو جائے گا۔ غرض اسے اپنی زندگی ہی بے لطف معلوم ہونے لگی۔ اُسے ٹھیک سے نیند نہ آتی تھی۔ نیند میں بڑبڑانے کی عادت بھی بڑھنے لگی تھی۔ اکثر اس کا دل چاہتا کہ چپ چاپ بیٹھا رہے۔ اگر اس کے اس سکوت کو توڑ کر کوئی بات کرنا چاہتا تو اس کو غصہ آ جاتا۔

کچہری میں اس کے کارنامے کی شہرت پھیلتے دیر نہ لگی۔ پتہ نہیں کیوں جب دوسرے لوگ اسی کی طرح رام رائے کا شکار ہوئے تھے تو اتنا شور کیوں نہیں ہوا تھا۔ یا تو کٹی کے احساس برتری کی وجہ سے یہ اس کی کم عمری کے سبب یا پھر اس کے چہرے پر ایک ندامت سی جو ہر وقت طاری رہتی تھی اس وجہ سے لوگ اس سے بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔

اُسے ڈر تھا کہ کہیں یہ بات جارج کے کانوں تک نہ پہونچ گئی ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ بجائے اس کے کہ اس کو یہ بات دوسروں کی زبانی معلوم ہو یہ اچھا ہو گا کہ وہ خود اسے سب کچھ بتا دے۔ پھر جارج کے علاوہ ایسا تھا ہی کون جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔ چنانچہ ایک دن اس نے سب کچھ جارج کو بتا دیا۔ اس نے اپنی ذہنی کیفیت کو جارج پر پوری طرح واضح کر دیا۔ حیرت یہ تھی کہ اس کی کہانی سارے دفتر میں عام ہونے کے باوجود جارج کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی کٹی کی ذہنی اذیت کا اس کے پاس کوئی مداوا نہ تھا۔ نصیحت کرنے کا وہ ویسے بھی قایل نہ تھا وہ تو صرف اپنے پاک کردار کا عملی نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ دیکھنے والے اس سے جتنا چاہیں سیکھ سکتے تھے۔ کٹی کی ذہنی اذیت کو وہ اچھی طرح سمجھ گیا لیکن اس نے کٹی سے صرف اتنا ہی کہا کہ "اپنی صحت کا خیال رکھیے۔"

24
دیسائی جی کے ساتھ کشمکش

راگھپا پان لگاتے لگاتے کٹی سے بولا۔ "ایسے بناوٹی بزرگوں کو راہِ راست پر لانا چاہیے۔"

پیسے کے معاملے میں ڈھیل دینا ٹھیک نہیں۔ اب اگر کسی کی عزت جائے گی تو تمہاری ہی جائے گی۔ دیسائی جی کا کیا بگڑے گا۔ تمہارے گھر کے پیسے کو دبائے بیٹھا ہے۔ جہیز کا پیسہ بھی دبا رکھا ہے۔ ایسے ہی ایک دن سارا پیسہ ہضم کر کے بیٹھ رہے گا ادھر تم بیاج دیتے دیتے پریشان ہوئے جا رہے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ تم بات تو اٹھاؤ۔ جب بات ہم تک آئے گی اس وقت ہم بھی سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

بات یہ تھی کہ بردکشنا کے روپیہ گنگوا نے لے کر سارے کے سارے دیسائی جی کے پاس رکھ دیے تھے ادھر کٹی نے بردکشنا کے بھروسے پر قرض لے لیا تھا۔ شادی کی خوشی میں اس نے ماں سے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا۔ قرض اپنی تنخواہ سے تھوڑا تھوڑا ادا کرتا رہوں گا، اس طرح یہ روپیہ بچ جائے گا۔ اس جوش اور جذبے کے ساتھ کٹی نے اپنی ازدواجی زندگی شروع کی تھی کٹی پہلے ہی پیسے سے تنگ رہتا تھا۔ اب یہ مزید بوجھ اس پر آن پڑا تھا۔ کچھ مہینے تکلیف اٹھا کر اس نے تھوڑا سا قرض چکایا لیکن اب مزید تکلیف اٹھانے کو اس کا دل نہ چاہتا تھا۔ رشوت کے سارے پیسے چائے پانی میں اڑ جاتے تھے۔ اس طرح دو سال میں قرض کا بیاج دینا بھی اُسے کھلنے لگا تین ماہ میں ایک بار جب وہ بیاج دینے نکلتا تو اداس دل سے نکلتا۔ شادی کا جوش بھی اب ختم ہو گیا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس کی پریشانی کو دیکھ کر شاید ماں خود ہی بردکشنا کا پیسہ دے دے گی لیکن ماں نے اس معاملے میں سکوت اختیار کر رکھا تھا۔

راگھپا کو یہ سب باتیں معلوم تھیں۔ رتنا اسے کبھی کبھی یہ باتیں بتایا کرتی تھی لیکن وہ خود اس معاملے میں زبان نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ اُسے یہ انتظار تھا کہ کٹی اس بات کو اٹھائے۔ دیسائی جی کا بناوٹی بڑا پن اسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کی باوقار شخصیت اس کی غیر سنجیدہ خصلتوں کا مذاق اڑا رہی ہو۔ دیسائی جی نے گنگوا کی خواہش کے مطابق شادی کے ایک سال بعد راگھپا کو بلا کر کٹی کو متبنیٰ کرنے کے متعلق گفتگو کی تھی۔ شادی کے بعد راگھپا کی گرم جوشی اس معاملے میں ختم ہو گئی تھی چنانچہ اس نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ یہ کام اس کی دوسری بیٹی کی شادی کے بعد ہوگا۔ اس پر دیسائی جی نے اُسے بتایا تھا کہ اُس نے اس معاملے میں جو قول و قرار کیے تھے اس میں تو ایسا نہیں تھا لیکن راگھپا نے کہا کہ قانونی نکتہ اس کے حق میں ہے۔ دیسائی جی کو اس کی بات ٹھیک لگی پھر بھی انھوں نے اصرار کیا، دوسری لڑکی کی شادی پر دل کھول کر

خرچ کیجے لیکن گود لینے کی رسم ہو جانی چاہیے۔" لیکن راگھپا بولا "نہیں پہلے شادی ہو جائے، بعد میں سب کچھ کتنا کا ہی ہے،" یہ سن کر دیسائی جی لاجواب ہو گئے۔ ویسے بھی صرف چار سال کی بات اور تھی۔ اس لیے دیسائی جی نے گنگوا کو اطمینان دلا دیا۔ اس سے دیسائی جی کی پوری طرح شکست تو نہ ہوئی لیکن ان کا وقار تھوڑا بہت ضرور مجروح ہوا۔ انہیں راگھپا کی نیت پر کچھ شک بھی ہوا لیکن انہوں نے اس کو ظاہر نہیں کیا۔ گنگوا کو سمجھاتے ہوئے کہا "ٹھیک تو ہے۔ اب دوسری شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ قول و قرار تو بہرحال پختہ ہی ہے" پھر بھی انہوں نے راگھپا سے کہا "اگر آپ قول سے پھر جائیں تو؟"

راگھپا نے اپنے دل میں کہا "اوہو، دیسائی تیری یہ ہمت کہ تو مجھ سے ایسا کہہ رہا ہے۔" اور اس دن سے وہ دیسائی جی کو گھیرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

اس کے احمق داماد کو ایسا موقع فراہم کرنے میں اتنے سال لگ گئے۔ آخر کتنا نے وہ موقع دے ہی دیا۔ اس نے ایک دن اپنے سسر سے مل کر اپنی بردکشنا اور قرض کی بات اسے تفصیل سے بتائی۔ اس نے کہا "مجھے اپنی ماں کے تدبر پر یقین ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ جو کچھ کرتی ہے میری بھلائی کے لیے کرتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے سود دینا پڑتا ہے اور جارج کے سامنے جھوٹا بننا پڑتا ہے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ماں نے دیسائی جی کے پاس جو روپیہ رکھا ہے اس کا کوئی کاغذ رقعہ نہیں ہے۔ آج کل حالت یہ ہے کہ کاغذات صحیح ہونے پر بھی لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ہم روزانہ ایسے معاملات اپنی کچہری میں دیکھتے ہیں۔ دیسائی جی تو بہت بھلے آدمی ہیں لیکن آج کل کا زمانہ ہی خراب ہے۔"

راگھپا نے دیسائی جی کے خلاف کٹی کو بھڑکانے کی بات پہلے ہی سوچ رکھی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گود لینے کے معاملے کو ملتوی کر دینے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کٹی کو بھی اس کی نیت پر شک ہو گیا ہو اور اس طرح دیسائی جی کی عقیدت اس کے دل میں زیادہ ہو گئی ہو۔ دیسائی جی کی اس عقیدت کو کٹی کے دل سے ختم کر کے ہی اسے شیشہ میں اتارا جا سکتا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی پوزیشن کو مضبوط بنایا۔ کٹی سے اس نے کہا "کتنا میں تمہیں دھوکا نہیں دیتا ہوں۔ میرے لیے تم میں اور رتنا میں کیا فرق ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں تو کوئی فرق نہیں۔ تم میرے بیٹے کی طرح ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دیسائی جی سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ دے دیں تو ٹھیک ہے ورنہ صاف صاف بات کرنا پڑے گی" یہ نصیحت کر کے

اسے دیسائی جی سے صاف صاف بات کرنے پر اکسایا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ قرض کے معاملے میں دیسائی جی اور کٹی کا جھگڑا ہوگا تو وہ "ثالث بن کر اپنا فیصلہ سنائے گا۔"

کٹی دو تین دن بعد ہمت کرکے دیسائی جی کے گھر گیا۔ اس نے ماں کو نہیں بتایا تھا کہ وہ دیسائی جی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ دیسائی جی بیٹھے ہوئے جنتری دیکھ رہے تھے۔ کٹی کو انھوں نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ کٹی نے یوں ہی جھوٹ موٹ ان کی مزاج پرسی کی اور بناوٹی عاجزی دکھاتے ہوئے قرض کا معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ دیسائی جی نے پوچھا "کتنا قرض لیا ہے؟"

"پانچ سو روپیہ"

"مجھ سے مانگا ہوتا تو کیا میں نہیں دیدیتا؟ خیر، اب جانے دو، یہ بات ہوئے اب چار پانچ سال گزر گئے ہیں۔ اب تک کتنا ادا کرچکے ہو؟"

"پیسے بچتے ہی نہیں۔ اصل میں سے کل چالیس روپیہ ادا ہوئے ہیں۔ صرف سود دے رہا ہوں۔"

دیسائی جی ناراض ہو کر بولے "تمہیں یہ بات کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔"

کٹی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بردکشنا کی بات کیسے اٹھائے۔ دیسائی جی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "اچھا لڑکا ہے، اچھی طرح گرہستی چلائے گا۔ یہ سوچ کر ہم نے درمیان میں پڑ کر تمہارے لیے کچھ کیا لیکن تمہیں اپنی بیوی کو بس میں رکھنا ہی نہیں آتا۔ تم نے آج تک اپنی ماں سے یہ نہیں پوچھا کہ ماں تونے کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔ نوکری کرتے ہو، پانچ سو روپیہ ادا نہیں کرسکتے۔ اب میں اس میں کیا بتاؤں۔"

"میں نے سوچا تھا بردکشنا ملتے ہی ان لوگوں کا قرض ادا کردوں گا لیکن اب صرف سود ہی دے رہا ہوں۔ نوکری کے بھروسے پر جنہوں نے قرض دیا تھا وہ کب تک خاموش رہیں گے۔" کٹی نے ڈھٹائی سے کہا۔

"پھر نوکری ہی کیوں کررہے ہو۔ چھوڑ دو نوکری۔ تمہاری ماں کچھ نہ کچھ کرکے تمہیں اور تمہاری بیوی کو بٹھا کر کھلائے گی۔"

دیسائی جی کٹی کی بات کا مطلب سمجھ کر طیش میں آگئے تھے۔ ان کا غصہ دیکھ کر کٹی کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ اس نے سوچا میں نے غلط وقت پر سسر کی ہدایت پر عمل کیا پھر بھی

وہ ہمت کرکے بولا "اگر آپ اب چار سو ساٹھ روپیہ دے دیں تو اُن لوگوں کا قرض ادا کردوں تنخواہ میں سے آپ کو دیتا رہوں گا اس طرح درمیان میں پڑ کر قرض دلانے والے کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔"

"یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ اس کے علاوہ کیا ماں کی پانڑا والے پیسے تم نے ادا کر دیے۔ خیر انھیں چھوڑو۔ لیکن یہاں سے لے کر وہاں کا قرض ادا کرنے سے فائدہ کیا ہوگا؟"

"فائدہ تو کچھ نہیں۔"

کٹی کو اک دم شبہ ہوا کہ کہیں دیسائی جی نے بھانپ تو نہیں لیا ہے کہ وہ سسر کے اکسانے پر ایسی باتیں کر رہا ہے۔

دیسائی جی نے پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا کہ پیسے کے معاملے وہ سسر داماد کے بیچ میں نہیں پڑیں گے۔ لہٰذا انھیں ابھی اس بات پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لاچار ہو کر کٹی نے بات آگے بڑھائی۔

"شادی کرنے والا میں ہی احمق ہوں۔ قرضہ تو شادی کے لیے ہی لیا تھا لیکن کم از کم بردکشنا تو میرے ہاتھ میں آنی ہی چاہیے تھی۔"

یہ بات سن کر دیسائی جی کو شبہ ہوا۔ وہ سیدھے بیٹھ کر اُس کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر کٹی بڑے پس و پیش کے بعد رُکتے رُکتے بولا "سنا ہے ماں نے بردکشنا اور پہلے کے ایک ہزار روپیہ آپ ہی کے پاس رکھائے ہیں۔"

"خبردار، کیا سمجھ رکھا ہے۔"

"نہیں، نہیں، میں آپ سے مانگ نہیں رہا ہوں۔ لیکن یہ بات تو سچ ہے کہ روپے آپ کے پاس رکھے ہیں۔"

"نہیں کچھ نہیں رکھا۔ . . . . . ." یہ کہتے ہوئے دیسائی جی پسینے پسینے ہوگئے اور پھر جنتری دیکھنے لگے۔

ابھی وہ کچھ اور کہیں گے۔ یہ سوچ کر کٹی نے دس پندرہ منٹ انتظار کیا لیکن وہ اُسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔

اس تکلیف دہ خاموشی کا احساس کرکے کٹی نے کہا "اچھا میں چلتا ہوں۔"

"ہوں۔"

کٹی غصے سے پاؤں پٹختا ہوا دروازے تک گیا۔
پوری بات نہ کر سکنے کے باعث اُس کے دل کا غبار نہیں نکلا تھا اور غم و غصے سے اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ اس کے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ اتنی اثنا میں اسے کچھ خیال آیا اور وہیں سے کھڑے کھڑے بولا "آپ نے مجھ سے قسم لی تھی کہ ماں سے الگ نہیں ہوں گا، اور ماما جی سے تبنّی کرنے کی قسم لی تھی۔ اب آپ بھی سب کے سامنے قسم کھائیے کہ پیسے آپ کے پاس نہیں رکھے۔"
"موقع آنے پر قسم کھالوں گا" دیسائی جی نے جواب دیا۔
موقع پڑنے پر بھگوان تک سے مقابلہ کرنے کی زبردست ہمت ان میں موجود تھی۔ کٹی دروازہ سے باہر قدم رکھنے کو ہی تھا کہ دیسائی جی نے اُسے بلایا اور ایک غمزدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہنے لگے: "کرشنا، ذرا ادھر تو آؤ۔ تمھیں ایک بہت پرانی بات بتاتا ہوں تاکہ تمھیں معلوم ہوجائے۔ پہلے دھارواڑ ضلع کے یا ہوسا ئیلا پور میں ہمارا ایک گھر تھا۔ میرے منع کرنے پر بھی میرے باپ نے اُسے فروخت کر دیا جس کی وجہ سے میں اب تک ان کا شرادھ نہیں کرتا۔ تمھیں واضح رہے اس لیے یہ بتا رہا ہوں۔"
کٹی کو یہ بات سمجھنے میں ایک منٹ لگا۔ وہ پھر چلنے کو تھا کہ انھوں نے ایک تیر اور چھوڑا۔
"یہ بات اپنے سسر کو بھی بتا دینا تاکہ انھیں بھی معلوم ہوجائے۔"
کٹی نے یہ بات سن کر راگھپا بولا "آج سے میری اور دیسائی جی کی جنگ شروع ہے۔"
کٹی جھگڑے سے ڈرتا تھا لیکن کٹی کو اس نے یہ کہہ کر ڈانٹ بتائی۔ "تم چپ رہو۔ مجھ سے جو ہوگا وہ کروں گا۔ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ راگھپا سے ٹکر لینے والا بچ کر نہیں جاسکتا۔ دیسائی جی کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم رہنی چاہیے" یہ کہہ کر اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

25

راگھپا کی دورنگی

گزشتہ پانچ سال میں راگھپا بہت بدل گیا تھا۔ اس کا خاص سبب غالباً محبوب جان کی موت تھی۔ محبوب کی موت کے بعد راگھپا کے لیے زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ اس نے

چاہا تھا دیبائی جی کو قابو میں لانا لیکن وہ تو اس کے ہتھے نہ چڑھے، اس کی پیاری محبوب جان ہی چل بسی۔

محبوب کی موت بھی ایک لمبی داستان ہے۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ مسلسل ایک مہینہ ناٹک کمپنی میں کام کرنے کی طاقت اُس میں نہ تھی۔ راگھیا کو دیے ہوئے وچن کے مطابق پرمیشور خود اسے پینے پر مجبور نہیں کرتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں وہ خود اس سے مانگ کر پیا کرتی تھی۔ رات کو جاگنے کی عادت اسے ایک عرصہ سے نہیں تھی۔ غرض یہ کہ اسے الٹیاں آنا، سینے کا درد، دل کی دھڑکن اور اسی قسم کے مرض لاحق ہوگئے اور بڑھتے رہے۔ شاید ناٹک کمپنی پر ہی ادبار آرہا تھا اس لیے پرمیشور بھٹ کو بھی کوئی خاص آمدنی نہیں تھی۔ دھارواڑ ایک سراب کی طرح تھا۔ پتہ نہیں کب خوب آمدنی ہو جائے۔ یہ کہنا مشکل تھا۔ پرمیشور بھٹ کو فکرمند دیکھ کر وہ صرف ایک پیالی چائے پی کر اور تکلیف اٹھا کر کام کے لیے تیار ہو جاتی۔ بھٹ بھی اس کی جانفشانی سے متاثر تھا اور اس نے محبوب سے کہہ رکھا تھا کہ وہ زیادہ گلا پھاڑ کر نہ گائے۔ پہلے کی طرح اب وہ دونوں شو (SHOW) میں حصہ لینے کے قابل نہ تھی۔ بہرحال اس نے جیسے تیسے ایک مہینہ گزار دیا واپس لوٹتے ہی ہل نے اُسے دبا لیا اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہی اسے چکر آنے لگے۔ غذا بدن کو نہ لگتی۔ راگھیا اسے اسپتال لے گیا۔ وہاں وہ دو مہینے رہی۔ کچھ افاقہ ہوگیا تو گھر آگئی مگر پندرہ دن میں پھر وہی حالت ہوگئی۔ اس بار وہ اسپتال جانے کو تیار نہ ہوتی۔ "جیسی خدا کی مرضی" یہ کہہ کر دن رات بھگوان سے لو لگائے رہتی۔ کبھی کبھی اس حالت میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ راگھیا نے دل و جان سے اس کی خدمت کی۔ یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے اس نے اتنی تکلیف اٹھائی ہے راگھیا نے اُسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہر دوسرے تیسرے دن ہبلی آکر اپنے سامنے دوا کھلاتا اور دودھ اور پھل وغیرہ دیتا۔ دس بارہ مہینے کے بعد درد پہلے سے زیادہ شدت سے شروع ہوگیا اور اس کی وجہ سے بلغم، پت اور بخار کا زور بھی بڑھ گیا۔ راگھیا بھاگتا ہوا ہبلی پہونچا اور ایک مہینے تک وہیں رہ کر جان توڑ کر اس کی تیمارداری کی۔ راگھیا نے اسے موت کے منھ سے بچانے میں اپنی ساری انسانی قوت صرف کر دی۔ اس کی قوت دیکھ کر جیسے موت بھی ایک بار ڈر سی گئی۔ پندرہ دن تک موت اور زیست کی کش مکش میں گرفتار محبوب ایک دن صبح چار بجے کے قریب پسینہ میں نہا گئی۔ جس سے اس کا بخار فی الفور اتر گیا لیکن جاتے وقت موت اس کے چہرہ پر اپنی چھاپ چھوڑ گئی۔ اس وقت محبوب انتہائی کریہہ صورت

ہوگئی تھی۔ اس کے حسین اور پر سکون چہرے پر اس کی کالی کالی جھائیاں پڑ گئی تھیں۔ اس کی ایک آنکھ کچھ اونچی ہوگئی تھی بھوؤں کے بال جہاں تہاں سے جھڑ گئے تھے اور ہونٹ بھی جا بجا سے پھٹ گئے تھے۔ اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ دوسروں سے تو وہ کبھی کبھی جھنجھلا بھی جاتی لیکن راگھپا سے اس کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔۔۔ انسان کی قوت برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ راگھپا بھی آخر انسان تھا۔ اتنے دن کی پیہم تیمارداری سے وہ بھی گھبرا گیا۔ اُدھر محبوب کو بھی اپنی گرتی ہوئی حالت دیکھ کر ڈر لگنے لگتا تھا۔ ایک دن اس نے راگھپا کے پاؤں پکڑ کر اس سے کہا "آپ نے مجھے کیوں بچا لیا؟ دوبارہ درد اٹھے تو مجھے بچانے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ میں چپ چاپ آنکھیں موند لوں گی۔ اس طرح جینا میرے لیے ناقابل برداشت ہے"۔ راگھپا کو یہ سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ لیکن اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ محبوب کے زندہ رہنے میں کوئی شک نہیں ہے۔۔۔ آئندہ بیس دن میں اس کا آخری وقت آپہنچا۔۔۔ راگھپا مشین کی طرح اس کی خدمت میں لگا رہتا لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ دوسرے ہی دن سے اسے محبوب کے قرب سے وحشت ہونے لگی۔ اپنا دل بہلانے کے لیے وہ ایک دوسری طوائف کے گھر جا کر گانا سننے بیٹھ گیا۔ راگھپا کے جانے کے ایک گھنٹہ بعد ہی محبوب نے اُسے یاد کرتے کرتے دم توڑ دیا۔

اگلے دن یہ خبر سنتے ہی راگھپا کو ایسا لگا جیسے اس کی ساری طاقت کسی نے سلب کر لی ہو۔ اتنے دن وہاں رہ کر بھی موت کے وقت وہ اس کے پاس نہ تھا یہ سوچ کر اس کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔ اگلے پندرہ دن وہ پیٹ کے درد کی وجہ سے پلنگ پر پڑا رہا ٹھیک ہونے کے بعد بھی وہ پہلے جیسا راگھپا نہیں رہا۔ اندر ہی اندر اسے دل کی کمزوری کا روگ لگ گیا تھا۔

محبوب کے مرنے کے بعد اس کے گھر سے محبوب کو ملنے والی دولت پھر واپس آجائے گی چمپکا کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ محبوب نے اپنا سارا پیسہ اپنے بھانجے کی دوکان میں لگا دیا تھا۔ راگھپا اس معاملہ میں کچھ کرنے کو تیار نہ تھا۔ دوسری بار بیمار ہونے کے بعد جب وہ ٹھیک ہوئی تھی تو محبوب نے اپنے گلے کا چندر ہار چمپکا کے پاس بھیج دیا تھا اور کہلا دیا تھا کہ جب شانتا کی شادی ہو تو اُسے دے دینا۔ اس ہار کے علاوہ اور کوئی چیز چمپکا کو نہ مل سکی۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا راگھپا کا حوصلہ کم ہوتا جاتا تھا۔ پہلے کا سا جوش، قوت، تیزی اور طراری اب اس میں باقی نہ تھی۔ اس کی جسمانی طاقت اور زہرنا کی اب افسانہ بن چکی تھی

اس وقت جو شخص راون کی طرح اپنی بے پناہ قوت کے بل پر دنیا کو اپنے سامنے جھکا لیتا تھا وہ اب ایک معمولی نٹ کی طرح ناچتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ فکروں میں گھر کر نحیف سا ہو چکا تھا۔ یہ بات وہ خود بھی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی راستہ میں چلتے ہوئے جب اس کی ایڑیاں آپس میں ٹکرا جاتیں تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا "پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا"۔ پہلے اپنے کسی کام پر بھی نہ پچھتانے والا راگھپا اب بات بات پر رنجیدہ ہو جاتا تھا ــــ موت کی قوت ہی ایسی ہوتی ہے۔ دکھ سے ناواقف فولاد جیسے سخت دل کو بھی جب موت غمزدہ ہونا سکھا دیتی ہے تو وہ دل پھر کسی بھی بات پر غمزدہ ہو سکتا ہے۔ راگھپا ان دنوں زیادہ تر اپنے خیالات کی دنیا میں رہتا تھا اب وہ خیالی صدمات سے بھی رنجیدہ ہونے لگا تھا ــ پہلا دکھ تو اسے یہ تھا کہ اس کی ذہانت نے ہر طرف سے اُسے یکساں فائدہ نہیں پہونچایا تھا۔ دوسرا دُکھ اُسے یہ تھا کہ اس کی ذہانت سے اُس کے مفادات کو بھی نقصان پہونچا تھا۔ تیسرا صدمہ اُسے یہ تھا کہ اس کی ذہانت اب دن بدن زایل ہوتی جا رہی تھی۔ اب جو کچھ بچا تھا وہ راگھپا کا سایہ تھا۔ پہلے والا قاہر و جابر راگھپا بھراری محبوب کے ساتھ ہی ختم ہو چکا تھا۔

کاش یہ دیسائی میرے ہاتھ کچھ پہلے پڑا ہوتا۔ اب تو میری جسمانی طاقت بھی گھٹتی جا رہی ہے ــــ پہلے ملا ہوتا تو پندرہ دن میں میں اس کی عقل ٹھکانے لگا دیتا۔ اپنی بیوی کے سامنے وہ اس قسم کی ڈینگیں مارا کرتا تھا۔ دیسائی جی اور رنگنوا، راگھپا کے گھر میں مذاق کا موضوع بن گئے تھے۔ دونوں گھر کے دشمن تھے۔ اب کٹی کے قرض کے معاملے نے اس کی غریبی نے اور دیسائی جی کا روپیہ دینے سے انکار کر دینے سے ان کے خلاف نفرت اور تلخی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

اس کی طاقت کتنی ہی کم ہو گئی ہو لیکن بھراری کی کرامتیں ابھی بند نہیں ہوئی تھیں۔ اس سال دیسائی جی کے کھیتوں میں بڑی تعداد میں چوریاں ہوئیں۔ دیسائی جی کے گاؤں سے دھارواڑ کی منڈی میں آنے والے لوگوں سے راگھپا نے دوستی گانٹھ لی تھی۔ ابھی تو اس کے کئی مقاصد کی تکمیل باقی تھی لیکن اسی دوران اُسے ایک ترکیب اور سوجھ گئی جس کی وجہ سے ایسے اوچھے کاموں میں اس نے ہاتھ نہ ڈالا۔

دیسائی جی کا لڑکا وسنت اب بھی چوری چھپے اناج بیچنے سے باز نہیں آیا تھا۔ پچھلے دنوں وسنت کا ایک ناٹک منڈلی بنانا اور اس کے لیے گاؤں والوں سے دشمنی لینا۔ دیسائی جی کا

بھاگا بھاگا گاؤں جانا ـــــ یہ سب باتیں راگھپا کے ایک چیلے نے اسے بتادی تھیں۔ اب وسنت راؤ پہلے کی طرح کھلم کھلا اناج نہیں بیچتا تھا لیکن اپنے معتمد گاہکوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے تین دن میں بوری دو بوری اناج بیچ دیتا تھا۔ راگھپا کا چالاک چیلا وشونی چار جماعت تک پڑھا تھا۔ وہ بلا کا چلتا پرزہ تھا۔ الٹے سیدھے کاموں سے اسے بہت دلچسپی تھی راگھپا نے اس کے ذریعہ وسنت راؤ کو پیغام بھجوایا "دھارواڑ میں آپ کی ہی برادری کے لوگ بڑی تعداد میں خریداری کرنے کو تیار ہیں"

چالاک وشونی نے وسنت کو خوب سبز باغ دکھائے۔ وشونی بچولیا تھا۔ اناج ملتے ہی پیسے دے دیتا تھا۔ اناج راتوں رات بیل گاڑی سے دھارواڑ پہونچا دیتا لیکن مجال کیا جو کسی کو کانوں کان خبر ہو۔ ایک مہینے تک اس کام سے خوب آمدنی رہی۔ راگھپا کو پندرہ بوری جوار ملی۔ دھارواڑ پہونچانے کا خرچ اور ریکوئی کی دلالی وغیرہ تمام اخراجات نکال کر ساڑھے بائیس روپیہ نقد بھی اس کے حصہ میں آئے۔

لیکن راگھپا کو یہ چھوٹے موٹے طریقے پسند نہیں آئے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا: "چھی چھی، صرف بیس روپیے۔ شرم کی بات ہے محبوب کی زندگی میں تو اتنے اتنے روپے میں ایک دن میں پھونک دیتا تھا" ـــــ اب وہ اس سے بھی آسان طریقہ سوچنے لگا۔ دیسائی جی کو اپنے شکنجے میں کسنا ہے تو اس کے لڑکے کو پکڑنا ہوگا ـــــ انگلی پکڑ کر پونچا پکڑنا ہوگا۔ اس کے لیے وسنت سے براہ راست تعلقات بڑھانے ہوں گے۔ وسنت کو پہلے ناٹک کمپنی قایم کرنے کا بڑا جنون تھا۔ راگھپا کو بھی اس سے دلچسپی تھی اس لیے اس نے سوچا وسنت کو ناٹک کمپنی کے بارے میں پھر سے جوش دلایا جائے۔ چنانچہ اس نے وشونی کے ذریعہ وسنت کو اپنے پاس آنے کے لیے کہلوایا اور دوسرے ہی دن سے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

یہ تھا راگھپا کا ایک روپ!

اب آئیے اس کے دوسرے روپ کی طرف ـــــ کٹی کی طرف دھیان دینے والا رُخ۔ کٹی کو متبنیٰ کرنے کے بارے میں راگھپا کی نیت بدلنے لگی تھی۔ اصل میں اس نے کبھی اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ یہ تو اصل میں شادی کے لیے گنگوا کو پھنسانے کی اس کی چال تھی کٹی کو متبنیٰ نہ کرنے کا خیال گنگوا کی ضد کی وجہ سے اس کے دل میں پختہ ہوتا جا رہا تھا ـــــ

اُس وقت راگھپا جوان تھا۔ اس وقت اسے گود لینے کی بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر اس نے متبنیٰ کرنے کی پیش کش کی تھی اسی مصلحت سے اس نے سب کے سامنے قسم بھی کھائی تھی ـــــ پھر کٹی کے بارے میں چپکا بھی بضد تھی۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر راگھپا نے شادی سے پہلے متبنیٰ کرنے کی بات مان لی تھی۔

شادی ہو گئی ـــــ متبنیٰ کرنے کی بات ٹل گئی ـــــ راگھپا کی نیت میں تبدیلی ہونے لگی۔ اس کی یہ توقع کہ شادی کے بعد گنگوا پرانی رنجشوں کو بھول جائے گی غلط نکلی۔ گنگوا ایک بار بھی اس کے گھر نہ آئی۔ نہ ہی بھائی کو اپنے گھر بلایا۔ رتنا بھی کوئی خاص آرام سے نہ تھی۔ اب راگھپا کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا تھا کہ اس کی دشمنی اس کی بیٹی سے نکالی جا رہی ہے۔ اس طرح گنگوا اس کے لیے ایک ہیبت ناک ہستی بن گئی تھی۔ کٹی نے بھی گزشتہ چار پانچ سال میں راگھپا کا وارث بننے کی اہلیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ راگھپا کا داماد تو بن گیا تھا لیکن اس کا وارث بننے کا اہل نہ تھا۔ راگھپا نے ایک دن اس سلسلے میں اپنی بیوی کو بھی آڑے ہاتھ لیا "کٹی کی جگہ اگر میں ہوتا تو گنگوا کو "میری ماں، میری ماتا" کہہ کر اور ادب سے نمسکار کر کے گھر سے باہر کر دیتا۔"

ایسی حالت میں جب ایک دن دیسائی جی اُسے متبنیٰ کی بات کرنے کے لیے بلایا تو وہ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ اپنی برافروختگی کو دیسائی جی پر ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا:

"دیسائی جی، شادی ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا لیکن ایک بار بھی گنگوا ہمارے گھر نہیں آئی بیسیوں تیج تیوہار ہوتے ہیں اگر یہ رنجش اسی طرح قایم رہی تو مجھے کیسے یقین ہو گا۔"

اس پر دیسائی جی نے کہہ دیا "آپ نے ہی پہلے وچن دیا تھا۔ بیاہ کے وقت کیا آپ نے آگے بڑھ کر چار آدمیوں کے سامنے یہ نہیں کہا تھا کہ ہماری رنجش یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔ اس وقت تو آپ کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اس وقت آپ کچھ اور بولے ہی نہیں" یہ سن کر راگھپا کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کٹی کو متبنیٰ کرنے میں اسے اب اور بھی قباحتیں نظر آنے لگیں۔ دوسرا داماد اگر کٹی سے بھی اچھا ملا تو ..... کٹی کو متبنیٰ کر لوں لیکن بعد میں بیٹے کو اپنے بس کر کے گنگوا اگر میرا قتل کر دے تو؟ یہ دوسرا خیال راگھپا کو بہت خوفناک معلوم ہوا۔ کسی سے بھی نہ ڈرنے والے راگھپا کو اپنی بہن سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اب ذہنی کمزوری کی وجہ سے یہی گھبراہٹ ڈر میں بدل گئی تھی وہ دل ہی دل میں سوچ کر خوفزدہ ہو جاتا۔ اگر اس گنگی کے

ہاتھ میں پڑ گیا تو وہ میرا کچومر نکال دے گی۔ گنگوا سے اُسے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا۔ گزشتہ تین سال میں تو وہ اس کے خیالات کا محور بنی رہی تھی۔ اس کے بارے میں اب اکثر اپنے کہے ہوئے یہ الفاظ گونجنے لگتے تھے، "گنگی ابھی میری غلطی ختم نہیں ہوئی ہے۔ تمہاری قسمت ہی اچھی ہے۔ تو بھوت بن کر مجھ سے بدلہ لینے آئے گی تبھی مجھے سکون ملے گا" اگر کسی طرح یہ متبنیٰ کرنے والا معاملہ ختم ہو جائے تو دیسائی اور گنگوا کو تنگ کرنے میں مزا آئے گا لیکن مشکل یہ ہے کہ چار آدمیوں کے سامنے حلف لے رکھا ہے۔ فی الحال ایک دو سال اور ٹالا جائے شانتا کی شادی تک۔ پھر وہ اپنے دل سے کہتا "راگھپا، اگر تو اصلی راگھپا ہے تو اس بات کو دوبارہ اٹھنے سے پہلے ہی ختم کر دے۔" متبنیٰ کے معاملے میں راگھپا راون کی طرح سوچتا تھا۔ اگر میرے گھر لڑکا پیدا ہو جائے تو۔ شانتا کی پیدائش کے بعد ڈاکٹروں کی صلاح کے مطابق راگھپا کا بیوی سے ازدواجی تعلق ختم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب کے بچہ پیدا ہوا تو بیوی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اب اس کی عمر پچاس سال کی تھی۔ بیوی بھی چالیس کی ہو گئی تھی۔ وہ سوچتا تھا اب میرے لیے وقت کم ہے۔ شانتا کی شادی ملتوی کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کی عمر اگر زیادہ ہو گئی تو شادی ہونا ہی مشکل ہو جائے گی۔

آخر راگھپا نے تمام دیا دھرم، انسانیت، محبت سب کو بالائے طاق رکھ کر یہ فیصلہ کیا۔ "میری بیوی کی زندگی...... ایک لڑکا پیدا کر کے اُسے اپنا ٹکٹ کٹا لینے دو۔ ڈاکٹروں کو کیا معلوم وہ تو ایک کی دس بتاتے ہی ہیں۔"

چمپکا شوہر کے سکوت کے باوجود اس کے خیالات کو کھلی کتاب کی مانند صاف صاف پڑھ سکتی تھی۔ کیا اس نے شوہر کے جذبات کو سمجھتے ہوئے اپنی زندگی آج تک گزاری تھی..... وہ آخری قربانی دینے کے لیے بھی بے چون و چرا تیار ہو گئی۔ رتنا کے لیے اس کے دل میں تھوڑا سا رحم پیدا ہوا لیکن شوہر اس کے لیے خدا کی طرح تھا۔ شوہر کے ساتھ محبت اور نفرت دونوں ہی اس کے اپنے تھے اس لیے اُسے بھی تیار ہونا پڑا۔

26

اچھوت کا جواب

کچھ دن ہی بعد دیسائی جی کے کان میں یہ خبر پڑی کہ گاؤں سے پندرہ بورے جوار دھارواڑ میں آکر فروخت ہوئی ہے۔ اس سے پہلے فصل کی چوری کی پریشان کن اطلاع انھیں مل چکی تھی۔ اب ان کا شک پختہ ہوگیا کہ اس چوری میں راگھپا کا ہاتھ تھا۔ دیسائی جی نے اپنے والد کی زندگی میں سیاست میں بڑے زور شور سے حصہ لیا تھا لیکن گزشتہ بیس سال سے وہ ایک وظیفہ یاب فوجی کی طرح پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ گزشتہ بیس سال میں اُن کا کسی بڑے دشمن سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ ایک بدمست ہاتھی کی طرح اپنے ہی میں مگن رہتے تھے اس لیے ان کے دوست بھی کم تھے اور جانی دشمن بھی کوئی نہ تھا۔ ادھر البتہ کچھ دنوں سے راگھپا نے بلاسبب خواہ مخواہ ان سے لڑائی مول لے رکھی تھی اس بات سے وہ رنجیدہ تھے۔ ایک طویل عرصہ سے نفاق اور حسد سے دور رہنے کے باعث انہوں نے تہیہ کیا ''اس راگھپا کو اگر سبق نہ سکھایا تو میرا نام دیسائی بہادر نہیں۔''

یہ دیکھ کر کہ راگھپا اب کھلم کھلا تصادم پر اتر آیا ہے اور ایسی صورت میں ان کا خاموش رہنا ٹھیک نہیں انہوں نے ایک خط اچھوت کو لکھ مارا۔ اس میں انہوں نے تمام حالیہ واقعات کا مختصراً ذکر کرنے کے بعد اس سے پوچھا تھا ''کیا وینکٹ رائے راگھپا کا بھائی ہوسکتا ہے مجھے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ کام کوشش سے کرکے مجھے فوراً جواب دو'' اتنا کھلا ہوا خط اس سے پہلے اچھوت کو انھوں نے کبھی نہیں لکھا تھا۔

اچھوت کو یہ کام انجام دینے میں کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ اس کا جواب آنے میں چار پانچ دن لگ گئے لیکن اس کا جو جواب موصول ہوا وہ بہت مفصل تھا۔

دیوی داس فلورمل

لال باغ

مؤدبانہ آداب کے بعد عرض ہے کہ آپ کا خط ملا۔ میں خیریت سے ہوں۔ یہاں کام

ٹھیک چل رہا ہے۔ آج کل ایڈیٹر صاحب مجھے بہت ذمہ داری کے کام سونپنے لگے ہیں۔ حال میں مجھے ایک دو بار اداریہ لکھنے کا موقع بھی انھوں نے دیا۔ میرے ادارتی مضامین پڑھ کر غیر ضروری باتوں کو انھوں نے خارج کر دیا۔ یہاں تین چار سال سے مسلسل کام کرنے کی وجہ سے میں دوسرے تمام لوگوں سے سینیر ہوں۔ اخبار کی مالی حالت غیر اطمینان بخش ہونے کی وجہ سے ہر سال آدھی تنخواہ پر کالج کے طالب علموں کو ہی نائب ایڈیٹر مقرر کیا جاتا ہے اس لیے ہر سال نئے چہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان سب میں بس میں ہی پرانا ہوں۔ اس لیے ایڈیٹر صاحب مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ بی۔ اے کی پڑھائی اچھی چل رہی ہے۔ آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ چکی پر جانا اب میں نے کم کر دیا ہے۔ پریس بھی ہفتہ میں ایک دو بار ہی جاتا ہوں۔ وہ بھی مشین کی واقفیت حاصل کرنے کے لیے۔ وہاں بھی آج کل جسمانی محنت نہیں کرتا ہوں۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں۔ ماتاجی کو بھی یہ تمام باتیں بتا کر اطمینان دلا دیں۔ آپ نے جو دریافت فرمایا تھا اب اس کے بارے میں لکھتا ہوں۔ وینکٹ رائے کو کچھ بھی سمجھانا بہت مشکل ہے۔ کسی مقصد سے کوئی سوال پوچھا جائے تو اسے شک ہو جاتا ہے اور وہ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس سے پہلے کئی مرتبہ وینکٹ رائے نے اپنے پاس رکھا ہوا ایک خط مجھے دکھایا تھا۔ بار بار خط دکھانے اور اس کے عجیب و غریب رویّہ کی وجہ سے میں نے کبھی اس خط کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ صرف ایک بار اسے پڑھا تھا۔ اب جو وہ خط میں نے اس سے پڑھنے کو مانگا تو اُسے کچھ شبہ ہو گیا اور اس نے منع کر دیا۔ اُسے منانے کے لیے مجھے زمین آسمان کے قلابے ملانے پڑے۔ اُسے جب لہر اٹھتی ہے تو وہ ہر ایک کو وہ خط دکھاتا پھرتا ہے۔ جو بھی تھوڑی بہت کنڑ جانتا ہے اور اس کے پاس اٹھتا بیٹھتا ہے اُسے وہ خط دکھا کر یہ سوال ضرور پوچھتا ہے "کیا میرا حصہ مجھے مل جائے گا"۔ جو بھی اس خط کو دیکھتا ہے وہ یہی پوچھتا ہے کہ کیا یہ تمہارا ہبہ نامہ ہے۔ تمھیں یہ کیسے ملا؟ میں نے بھی جب اس خط کو توجہ سے پڑھا تو مجھے بھی یہی محسوس ہوا۔ یہاں کے اپنے ایک وکیل دوست سے پوچھا تو انھوں نے بھی یہی کہا۔ وہ خط اس طرح ہے:

"سوامی رائے وشری کرشن جی کلکرنی ساکن دھارواڑ کے نام میں وینکٹ رائے بامن گوڑہ — ساکن بند گوڑہ مقیم حال پونا، پیشہ ملازمت، یہ دان پتر تحریر کرتا ہوں۔ میں اور میرے بڑے بھائی شریمان راگھو بیندر بامن بند گوڑہ، دونوں جائداد میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ ہمارے والد کے اور کوئی اولاد نرینہ نہ ہونے کے سبب اپنی آبائی جائداد کے ہم دو ہی حقدار

ہیں۔ میرے دوسری جگہ ہر کام کرنے کی وجہ سے ہماری غیر منقسم جائداد کی دیکھ بھال میرے بڑے بھائی شری مان راگھو بینڈر بامن بند گوڑہ ہی کرتے ہیں اور جائداد ان کے ہی تصرف میں ہے۔ ہم بھائیوں نے اس جائداد کا بٹوارہ نہیں کیا ہے۔ اِن دنوں مجھ پر ایک مصیبت آن پڑی ہے۔ آپ نے خوشی سے اس مصیبت کو سنبھال لیا۔ اس احسان کے بدلے اپنے حصہ کی آبائی جائداد کو میں خود برضا و رغبت آپ کے نام ہبہ کرتا ہوں اور یہ ہبہ نامہ لکھ رہا ہوں۔ اس پر میرے کسی بھی رشتہ دار کو اعتراض نہ ہوگا اور آپ اسے اپنے تصرف میں لے سکتے ہیں میرے غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اس جائداد پر کسی کو حق نہ ہوگا۔ میرے حصہ میں کتنی جائداد آنی چاہیے، یہ آپ پنچوں کے سامنے فیصلہ کریں۔ سرِدست مذکورہ جائداد میرے بڑے بھائی کے قبضہ میں ہے آپ جب چاہیں اسے اپنے قبضہ میں لے سکتے ہیں یہ ہبہ نامہ راگھو بینڈر بامن بند گوڑہ کی موجودگی میں تیار ہوا جسے آپ نے منظور کر کے اپنے دستخط کیے ہیں۔ یہ ہے کل ہبہ نامہ۔

وینکٹیش بامن بند گوڑہ	تاریخ دستخط 5-15
سوامی رائے وکرشن جی کلکرنی	گواہ
راگھو بینڈر بامن بند گوڑہ	شان تپا شوپا شیٹی

اس ہبہ نامہ پر رجسٹریشن کا کوئی نشان نہیں ہے۔ اسے پڑھنے والے ہر کلرک نے اس کو صحیح بتایا ہے۔ لیکن مجھے ایک شک ہے۔ کاغذ گہری کالی سیاہی سے لکھا گیا ہے اور کافی پرانا ہو گیا ہے اس لیے وہ غالباً اصل کاغذ کی نقل ہے۔ لیکن میں نے دستخطوں کو غور سے دیکھا تو دستخطوں کے الگ الگ خط میں ہونے کی وجہ سے مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ نقل نہیں ہے بلکہ اصل کاغذ ہے۔ سیاہی گہری کالی ہونے کی وجہ سے بادی النظر میں تمام دستخط ایک ہی آدمی کی تحریر معلوم ہوتے ہیں لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام دستخط الگ الگ ہیں اور مختلف لوگوں کے اپنے ہاتھ کے کیے ہوئے ہیں۔

اگر یہ اصل ہبہ نامہ ہے تو ایک اور شبہ پیدا ہوتا ہے۔ قاعدے میں یہ کاغذ سوامی رائے وکرشن جی کلکرنی کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ وینکٹ رائے کے پاس کیوں اور کیسے آیا۔ کاغذ کی ابھی تک رجسٹری بھی نہیں ہوتی ہے۔ یہ کاغذ تو سوامی رائے کلکرنی کو بڑی احتیاط سے اپنے پاس رکھنا چاہیے تھا۔ یہ تمام سوال جواب آپ کو لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کسی بات کی معلومات وینکٹ رائے سے حاصل کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس ہبہ نامہ کو پڑھتے وقت میں نے

اُس سے کچھ باتیں پوچھی تھیں مثلاً اس پر کیا مصیبت آئی تھی لیکن وہ ٹال گیا۔ کبھی وہ سوال پوچھنے پر غصہ بھی ہوجاتا ہے میں نے خط کو غور سے پڑھا تو اس کو بھی وہ برداشت نہ کرسکا۔ آپ نے تو پانچ منٹ کی ملاقات میں اس کی مزاجی کیفیت کا اندازہ کرلیا تھا اگر اس معاملے میں آپ کو کچھ اور بھی باتیں معلوم ہوں اور ان کے بارے میں مزید معلومات درکار ہوں تو آپ تمام باتیں مجھے لکھ بھیجئے تاکہ میں اپنے وکیل دوستوں سے مشورہ کرکے آپ کو لکھوں۔ میں خود بھی اس مسئلہ پر مزید غور وخوض کروں گا۔

محترمہ والدہ صاحبہ اور برادران عزیز کی خیریت سے مطلع فرمائیے۔

آپ کا

اچیوت راؤ

خط پڑھتے ہی دیسائی جی کش مکش میں مبتلا ہوگئے۔ ان کو اس سلسلہ میں جتنی باتیں پہلے سے معلوم تھیں ان کے ساتھ اچیوت کی فراہم کردہ اطلاعات کو ملاتے تو ایک دم سے ایک روشنی سی پیدا ہوتی لیکن دوبارہ پھر شبہات کا اندھیرا چھا جاتا۔ دیسائی جی جو ابھی تک کنارے پر کھڑے تھے اس خط کو پڑھ کر اندر کودنے پر آمادہ ہوگئے۔ انہیں لڑکے کی ذہانت سے بڑی خوشی اور تقویت حاصل ہوئی۔ انھوں نے تہیہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو ان کو اور اُن کے بیٹے کو اس معاملہ میں ہاتھ ڈال کر اس کے راز کو کھول دینا چاہیے۔ دیسائی جی کے دل میں اب تک گریز کی جو خواہش تھی وہ اس خط کے ملتے ہی ختم ہوگئی۔ اس کی جگہ دل میں ایک باعزم لگن پیدا ہوگئی۔ سوال ان پر اعتماد کرنے والی ایک بے یار ومددگار بیوہ کی بھلائی اور ایک سیدھے سادے لڑکے کی فلاح کا ہی نہیں تھا بلکہ ان کے وقار کو للکارنے والے ایک چالاک حریف کو نیچا دکھانے کا بھی تھا۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد سے اب تک انہیں کسی حریف سے پالا نہ پڑا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے یہ راگھپا کس طرح ان کے مقابلے پر اکھاڑے میں اتر آیا تھا اور انھوں نے بھی نادانستہ طور پر آستینیں چڑھالی تھیں۔ اس معاملے کی اونچ نیچ سوچتا ــــ ہو نہ ہو۔ دیسائی جی پھر سے جوان ہوگئے۔

27

وسنت اور راگھپا کی گفتگو

راگھپا کی نصیحت کے مطابق وشونی نے وسنت راؤ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دھارواڑ جاکر راگھپا سے ملے۔ اس نے وسنت سے کہا "میں نے انہیں بتایا تھا کہ ہمارے گوڑجی تو ناٹکوں پر جان دیتے ہیں۔ تب وہ بولے، گوڑ بڑے جوشیلے ہیں۔ تب تو ہماری ان کی جوڑی خوب رہے گی۔ پہلے ان کی ناٹک کمپنیاں بھی تھیں۔ انھوں نے خود بہت سے اداکاروں کو ناٹک کرنا سکھایا ہے۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تمہارے گوڑ ساتھ دیں تو ایک اور ناٹک کھیلا جا سکتا ہے۔ آپ کو اگر وہ دیکھ لیں گے تو سچ مچ راجا کا پارٹ آپ ہی کو دیں گے، مجھے اس کا یقین ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی میرے دل کو یہ یقین ہو گیا تھا آپ تو تھے ہی راجا ہیں۔" اس طرح وسونی سے وسنت سے جو چکنی چپڑی باتیں کیں تو ایک دن وسنت نے خود اس سے کہا "چلو وشونی، ایک دن دھارواڑ ہو آئیں۔ بہت دن ہو گئے شہر گئے۔"

وسنت بدنامی کے ڈر سے جب سے دھارواڑ چھوڑ کر گیا تھا وہ گاؤں کے کاروبار میں اتنا ڈوبا کہ دھارواڑ کو ہی بھول گیا۔ گاؤں کی دلچسپیاں بھی کم نہیں ہوتیں۔ گائے بیل، کھیتی باڑی، ان کی وجہ سے وسنت کو گاؤں چھوڑ کر آنا مشکل ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے وہ گاؤں چھوڑنے کو تیار نہ تھا لیکن ناٹک میں اگر اُسے راجا کا پارٹ کرنے کا موقع ملے تو اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ پہلے ایک بار جب اس نے ناٹک میں دلچسپی لی تو باپ نے آکر سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ اگر وہی دیرینہ تمنا اتنی آسانی سے پوری ہو رہی ہے تو کیوں نہ کوشش کی جائے اس طرح وسنت دھارواڑ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں باپ کو پتہ نہ چل جائے وہ رات کے وقت بس سے دھارواڑ پہونچا۔ وشونی اسے سیدھا راگھپا کے گھر لے گیا۔ راگھپا نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا، چائے پلائی اور بعد میں عمدہ قسم کا کھانا کھلایا۔ کاجو، کشمش، بھئی کا پستہ اور آٹھ دس قسم کے پھل پیش کیے۔ وسنت راؤ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وسنت کا گھرانہ کافی مالدار تھا لیکن وینوبائی کی رسوئی میں مزے کے مقابلہ میں مقدار پر زیادہ زور

دیا جاتا تھا۔ اپنے گھر کے پھل پھول کے مقابلے میں راگھپا کے گھر کا پھل سلاد دیکھ کر اس کی طبیعت بہت خوش ہوئی۔ کھانے کے دوران راگھپا بھیم سین کی طرح اصرار کر کر کے اُسے کھلاتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ ہنسی مذاق بھی کرتا جاتا جبکہ وسنت راؤ کے گھر میں کھانے کے وقت ہنسی مذاق کی بالکل اجازت نہ تھی۔

کھانے کے بعد بیٹھک کے کمرے میں راگھپا دو بجے رات تک اپنی دلچسپ باتوں سے اسے محظوظ کرتا رہا۔ ناٹک کمپنی کی اپنی زندگی کے تجربات کی رنگین اور دلچسپ داستان اسے سنائی یہ جان کر کہ محبوب راگھپا کی داشتہ تھی وسنت کے دل میں راگھپا کی عقیدت اور بھی بڑھ گئی اسٹیج پر خواب کی طرح جھلک دکھا کر او جھل ہو جانے والے اداکار اور ہینڈ بلوں کے ذریعہ متعارف اداکار اب وسنت کو گوشت پوست کے انسان نظر آنے لگے۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ محبوب جان کے غلط تلفظ کو راگھپا نے ہی سدھارا تھا تو وسنت کو معلوم ہوا کہ بڑے بڑے اداکار بھی غلط تلفظ کرتے ہیں۔ الگ الگ گاؤں میں ہونے والے فضیحتے، شامیانوں کا پھاڑا جانا، پیکٹروں کو باہر نکلوا دینا، جھوٹ بول کر یا ڈرا دھمکا کر لائسنس لینا، اسٹیج پر سامان چھوٹ جانے کے قصے، وقت پر تنخواہ نہ ملنے پر اداکاروں کی طرف سے کام بند کر دینے کی دھمکی وغیرہ وغیرہ باتیں خوب نمک مرچ ملا کر اور بڑھا چڑھا کر سنائیں۔ ان باتوں میں کسی حد تک سچائی بھی تھی۔ راگھپا کی یہ باتیں سن سن کر وسنت کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ ان باتوں کے پس پشت راگھپا کا ایک مقصد بھی تھا۔ وسنت خوبصورت بھی تھا۔ اس کو دیکھتے ہی لڑکی کا باپ ہونے کے ناتے راگھپا کے دل میں فوراً یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ شانتا کے لیے ٹھیک رہے گا۔ جیسے جیسے وسنت راگھپا سے متاثر ہوتا جاتا تھا راگھپا کے دل میں یہ خیال اور زیادہ پختہ ہوتا جاتا تھا کہ اسے اپنا داماد بنا لینا چاہیے۔ دیسائی جی سے اُسے جو پرخاش تھی اس کی وجہ سے بھی وہ وسنت کو اپنا داماد بنانا چاہتا تھا۔ اس طرح گویا وہ دیسائی جی کو نیچا دکھا سکتا تھا۔

"سنا ہے کہ آپ نے گاؤں میں ناٹک کروایا تھا، گاؤں کا ناٹک تو مارواڑی کی پگڑی کی طرح ہوتا ہے، جیسے بھی باندھ لو چل جاتا ہے۔ ان لوگوں کو دو باتیں سکھانے والے کی واہ واہ ہو جاتی ہے۔ ناٹک تو اصلی وہ ہے جو شہر میں کھیلا جاتا ہے۔ ایک اشتہار کی جگہ دو تقسیم کرا دو تو ناٹک کی شان ہی بدل جاتی ہے۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اداکار منجھے ہوئے ہوں، عورتوں کے پارٹ عورتیں ہی کریں۔ چار پانچ عمدہ قسم کے گلوکار ہوں۔ اس کے علاوہ چندہ

بھی خوب جمع کیا جائے۔ . . . . اگر یہ سب باتیں ہوں تو وسنت راؤ، بھلے ہی آٹھ آٹھ آنے کا ٹکٹ رکھیے، لوگ بھاگے چلے آئیں گے۔ ناٹک میں میک اپ کی بھی بڑی اہمیت ہے مٹھیاں بھر بھر کر پیسہ جھونکنا پڑتا ہے لیکن تھوڑا بھی ویسے ہی کیا جائے تب تو ہوا ناٹک۔ خالی چنے مُرمُرے کھلا کر تختوں پر نچوانا تو پیسہ بھی گنوانا ہے اور نام بھی ـــــ" وسنت راگھپا کے خیالات سے پوری طرح متفق تھا لیکن ساتھ ہی اس نے اپنے دل کا ایک وسوسہ بھی ظاہر کیا "راجا کی اداکاری کرنے کے لیے بچتے ہوئے شخص کی ضرورت ہوتی ہے نا، راگھپا جی۔"

وسنت کے مدعا کو بھانپ کر راگھپا نے کہا "نہیں، ایسے کوئی خاص جچاؤ والے کی بھی ضرورت نہیں۔ میک اپ سے تو گدھے کو بھی راجا بنایا جا سکتا ہے البتہ گونجدار آواز کی ضرورت ہے۔ قد بھی لمبا ہونا چاہیے۔ تلفظ صاف ہونا چاہیے۔ یہ سب باتیں اپنے آپ سے نہیں آجاتیں۔ انھیں سیکھنا پڑتا ہے۔ تجربہ کار لوگوں کے پاؤں پکڑنا پڑتے ہیں۔ ان سے سیکھنا پڑتا ہے۔ ناٹک بھی ایک فن ہے۔ اداکاری کا فن کتنا کٹھن ہے کہ تمہارے جیسے ذہین لڑکے کو بھی سیکھنا ہو تو کم از کم پندرہ دن روزانہ مشق کرنا پڑے گی۔ وہ بھی چھ چھ گھنٹے۔ اداکاری ایسے ہی نہیں آجاتی ان سب باتوں کے ساتھ اگر آدمی جچتا ہوا بھی ہو تو سونے پر سہاگہ۔ اب اپنی ہی مثال لو۔ اگر تم میرے پاس آکر یہ کہو کہ میں جچتا ہوں مجھے راجا کا رول ادا کرنے دو تو میں صاف منع کر دوں گا لیکن تمہاری ذہانت، دلولہ، سیکھنے کا شوق۔ یہ سب باتیں دیکھ کر کہنا پڑے گا "ہاں لڑکا جچتا ہے۔ آج نہیں تو کل سیکھ جائے گا۔"

"میں تو سیکھنے کو تیار ہوں لیکن کیا خیال ہے آپ کا، کیا میں سیکھ جاؤں گا۔"

"تو ایسا کہو یار کہ سیکھنے کو تیار ہو، تم جیسے شخص کو ایسا کون سا فن ہے جو سیکھنے سے نہیں آسکتا۔ ہم اور تم مل کر 'آبھارت' نام کی کمپنی شروع کر دیں گے۔ چار دن یہاں آتے جاتے رہو گے تو اس کی جاذبیت کا تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔ اداکاری بھی علم کا ایک شعبہ ہے معمولی اداکاری سے اعلیٰ اداکاری تک کس طرح پہونچا جائے۔ مشرے تنزتک کیسے ترقی کریں۔ بھڑکتی کب چڑھانی چاہیے۔ میک اپ خراب کیے بغیر ماتھے پر انگوٹھا کس طرح رکھتے ہیں۔ مونچھوں پر اس طرح کیسے تاؤ دیں کہ وہ نکل کر گر نہ پڑیں۔ اداکاروں کا سر نہ پھوٹے، لاٹھی اس طرح کیسے گھمائی جا سکتی ہے یہ سب بظاہر معمولی باتیں ہیں لیکن ان کا سیکھنا آسان نہیں، مجھے بھیا، بہر حال یہ تمام باتیں ہیں، اور تم بہادر دیسائی ان کو عزم اور حوصلے سے سیکھ سکتے ہو۔

"آپ جس طرح مجھے نچائیں گے میں ناچنے کو تیار ہوں۔ علم کیا کسی کی میراث ہے"۔ وسنت راؤ نے شاگردانہ لہجے میں کہا۔ لیکن دل میں وہ اپنے آپ کو راجا کے رول میں دیکھ رہا تھا۔
اگلے دن پو پھٹتے ہی وسنت وشونی کے ساتھ گاؤں جانے کو تیار ہوا تو چائے کے وقت شانتا کا پہلا دیدار بھی اُسے حاصل ہوا۔

اس دن سے وسنت ہفتہ میں دو ایک بار، خفیہ طور پر دھارواڑ آنے لگا۔ راگھپا نے اس کا تعارف 'مدروین کا سانی'، ہیرو ٹن سندرسانی، مزاحیہ اداکار ٹلجا رام، اداکار راج شیکھر اَپا، ہیرا بھدو راج ڈب گلی، موسیقار گنو۔ لوا وغیرہ سے کرادیا۔ "اگلے سال دیسائی جی کمپنی کھول رہے ہیں آپ کو اس میں آنا ہی پڑے گا" وغیرہ بات چیت راگھپا نے ان لوگوں سے کی۔ سندری سانی کے گھر ایک چھوٹی سی نشست بھی ہوئی۔ وسنت نے اس کے ہاتھ سے پان لے کر اسے پانچ روپیہ دیے۔ اس نے پاؤں کا ہار مونیم بجانے والے چندرپا سے مل کر پتہ چلایا کہ کس کمپنی کے ہارمونیم اچھے ہوتے ہیں۔ اُن کی قیمت کیا ہے۔ کیا خصوصیات ہیں؟ ہر بات میں راگھپا معلومات کا خزانہ معلوم ہوتا تھا۔ اسے چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر بات کی پوری واقفیت تھی۔ یہ دیکھ کر وسنت راؤ کو اپنے استاد پر اور بھی فخر ہوا۔ پھر وہ فقیرپا سے ملے اور اس سے معلوم کیا کہ سامنے کا پردہ اور مختلف مناظر والے آٹھ پردوں کی تیاری پر کتنی لاگت آئے گی اگر چھ یا چار پردے بنوائے جائیں تو ان پر کتنا خرچ ہوگا۔ اب جو بیٹھ کر حساب لگایا تو پتہ چلا کہ اداکاروں کی تنخواہ، کھانا اور دوسرے اخراجات کے علاوہ صرف ساز و سامان کے لیے دو ہزار روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ ان اعداد و شمار سے وسنت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گاؤں میں تو صرف ایک سو روپیہ میں پورا ناٹک ہو جاتا تھا بلکہ کچھ بچ بھی رہتا تھا۔ یہاں تو صرف 'ٹکٹ' پر ہی سو روپیہ خرچ ہو جائیں گے۔

راگھپا نے وسنت راؤ کے تذبذب کو دیکھ کر اس کو جوش دلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو کیا ہو گیا دیسائی جی، جتنی دولت آپ کے پاس ہے اتنی میرے پاس شہر میں ہوتی تو دکھا دیتا کہ میں کیا کر سکتا ہوں"۔

گھر کے اناج کی بوریوں کو یا بھنڈار کے غلے کو فروخت کرنے میں راگھپا نے اس کے منصوبے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی کیونکہ اس میں ملتا ہی کیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فی الحال

اس کام سے کچھ مالی مدد مل سکتی تھی لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑا دھندا کرنے والوں کو زیب نہیں دیتیں۔

"اس کام سے کچھ پیسہ آتا ضرور ہے لیکن دیسائی جی کتنے دن آپ اپنے بزرگوں سے اس چوری کو چھپا سکیں گے۔ اب آپ بالغ ہو گئے ہیں۔ پھر ناٹک کمپنی میں پیسہ لگانا بھی ایک تجارت ہے۔ یہ بھی ایک دھندا ہے۔ پیسہ لگانا اور پھر پیسہ کھینچنا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ شرم کے دن لد گئے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اسے بدنام کریں۔ کرنے دیجے۔ اس دھندے میں آپ جتنے پاکیزہ اطوار سے رہیں گے اور جتنی ہوشیاری برتیں گے اتنا ہی زیادہ منافع ہوگا۔ اگر آپ فضول کی عادتیں پال لیں یا دوسروں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن جائیں تو وہ لوگ آپ کو دھوکا دے دیں گے ویسے بھی غلط راستے پر چلنے والا گھر میں رہنے پر بھی نقصان اٹھاتا ہے دیسائی جی میں نے تو ہر طرح کا شوق کیا لیکن میرا کیا بگڑ گیا۔ بتاؤ تو بھیا؟ آدمی اگر کوئی شوق کرے تو اس میں بالکل ڈوب نہ جائے۔ اگر ڈوب گیا تو سمجھو کہ تباہ ہو جائے گا۔ اگر اتنی عقل آپ میں ہے تو کسی سے بھی ڈرنے یا شرم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناٹک بھی ایک دھندا ہے۔"

اس نصف سنجیدہ اور نصف بے تکلفی کی نصیحت کو سن کر جس میں واحد متکلم اور جمع متکلم دونوں صیغوں کی آمیزش تھی، دل ہی دل میں دہراتے ہوئے وسنت راؤ بس میں بیٹھ کر گاؤں واپس پہونچا۔

28

چمپا کے تفکرات

چمپا کے دل میں ان دنوں درجنوں خیالات موجزن رہنے لگے۔ گھر میں اب پہلے کی سی چہل پہل نہیں رہی تھی۔ اس بات کا تلخ احساس عمر رسیدہ چمپا کے علاوہ اور کس کو ہو سکتا تھا وہ اب سینتیس اڑتیس سال کی ہو گئی تھی۔ پچھلے بیس سال کی ازدواجی زندگی میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ اس گھر میں اس نے دکھ اور سکھ دونوں ہی دیکھے تھے لیکن موجودہ بے رونقی کچھ عجیب قسم کی تھی۔ وہ شوہر کو ایک محبوب کی طرح بہت قریب سے دیکھتی آئی تھی، وہ اس کے

رازوں کو جانتی تھی۔ اس کی عیاش طبیعت کے پس پردہ چھپی ہوئی کش مکش بھی اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اسی طرح آج کل اس کے شوہر میں جو تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں وہ ممکن ہے اوروں کو نظر نہ آتی ہوں لیکن چمپکا انہیں صاف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کی دیواروں میں جو شگاف پڑ رہے تھے انہیں دیکھ کر وہ ایک بے نام اذیت سے بے چین اپنے دن گزار رہی تھی اس کا شوہر اب ہارنے لگا تھا۔

کیا یہ بڑھاپے کے آثار تھے ...... خوراک کم ہوگئی تھی ..... وہ جو کبھی اپنے کپڑوں پر ذرا سی گرد برداشت نہیں کر سکتا تھا اب ایسا کوٹ پہنے پھرتا تھا جس کے کالر پر انچوں موٹی میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کا بدن اب بھی پہلے کی طرح مضبوط تھا لیکن چہرے کی بشاشت رخصت ہوگئی تھی چہرہ کی لکیریں اتنی گہری ہوگئی تھیں گویا کسی نے ہاتھوں سے بنائی ہوں۔ باہر والوں کو بھلے ہی یہ نہ دکھائی دیتا ہو لیکن چمپکا کے لیے یہ خطرہ کی علامت تھی۔ اس کا وہ شوہر جو ایسی حالت میں بھی بے فکری سے سوجاتا تھا جب کہ گھر میں کل کے لیے ایک دانہ بھی نہ ہو آج کل دو دو بجے تک کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔

ایک اور بات بھی تھی۔ اب تک چمپکا کو شوہر کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کے لیے اس کے کاموں پر انحصار کرنا پڑتا تھا ..... سدا مسکرانے والے شوہر کی ذہنی کیفیت اُسی وقت سمجھ میں آتی جب وہ کچھ کر بیٹھتا تھا کہ ”اوہ۔ تو یہ بات تھی“ لیکن اب وہ اکثر آپ ہی آپ بڑبڑاتا رہتا۔ پہلے اس کی دل کی حالت کا عکس اس کے چہرہ پر کبھی نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن اب تو اس کا منھ دیکھتے ہی سب کچھ معلوم ہو جاتا تھا۔ اس کے ہونٹ خود بخود ہلتے رہتے تھے۔ ایک دن تو نوبت یہاں تک آگئی کہ چائے پیتے پیتے وہ اچانک بہت زور سے بڑبڑا اٹھا:

”چاہے جان چلی جائے لیکن ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔“

شانتا اور چمپکا دونوں نے یہ بات سنی۔ چمپکا نے اسے اتنی زور سے بات کہتے سن کر یہ سمجھا کہ شاید وہ کچھ اس سے کہنا چاہتا ہے چنانچہ اس نے پوچھا ”کیوں؟ کیا بات ہے؟“

راگھپا نے حیرت سے پوچھا ”کیا؟“ چمپکا نے کہا ”آپ کچھ کہہ رہے تھے؟“

”میں نے کیا کہا؟ کیا تم لوگوں کا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے؟“

باپ کی بات کے انداز سے ہکا بکا ہو کر شانتا جو شکر کا ڈبہ طاق میں رکھنے جا رہی تھی وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

"تو نے سنا تھا شانتا ؟"

شانتا نے گواہی دی "ہاں، آپ کہہ رہے تھے کسی کے ہاتھ نہیں پڑوں گا۔"

راگھپا مشتعل ہوکر زور سے چیخا "میں نے تو کسی سے کچھ نہیں کہا۔ تم لوگ پاگل پن کی باتیں کرکے مجھے غصہ نہ دلاؤ۔"

"کیوں جی، آپ کو کیا ہوگیا ہے ؟ آپ ایسی باتیں کیوں کرنے لگے ہیں۔"

"خبردار! جو آگے کچھ کہا" یہ کہہ کر راگھپا جلدی سے چائے پی کر وہاں سے چلا گیا اس دن کے بعد راگھپا کی خود کلامیوں پر چمپکا نے کچھ کہنا سننا بند کردیا۔ راگھپا کی یہ خود کلامیاں بڑھتی گئیں، چمپکا کو ان سے ڈر لگنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا شوہر تیزی سے بوڑھا ہوتا جارہا تھا۔ ایک دن وہ شانتا سے بولی:

"میں بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ تیری شادی ہوجانے کے بعد ان سے پہلے بھگوان مجھے اٹھالے میں اب زیادہ جینا نہیں چاہتی۔ اگر تیرے جنم کے وقت ہی مرجاتی تو اب تک میرے پندرہ شرادھ ہوچکے ہوتے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس کے علاوہ اسے ایک تشویش اور بھی تھی۔ اگر وہ اس عمر میں حاملہ ہوگئی تو! اس سے ایک تو موت کا ڈر، دوسرے درد میں شدت پیدا ہوجانے کا ڈر لیکن اس نے تو ساری زندگی کی مصیبت میں گزاری تھی اور وہ اب بھی ہر بات کو قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ جب ڈاکٹر واضح طور پر کہہ چکے ہیں تو موت تو یقینی ہے۔ ویسے پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے نہ مروں! لیکن لڑکا ہی پیدا ہوگا، اس کی کیا ضمانت ہے! اگر لڑکا ہی پیدا ہوا اور میں مرگئی...... اتنی امید کے بعد اسے جنم دے کر یتیم کرکے چل بسی .... ہر وقت وہ اسی قسم کے وسوسوں میں گھری رہتی۔ وہ اولاد کی خواہش میں شوہر کو اپنے پاس آنے سے کیسے روکتی۔ وہ یہ سوچ کر چپ ہوجاتی۔ یہ سب سوچنا کوئی بری بات نہیں۔ لیکن پھر وہی خیالات اسے گھیر لیتے۔

ایک اور فکر بھی تھی۔ رتنا کے اولاد نہیں تھی۔ اس کے سامنے اس بڑھاپے میں اگر وہ حاملہ ہوگئی تو رتنا کو کتنا دکھ ہوگا۔ یہ تو ایک طرح اس کے منہ کا نوالہ چھیننے والی بات ہوگی۔ ہائے.....!

مہابھارت اور بھاگوت کا پاٹھ کرنے والی کو خوف ہوا کہ اس کے شوہر کی موجودہ حالت کہیں اس کے سابقہ کرتوتوں کا نتیجہ تو نہیں۔ کہیں اس طرح وہ اپنی پاداش کو تو نہیں پہونچ رہا ہے

لیکن اس میں ایک بیوی کرہی کیا سکتی ہے۔

محبوب جان کے ساتھ شوہر کے تعلقات کا پتہ جب اس کو چلا تھا اس وقت اس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اس کو برداشت کر گئی۔ لیکن اب جو فرض اس کے سامنے تھا وہ ایک اور ہی قسم کا تھا۔ جب وہ یہ دیکھتی کہ اس کا شوہر جو کسی زمانے میں ایک نا قابل تسخیر قلعہ کی مانند مضبوط تھا اب اس کی آنکھوں کے سامنے شکستہ ہو رہا ہے تو اس کا کلیجہ منھ کو آنے لگتا۔

دیواروں میں پیدا ہونے والے رخنوں کو دیکھ کر جو تشویش دل میں پیدا ہوتی ہے اس سے ہزار گنا زیادہ تشویش ایک فولاد جیسے مرد کو کمزور ہوتے دیکھ کر ہوتی ہے۔ کالی داس نے بھی اجراج کے بڑھاپے کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ برگد کا پیڑ جس طرح محل کی دیوار میں رخنہ ڈال دیتا ہے اسی طرح اندومتی کی جدائی کے غم نے اجراج کے دل کو چیر کر رکھ دیا تھا۔

چمپکا کی پریشانیاں یہیں تک محدود نہیں تھیں۔ اُسے شانتا کی بھی فکر تھی۔ شانتا دن بدن لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گلاب کی کلی کی طرح کھل رہی تھی۔ اس کا قد رتنا سے آدھا فٹ زیادہ ہو چکا تھا۔ کوئی یہ اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ وہ پندرہ سال کی عمر میں ہی اتنی حسین ہو جائے گی۔ اس کی ماں اور باپ دونوں خوبصورت تھے لیکن اس کی جلد کا گورا رنگ اور اس کے لچکدار قد کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ اس کو جو دیکھتا وہ یہی کہتا کہ اس سے شادی کرنے والا بڑا خوش نصیب ہوگا۔ چمپکا کو بیٹی کے حسن پر ناز بھی تھا لیکن وہ اُس کے اتنا حسین ہونے سے ڈرتی تھی — وہ خود بھی حسین تھی اور اپنے حسن کے سبب اس نے بہت دکھ جھیلا تھا۔ اس لیے بھول کر بھی کبھی شانتا کے سامنے یا اس کے پیچھے وہ اس کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کرتی تھی۔

لڑکی حسین ہو تو اسے شیشے کے صندوق میں بند کر کے تو رکھنا نہیں جا سکتا۔ ماں کی لاکھ کوشش کے باوجود کیسے ممکن تھا کہ بیٹی میں اپنے حسن کا غرور نہ پیدا ہو، باہر کے اثرات سے اس میں تھوڑا بہت ناز و انداز پیدا ہو جانا قدرتی بات تھی۔

شانتا رتنا سے دو ایک جماعت زیادہ پڑھی ہوئی تھی۔ پھر بات صرف زیادہ پڑھے لکھے ہونے کی نہیں تھی۔ بلکہ اس نے کس زمانے میں پڑھا تھا، یہ بات زیادہ قابل لحاظ تھی۔ رتنا کے اسکول کے دنوں میں اور شانتا کے اسکول کے دنوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دونوں کی عمر میں حالانکہ صرف پانچ چھ سال کا فرق تھا لیکن اس مختصر مدت میں سماجی رسم و رواج کافی

بدل گئے تھے۔ نمک ستیہ گرہ کے وقت سے جب اسکولوں کالجوں میں ہڑتالیں شروع ہوئیں تو شانتا نے ان میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ سارے اسکول میں کل بارہ لڑکیاں تھیں ان میں کچھ سولہ برس سے زیادہ کی تھیں اس لیے شرم کے مارے جلسے جلوسوں میں شریک نہیں ہوتی تھی۔ کچھ لڑکیاں دقیانوسی خیالات رکھنے والے گھرانوں کی تھیں، وہ اس ڈر سے ان تحریکوں میں حصہ نہ لیتی تھی کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو ماں باپ اسکول سے اٹھالیں گے۔ شانتا کو گھر کی طرف سے پوری آزادی تھی اس کی عمر بھی کم تھی، صرف بارہ سال۔ اس وجہ سے ایسے کاموں میں حصہ لینے میں اُسے کوئی روک نہ تھی۔ اس نے اور شمالی کرناٹک ضلع کی ایک لڑکی نے طلبا کے جلوسوں میں سب سے آگے آگے جھنڈا ہاتھوں میں لے کر "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" گاتے ہوئے اور نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر گشت کیا تھا۔ جلسہ میں تقریر کے دوران جب کوئی یہ کہتا "ہماری اس آزادی کی جنگ میں خواتین بھی ہمارے دوش بدوش لڑ رہی ہیں" تو شانتا یہ سمجھ کر خوش ہوتی کہ اس کی تعریف کی جا رہی ہے۔

اُس زمانے میں آزادی کی تحریک نے جو فضا پیدا کر دی تھی اور لوگوں میں آزادی کا جو احساس اور جوش پیدا کر دیا تھا اس سے اتنی چھوٹی عمر میں متاثر ہو جانے والی رتنا کے لیے جھک کر چلنا ممکن نہ تھا۔ وہ برسوں سے ایک کمسن دوشیزہ نظر آتی تھی۔ اس نے لہنگا چنری چھوڑ کر ساری پہننا شروع کر دیا تھا اس سے وہ اور بھی حسین لگنے لگی تھی۔ اڑوسی پڑوسی اور سکھی سہیلیاں سبھی اس کے حسن کی تعریف کرتے، خوش قسمتی سے ماں کی اس معاملہ میں، دور اندیشانہ خاموشی کی وجہ سے اس میں گھمنڈ پیدا نہ ہوا۔ پھر ایک واقعہ تو ایسا ہوا جس نے اس کی کایا پلٹ ہی کر دی نہ صرف اس کے دل میں عزت نفس اور خودداری نے جنم لیا بلکہ اس کی چال میں جو الھڑپن تھا اس کو ختم کر کے اس میں ایک وقار پیدا کر دیا۔

ہوا یوں کہ اس کے اسکول کا ایک وطن پرست اور نوجوان ماسٹر اس کے حسن اور وطن پرستانہ تحریروں سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوا۔ ایک دن بغیر کچھ سوچے سمجھے اور بغیر کسی کو درمیان میں ڈالے خود ہی شانتا کی پروگریس رپورٹ لے کر راگھپا کے پاس پہونچ گیا اور شانتا کی ذہانت کی تھوڑی سی تعریف کر کے راگھپا سے اپنا مدعا بیان کیا "اور کچھ نہیں تو وطن عزیز کی بھلائی کی خاطر ہماری شادی کرا دیجیے"۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں لیکن راگھپا نے انکار کر دیا اور یہ کہہ کر اسے دھمکایا بھی کہ پرنسپل کو رپورٹ کر دے گا۔ ماسٹر صاحب

یہ سن کر رسوائی کے ڈر سے اتنا خایف ہوئے کہ اسکول سے استعفیٰ دے کر کہیں اور چلے گئے چونکہ اس معاملے میں کوئی تیسرا شخص درمیان میں نہیں تھا اس لیے اس کا کوئی چرچا نہیں ہوا لیکن شانتا کو کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ ایک ماسٹر کی نوکری گئی۔ وہ رتنا کی طرح ہر معاملہ میں ماں کی دست نگر نہ تھی۔ وہ ماں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتی تھی۔ چمپکا چونکہ بے انتہا کمزور تھی اس لیے گھرداری کی ساری ذمہ داریاں شانتا ہی سنبھالتی تھی اس طرح گویا گھر کی اصلی مالکن وہی تھی۔

چمپکا نے جلد ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ راگھپا شانتا کی شادی وسنت سے کرنا چاہتا ہے اسے اس بات سے خوشی ہوئی۔ اس بات میں اُسے کوئی شبہ نہیں تھا کہ وسنت شانتا کو دیکھتے ہی اسے پسند کرے گا ــــ شانتا کا حسن ہی ایسا تھا ــــ ہو سکتا ہے وسنت راؤ کے باپ اس پر تیار نہ ہوں لیکن یہ اس کے سوچنے کی بات نہ تھی۔ سو جھوٹ بول کر بھی اس کا شوہر یہ کام کرے گا، اُسے اس بات کا یقین تھا۔ اس بات سے وہ اور بھی خوش تھی کہ وسنت دولت مند تھا۔ اُسے اس خیال سے بھی یک گونہ سکون ملتا تھا کہ اگر بھگوان کی مہربانی سے وہ حاملہ نہ ہوئی تو وسنت اس کی تھوڑی سی جائداد کے لالچ میں کٹی کے آڑے آ کر رتنا کے منھ کا نوالہ نہ چھینے گا۔ چمپکا نے اپنی زندگی میں بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں اس لیے اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے رہتے تھے۔ وسنت دولت مند ہے۔ کٹی جب شادی سے پہلے گھر میں آتا تھا تو اسے کسی بات کا ڈر نہ تھا لیکن راگھپا کی اجازت سے جب وسنت گھر میں آنے جانے لگا تو اسے سخت گھبراہٹ ہوتی۔ وہ سوچنے لگی: کیا اتنا دولت مند آدمی ہمارا داماد بننا پسند کرے گا اس پر بھروسہ کر لوں؟

چمپکا اور راگھپا کی شادی دھارواڑ میں پہلی لو میرج ہونے کی وجہ سے ایک مہینے تک لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہی تھی۔ چمپکا کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمیاں قایم تھیں۔ دوسروں کے بارے میں شارنگ راؤ کی طرح بے رحم بن کر ہر قسم کی باتیں کہہ دینا لوگوں کی ایک عام عادت ہوتی ہے۔ ان کی اعتدال پسندی اور پُروقار رہن سہن کو دیکھ کر بعض چھچھورے قسم کے بڈھے اب بھی یہ کہنے سے نہ چوکتے "نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی" اس کی شایستہ طبیعت کے لیے لوگوں کی یہ باتیں سبق آموز تھیں ــــ صرف ایک لمحہ کی لاپروائی سے اس کی عصمت کا چلا جانا

اس کے تکلیف دہ چرچے، ماں کا کنویں میں کودنے کو تیار ہونا۔ راگھپا کا شادی سے انکار کر دینا، ضمیر کی ملامت، آخر میں اسی صدمے سے ماں کی موت ـــ ان سب باتوں کو بھگت چکنے والی چمپکا اپنے بچوں کے بارے میں سوچتے سوچتے چکرا سی جاتی تھی۔

29

برملا تصادم

راگھپا سے ان کی ملاقات ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا لیکن پھر بھی پتہ نہیں کیوں دیسائی جی غیر مرئی طور پر اس کی موجودگی بار بار محسوس کرتے رہے۔ وسنت کے دھارواڑ آنے اور گھر پر آئے بغیر گاؤں واپس چلے جانے کی خبر کسی طرح ان کی جان پہچان کے لوگوں تک پہونچ گئی اور پھر ان لوگوں کے ذریعہ وینوبائی تک پہونچی۔ وینوبائی نے اس کی اطلاع دیسائی جی کو دی۔ دیسائی جی نے کچھ نہ کہا لیکن غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو گئے۔ وسنت کو خط ڈال کر دھارواڑ بلا لانے کی وینوبائی کی تجویز بھی انہوں نے نہیں مانی۔ وینوبائی کے لیے جب یہ صورت حال ناقابلِ برداشت ہو گئی تو وہ ایک دن دیسائی جی سے بولی؛

"یہ راگھپا بھی کیسا کمینہ ہے۔ گنگوا اس کا سایہ تک دیکھنا نہیں چاہتی۔ آپ کیوں اس سے جھگڑا مول لے رہے ہیں۔ ان کی امانت انہیں واپس کر دیجیے کہیں وہ لڑکے کا دماغ ہی خراب نہ کر ڈالے۔ دو ہزار روپیہ کی وجہ ہی سے تو وہ یہ ساری حرکتیں کر رہا ہے۔ ان کی چیز انہیں دیدیجیے۔ آپ کی فکر تو اس طرح سے ختم ہو گی۔"

"راگھپا کو آ کر پاؤں پکڑنے دو، دے دوں گا، تماشہ بنا رکھا ہے! میرا مقابلہ کرے گا؟ مجھ سے کشتی کرے گا؟ اگر چاہتا ہے تو خود میدان میں آئے۔ میں بھی تو دیکھوں! یہ کیا ہے کہ کٹی کو بھیج دیتا ہے! مجھے عقل سکھاتا ہے۔ ذرا ایک بار سامنے تو آ کر دیکھے۔ اسے کھمبے سے بندھوا دوں گا۔"

"پہلے تو ان لوگوں کے جھگڑے سے جان چراتے تھے۔ اب کیوں ایسے ارادے ہیں۔ اب کیا ان باتوں میں مزا آنے لگا۔"

"چھوڑو جی ان باتوں کو، ہمارے چپ رہنے پر بھی اگر وہ ہمیں چھیڑنا چاہتا ہے تو ایک بار فیصلہ ہی ہو جانے دو۔"

"اس کے ساتھ آپ جو چاہیں کیجیے لیکن وسنت کو ایک خط ڈال کر یہاں بلا لیجیے ورنہ کم از کم مجھے ہی وہاں بھیج دیجیے۔ آپ اس کی طرف سے جتنی لاپروائی برت رہے ہیں اتنا ہی وہ راگھیا کے جال میں پھنستا جا رہا ہے۔ آخر ابھی بچہ ہی تو ہے بے چارا۔ میں دو چار دن وہاں رہ کر آجاؤں گی۔"

یہ سن کر دیسائی جی قابو سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اب یہ بات بیوی کو بتا ہی دینا چاہیے کہ وہ کیوں خاموش بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ اٹھے اور دو دن پہلے آیا ہوا وسنت کا خط اپنی تجوری سے نکال کر بولے "تمہارا بیٹا ابھی بچہ ہے..... اس نے باپ کو چٹھی لکھی ہے۔ یہ دیکھو......"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے وسنت کا خط اسے پڑھ کر سنایا:

از انیام گرام

سفیدی والا مکان

بخدمت جناب والد صاحب!

ہمارے یہ خط تحریر کرنے کا سبب یہ ہے کہ مجھے بالغ ہوئے دو سال گزر جانے پر بھی آپ نے جائداد میں سے میرا حصہ مجھے نہیں دیا ہے اور بدستور اس پر قابض و متصرف ہیں۔ آپ کے تین لڑکے ہیں۔ ان میں میں منجھلا ہوں۔ قاعدے کے مطابق آبائی جائداد میں سے جتنے حصہ کا میں حقدار ہوں اتنا حصہ جلد از جلد میرے نام کر دیا جائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو چار بزرگوں کے سامنے بٹوارہ کر کے میں اپنا حصہ لے لوں۔ میرے بڑے بھائی اچیوت راؤ اور نابالغ بھائی پرشوتم اگر چاہیں تو وہ بھی اپنا اپنا حصہ لے لیں یا آپ کے پاس ہی رہنے دیں، اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ بہرحال اس بات کا فیصلہ چار آدمیوں کے سامنے ہو جانا چاہیے۔ مجھے اپنا حصہ چاہیے۔ اگر کسی بھی سبب اس خط کے وصول ہونے کے تین ماہ کے اندر آپ میرا حصہ مجھے دینے کا بندوبست نہیں کرتے تو نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ آپ کو تاخیر کا مناسب معاوضہ بھی دینا ہوگا۔ اس لیے اس کام کا جلد انجام پا جانا تمام فریقین کے مفاد میں ہے۔ اگر آپ

اجازت دیں تو میں اپنے چند بہی خواہوں کو اپنے ساتھ لے کر آپ سے ملنے آجاؤں
اس معاملہ میں اپنے عندیہ سے بلاپس وپیش فوراً مجھے مطلع کریں۔ گستاخی کے لیے
معذرت خواہ ہوں۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ یہ خط اگرچہ باقاعدہ طور پر
نوٹس نہیں ہے لیکن اسے نوٹس سمجھتے ہوئے پندرہ دن کے اندر اندر جواب
ارسال کر دیں۔ خیریت سے بھی مطلع کریں۔ آپ کا دوسرا بیٹا

وسنت (ب) دیسائی

وینو بائی بیٹے کا خط سن کر حیران رہ گئی۔ یہ سوچ کر کہ اس کے شوہر کو اس سے کتنی اذیت ہوئی ہوگی
وینو بائی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میں نے کتنا سمجھایا، بیٹا ایسا نہ کر، بری عادتیں مت سیکھ،
برے لوگوں کی صحبت میں نہ بیٹھا کر، باپ دیوتا کی طرح ہیں، تو بھی یہ نوبت آگئی۔ وہ پچھلے جنم کا
بیری ہے، بیٹا بن کر پیدا ہو گیا اس لڑکے سے آپ کو سکھ نہیں مل سکتا۔"
"میرا کیا کرے گا؟ خود بھگتے گا؟ یہ خط لکھنے کے لیے اسے کس نے اکسایا ہے؟ کیا میں اتنا
بھی نہیں سمجھ سکتا۔ . . . اس گروکا تو میں ٹیٹوا دباؤں گا۔ اس بار کٹی رِ ٹی سب سیدھے راستے پر
آجائیں گے۔"

دیسائی جی نے کچھ فیصلہ کر کے وسنت کو یہ خط لکھا:
نورِ چشم وسنت راؤ طول عمرہٗ — تمہارا خط ملا۔ تم میرے بیٹے ہو، یہ بات میں
بھول نہیں سکتا ہوں۔ تم اپنے بہی خواہ کو لے کر مجھ سے ملنے آجاؤ۔
دعا گو۔ گوپال راؤ۔

وسنت اس خط کو پڑھ کر ڈر گیا کیونکہ اس میں اصل معاملے کا تو ذکر ہی نہ تھا۔ اس نے اپنے
باپ کو جو خط لکھا تھا وہ اپ نیا بھٹ سے لکھوایا تھا، اپنے ہاتھ سے اس کی نقل کر کے باپ کو
بھیج دی تھی۔ اسے توقع نہ تھی کہ باپ کے پاس سے اس خط کا جواب اتنی جلد آجائے گا۔ اب اپ نیا
بھٹ کو بلانا ہوگا۔ اب تک کا کام تو اس نے اپنی عقل سے خود ہی کر لیا تھا لیکن اب آگے راگھیا
سے صلاح لینا ہوگی۔ دل میں یہ فیصلہ کر کے اس نے اپنے خط کی نقل اور باپ کا خط احتیاط
سے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور راگھیا سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔
یہ بات راگھیا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس کا بویا ہوا بیج اتنی جلد بار آور
ہو جائے گا۔ دیسائی جی سے وہ کھلم کھلا دشمنی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چھپ کر چوٹ کرنے

کے موقع کی تاک میں تھا لیکن اس نے اپنے دلی جذبات چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیے اور سپاٹ چہرے سے دونوں خط پڑھے۔ آپ نپا بھٹ کے لکھے ہوئے خط کی تعریف کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "برہمن ہے ہوشیار، اس کی تحریر میں ٹھہراؤ ہے۔" دیسائی جی کے لکھے ہوئے خط کو غور سے اس نے دوبارہ پڑھا اور اس کی ایک باریکی کو بھی سمجھ گیا جو وسنت کی فہم سے بالاتر تھی وسنت نے اپنے خط میں 'ہی خواہوں' لکھا تھا یعنی جمع کا صیغہ۔ دیسائی نے اپنے خط میں صرف "ہی خواہ" لکھا تھا یعنی ایک کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ راگھپا اس کا مطلب سمجھ گیا۔ ابھی دیسائی جی سے وہ کھلم کھلا الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بولا:

"لیکن وسنت راؤ تمہارے باپ کے خط سے ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟ بلایا تو ہے۔"

"تمہیں اتنی جلدی بلا رہے ہیں اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری بات کا ان پر مطلق اثر نہیں ہوا ہے۔ تمہارے پتا اتنے ڈھیل دینے والے آدمی نہیں ہیں۔ میں انھیں جانتا ہوں۔"

"لیکن جب بلایا ہے تو ان کی بات کو سن لینے میں کیا حرج ہے؟"

"ہاں، جائیے ضرور جائیے اور ان کی بات سنیے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔"

"آپ کو بھی ساتھ چلنا چاہیے۔" وسنت راؤ کو شک ہونے لگا کہ شاید راگھپا اب جانے سے کترا رہا ہے۔

"باپ بیٹے کی گفتگو میں ہم لوگوں کا درمیان میں آنا ٹھیک نہیں ہے۔"

یہ سن کر وسنت کا منھ اتر گیا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر راگھپا نے دلاسا دیتے ہوئے کہا:

"وسنت راؤ میں نے آپ کا ساتھ چھوڑا ہے ...... ایسا مت سمجھیے۔ میں ہمیشہ آپ کے پیچھے ہوں کیونکہ ایک بار ناٹک کمپنی کھولنے کا فیصلہ کر لینے کے بعد میں آپ کو مدد دینے کا پابند ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ..... لیکن میرے آنے سے آپ کو فائدہ نہیں ہوگا۔ میں تو آخری حربہ ہوں ..... پہلے آپ اپنے چھوٹے چھوٹے حربے استعمال کریجیے۔ پہلے آپ اسی چٹھی لکھنے والے بھٹ کو ساتھ لے جائیے۔ وہ ہوشیار آدمی معلوم ہوتا ہے اور اپنے والد صاحب کا عندیہ معلوم کریجیے۔ اگر وہ غصہ بھی ہوں تو آپ غصہ نہ کیجیے گا۔ وہ آپ کو پھسلانا چاہیں تو آپ سخت بن جائیے گا۔ آپ کے والد صاحب کھوکھلی شخصیت والے آدمی نہیں ہیں۔ پہلے آپ کو لالچ دیں گے ہچکی چپڑی

باتیں کریں گے۔ ڈرائیں گے، غرض ہر ممکن تدبیر کریں گے۔ جب آپ اس امتحان کا کامیاب ہو جائیں تب مجھے بلائیے گا۔ اس طرح فیصلہ کراؤں گا کہ آپ کو ذرا بھی نقصان نہ ہوگا۔ چاہے جیسا بھی وکیل کیوں نہ آجائے آپ کو ذرا بھی دھوکا نہیں ہونے دوں گا لیکن پہلے آپ یہ پتہ لگائیے کہ آپ کے پتاجی کا ارادہ کیا ہے؛ مجھے کچھ تھوڑا بہت اندازہ تو ہو جانے دیجیے۔ اس کے بعد جو کچھ کرنا ہوگا وہ ہم کریں گے کیونکہ کام کے شروع میں ہی دو ٹوک ہو جانا ٹھیک ہے۔ سمجھے آپ" اس کی اس تقریر سے وسنت کی کوئی خاص ہمت نہ بندھ سکی لیکن تھوڑا جوش اس میں ضرور پیدا ہو گیا۔ اسے راگھیا کا مشورہ ٹھیک ہی معلوم ہوا۔ ہر کام کی الگ الگ سطحیں ہوتی ہیں۔ اس سطح کے مطابق ہی شخصیت کا استعمال کرنا ٹھیک ہوتا ہے پھر بھی ہمت کی کمی ہونے کی وجہ سے وہ پس و پیش میں تھا۔ اس نے راگھیا سے پوچھا۔

"اپ پنا بھٹ ہوشیار تو ہے مگر ڈرپوک ہے۔ دھمکانے پر ڈر جاتا ہے۔ اگر اب جانے سے منع کر دے تو؟"

"دس روپیہ اس کے آگے ڈال دینا، آئے گا کیوں نہیں! ناٹک کا آدمی ہے، بھاگا بھاگا آئے گا۔"

وسنت راؤ کی اب بھی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ باتیں راگھیا اپنے بچنے کے لیے کہہ رہا ہے یا سچ مچ ۔۔ بہرحال اس نے راگھیا سے یہ وعدہ لیا کہ اگر اپ پنا بھٹ ساتھ نہ گیا تو اسے ساتھ جانا پڑے گا۔ بعد میں وہ اپ پنا بھٹ کو ڈھونڈنے کھانے کا انتظار کیے بغیر گاؤں چلا گیا۔

اپ پنا بھٹ ویدانتی تھا۔ اس نے بچپن میں وید پاٹھ کی مشق کی تھی۔ اب یہی اس کا ذریعۂ معاش تھا۔ وہ شاعری بھی کرتا تھا۔ "اے مانو، ممتا کو تیاگ"، اس کا لکھا ہوا یہ گیت گاؤں میں بہت مقبول ہوا تھا۔ کیرتنوں میں اس کا یہ بھجن بہت مقبول تھا" اہنکار کو جیسے مہا یوگی چھوڑ دیتے ہیں ویسے ہی رام نے سیتا کو چھوڑ دیا ۔۔" دیسائی جی کے سامنے جانے کی بات سن کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑے دیسائی جی کا نام سن کر بھگوان کے نام سے بھی زیادہ ان کے نام سے ڈر لگتا۔ دس روپیہ انعام کے لالچ میں منع بھی نہ کر سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح کوئی منتر پڑھتا ہوا ساتھ چلنے کو آمادہ ہو گیا۔ چار سال پہلے جب وہ ناٹک سکھانے کے لیے سفیدی والے مکان میں گیا تھا تب اسے پندرہ روپیہ بیٹے سے ملے تھے اور پھر بعد میں ناٹک سکھانا

بند کرنے کے لیے باپ نے اسے پندرہ روپیہ دیے تھے اس طرح اُسے آٹھ ہی دن میں آدھی بوری جوار اور تیس روپیہ نقد حاصل ہو گئے تھے۔ اُسے اس زمانے کا عمدہ کھانے کا مزا اب بھی یاد تھا۔ اس لیے لالچ میں آکر وسنت کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

وسنت اور اس کا خیر خواہ اپ پنا بھٹ دھارواڑ پہونچ گئے۔ ہوٹل میں جاکر پیڑے، حلوا، سوجی کے لڈو وغیرہ کھاکر بھٹ کے اوسان کچھ ٹھیک ہوئے، ڈر بھی کسی قدر کم ہوا اور اس طرح گویا وسنت کا کام کرنے کے قابل ہوا۔ راگھپا سے ملاقات کے بعد کچھ اور ہمت بندھی۔ وہاں سے دونوں نے ڈیسائی جی کے گھر جانے کے لیے ٹانگہ پکڑا۔ آدھے راستے سے بھٹ نے ٹانگہ لوٹا کر اوڈپی، ہوٹل میں کسی نیئے دولھا کی طرح میوے پڑا ہوا دودھ پیا۔ وسنت نے بھی ایک لیمن کی بوتل پی اور بھٹ کی ہمت بڑھانے کو کہا "بھٹ جی کام اگر ٹھیک ٹھیک بنا دوگے تو گھوڑے پر بٹھا کر نہایت شان سے تمہارا جلوس نکالوں گا ــــ" دوبارہ ٹانگے پر بیٹھ کر وہ دیسائی جی کے گھر کے سامنے پہونچ گئے۔

گھر کا پھاٹک بند تھا۔ باہر کوئی نوکر چاکر بھی دکھائی نہ دیا۔ وسنت کی سمجھ میں نہ آیا کہ تاجی کو آواز دے یا نہ دے۔ یہ وقت دیسائی جی کے سونے کا تھا۔ اور وہ آیا تھا اس وقت حصہ مانگنے لیکن ان کی نیند خراب کرنا آسان بات نہ تھی۔ وسنت نے بھٹ سے کھسر پسر شروع کی پھر پچھواڑے سے جاکر ماں سے ملنے کو جی چاہا لیکن بھٹ فوراً بول پڑا۔

"راؤ صاحب اگر ایسا کروگے تو کام بگڑ جائے گا۔ آتے ہی آتے اگر بات ہوگئی تو روپیہ میں دو آنے بھر کامیابی تو حاصل ہو ہی جائے گی، مجھے یہ امید ہے۔ لیکن اگر آپ ماں سے بات کرنے بیٹھ گئے، بہن سے صلاح لینے لگے اور دادی کو پیار کرنا شروع کر دیا تو ہو چکا کام!" وسنت نے مجبور ہو کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز سن کر پھر جادوڑا ہوا آیا کہ دیسائی جی کی نیند نہ خراب ہو لیکن اس کے دروازہ کھولتے کھولتے دیسائی جی جاگ اٹھے تھے۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آنگن میں آئے۔ اپنے سامنے بیٹے کو کھڑا پاکر اور اس کے پیچھے باہنوں پر آڑا ترچھا چندن لگائے، گھٹنوں تک دھوتی پہنے، جھوٹی مسکراہٹ منھ پر طاری کیے بھٹ کو دیکھا تو حیرت سے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ دیسائی جی نے اُن کو اندر نہیں بلایا خود دروازے پر چلے گئے۔ انھوں نے ایک نظر وسنت پر ڈالی اور پھر دوسری طرف رخ کر کے اپ پنا کو گھورنے لگے۔ اس سے گویا اپ پنا بھٹ کو اپنا تعارف کرانے کا موقع مل گیا۔ وہ بولا "راؤ صاحب، آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔

میں اپ نیا بھٹ ہوں۔ میں پہاڑی برہمن ہوں۔ پہلے بھی آپ کے صاجزادے کو ناٹک سکھانے سفیدی والے مکان میں آیا تھا۔ آپ نے انعام دے کر واپس کیا تھا۔"

دیسائی جی خاموشی سے سنتے رہے پھر بھرما کی طرف دیکھ کر بولے" اسے ایک مٹھی جوار دے کر رخصت کر۔"

"نہیں، نہیں، راؤ صاحب میں بھیک مانگنے نہیں آیا ہوں۔"

"سمجھ گیا۔ سمجھ گیا، آپ وسنت کے بہی خواہ ہیں ـــ وسنت اپنے اصلی خیر خواہ کو بلا کر لا۔ اس برہمن کو کیوں لے کر آیا ہے؟"

دیسائی جی کی ایک ایک بات کو سن کر وسنت کے ہاتھ پیر شل ہوتے جارہے تھے۔ اب بھی اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

بھلے سے گھوڑے پر جلوس نکلے یا نہ نکلے دس روپیہ تو حلال کرہی لوں، یہ سوچ کر ہمت کرتے ہوئے بھٹ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا" آپ نے اپنے صاجزادے کو جائداد کا حصہ لے جانے کے لیے خط لکھا تھا...... اب بیٹے پر اتنا غصہ کیوں کررہے ہیں مہاراج؟ کیا باپ بیٹے میں اس قسم کا بٹوارہ پہلی بار ہورہا ہے؟ آپ کو پُر سکون رکھنے کے لیے وسنت راؤ مجھ غریب برہمن کو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ آپ سے کچھ ملے یا نہ ملے یہ کوئی خاص بات نہیں لیکن یہ گھریلو جھگڑا یہیں ختم ہوجانا چاہیے۔ یہ ہم جیسے بے سہارا لوگوں کی....."

اپ نیا بھٹ کی ڈرامائی تقریر پر متحیر بھرما کی جانب دیسائی جی نے غصہ سے گھورا اور چلائے "کیا بہرا ہوگیا ہے؟ اس برہمن کو ایک مٹھی جوار دے کر احاطے سے باہر نکال دے۔"

بھرما خوفزدہ ہوکر جوار لینے اندر گیا۔ اب وسنت نے بھی اپنی زبان کھولی۔

"اپ نیا بھٹ کو میں ہی ساتھ لایا ہوں۔"

دیسائی جی بولے "جس کو جی چاہا لے آئے۔ کیا یہ دھرم شالہ ہے؟ لانا ہی ہے تو اپنے خیر خواہ راگھپا کو ساتھ لا۔" یہ کہہ کر غصہ سے کانپتے ہوئے انہوں نے وسنت کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور بولے "حصہ چاہیے تجھے، یہ لے حصہ۔"

دیسائی جی کے تھپڑ کی چوٹ وسنت کو ایسی لگی جیسے کسی جن نے اُسے مارا ہو۔ وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

اس اثنا میں اپ نیا بھٹ وہاں سے کھسک کر پھاٹک کے قریب پہونچ گیا تھا اتنے میں

اندر سے جوار لے کر آتے ہوئے بھرما نے اُسے دیکھ لیا اور تیز تیز قدم بڑھا کر اُسے جا لیا۔ جوار اس کی دھوتی کے پلو میں ڈالی اور اسے گیٹ سے باہر کر دیا۔

شور غل کی آواز سن کر وینو بائی بھی باہر نکل آئی تھی۔ اس نے سیڑھی پر گٹھری کی مانند پڑے ہوئے بیٹے کو اٹھانا چاہا۔ وہ نہ اُٹھا۔ وینو بائی نے وسنت کے ہاتھ کو گال پر سے ہٹایا تو دیسائی جی کی انگلیوں کے نشان صاف نظر آئے، البتہ چھنگلی کا نشان زیادہ واضح نہ تھا۔ تیسری انگلی میں پڑی ہشت پہلو انگوٹھی کا نشان بھی وسنت کے گال پر پڑ گیا تھا۔ ماں کو دیکھ کر سہمے ہوئے وسنت نے رونا شروع کر دیا۔ بھرما کی مدد سے وینکا اُسے اٹھا کر اندر لے گئی اور بستر پر لٹایا۔ تل کا تیل گال پر ملا۔ پانی گرم کیا ـــ وسنت بالکل خاموش تھا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری تھے۔ اب تک تو وہ آہستہ آہستہ سسکیاں ہی لے رہا تھا لیکن اب اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

وسنت چپ چاپ مار کھا کر اس طرح کیوں رویا؟ قارئین کے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔ غلط راستے پر چلنے والے بے راہ نوجوان، خصوصاً دولت منداور بے فکرے نوجوان، جسمانی تکلیف سے کتنا ڈرتے ہیں، یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تجربہ کار لوگوں کے علم میں نہ ہو۔

ماں کی گود میں سر رکھ کر دو تین گھنٹے تسلی پانے کے بعد وسنت راؤ کا خوف کچھ کم ہوا۔ کپکپی بھی جاتی رہی لیکن گال میں درد اب بھی موجود تھا۔ تھپڑ کی چوٹ سے اس کے کان بند سے ہو گئے تھے۔ البتہ اس تھپڑ سے جو ذہنی جھٹکا لگا تھا اس میں تھوڑی سی کمی ضرور آئی ـــ اتنی دیر میں بھرما نے وسنت کا اوپر والا کمرہ دُرست کر دیا۔ ماں کے کہنے پر وسنت نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے دیسائی جی کے کمرے میں جا کر ان کے پاؤں چھوئے اور ان سے معافی مانگی۔ دیسائی جی بولے "مجھے تم پر یقین نہیں ہے۔ اگر غلطی ہو گئی ہے تو اپنے طور طریقے ٹھیک کر کے دکھاؤ۔"

اس موضوع پر دوبارہ کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ وسنت کو اس بات سے بہر حال یک گونہ اطمینان تھا کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی باپ نے اُسے کچھ کہے سنے بغیر پھر سے گھر میں رکھ لیا تھا۔ انھوں نے دوبارہ اُس سے راگھپا کا ذکر بھی نہیں کیا اور وسنت نے بھی گاؤں واپس جانے کا نام نہیں لیا۔ اس کے سکھ کے دن گویا پھر سے لوٹ آئے ـــ سکھ کے لیے کچھ نہ کچھ قیمت تو بہر حال ادا کرنا پڑتی ہے،

وسنت جلد ہی اس واقعہ کو بھول گیا۔ اصل میں وہ ابھی تک بچپن کی حد کو پار نہیں کر سکا تھا۔ آئندہ پچاس سال تک بھی اس کا امکان نہ تھا ـــــ اس دن مار کھا کر اس نے راگھپا کے گھر جانا بھی چھوڑ دیا۔

30

راگھپا کی جیت

دیسائی جی کے گھر سے مٹھی بھر جوار لے کر جب اپیا بھٹ صحیح سلامت باہر آ گیا تو اس نے بھگوان کا شکریہ ادا کیا، "بھگوان کی ہی دیا ہے کہ دیسائی جی نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا"۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ وہ وسنت کے بھروسے پر دھارواڑ آیا تھا اس لیے اپنے ساتھ وہ ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ لایا تھا۔ وسنت نے اُسے منجدھار میں چھوڑ دیا تھا ـــ راگھپا کے گھر کا پتہ بھی اسے یاد نہ تھا۔ اگر راگھپا کا کچھ اتہ پتہ اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ اس کے گھر کے سامنے ایک انجیر کا پیڑ ہے ـــ لیکن اس کی خوش قسمتی سے اسے اپنے سامنے سے وہی تانگہ آتا دکھائی دیا جس پر صبح وہ لوگ دیسائی جی کے گھر آئے تھے۔ اسی میں اپنی نجات سمجھ کر وہ جان کی پروا کیے بغیر تانگے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور چلانے لگا۔ تانگہ رُک گیا۔ تانگے والے سے راگھپا کے گھر کا راستہ پوچھ کر چکر کاٹتا ہوا بڑی مشکل سے اس انجیر کے پیڑ تک پہونچا اور پھر راگھپا کے گھر گیا۔ وہاں پہونچ کر کھانا کھایا اور دیسائی جی کے گھر میں پیش آنے والے واقعات شروع سے آخر تک راگھپا کو سنائے۔ پھر راگھپا سے کرایہ اور خرچ کے لیے کچھ پیسے مانگ کر بھگوان کا نام لے کر گاؤں کی بس پکڑ لی۔

راگھپا پندرہ روز تک وسنت کا انتظار کرتا رہا لیکن وسنت کا کچھ سراغ نہ ملا۔ ہاٹ بازار کو آنے والے گاؤں والوں نے اسے بتایا کہ وسنت سفیدی والے مکان میں لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ راگھپا فکر مند ہو گیا کہ وسنت کہاں جا سکتا ہے۔ دھارواڑ میں باپ کے ساتھ رہ کر کیا شرم یا ڈر سے مجھ سے آنکھیں چرا رہا ہے؟ نا ٹک گیا بھاڑ میں ـــ اگر میں نے یونہی ڈھیل چھوڑے رکھی تو وسنت اپنے باپ کے بس میں ہو جائے گا اور میری بیٹی کا اس کے ساتھ بیاہ ایک خواب رہ جائے گا۔ بھولے بھٹکے بھی وہ مجھے راہ میں نہیں ملتا۔ اچھا باپ کا ڈر ہے۔

جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے راگھپا کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ وسنت اگر راستے میں

نہ ملا تو اُسے دیسائی جی کے گھر پر جانا پڑے گا۔ کسی نہ کسی طرح اس سے ایک بار ملنا بہت ضروری ہے آگے کیا کرنا ہے یہ اسی وقت دیکھا جائے گا۔ وہ دیسائی جی کے گھر جانے کا بہانہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ ایک اچھا موقع خود بخود پیدا ہو گیا۔

ایک دن چمپکا نے سب کھایا پیا الٹی کر دیا۔ راگھپا ایک دم اچھل پڑا۔ بیوی سے پوچھا۔ "الٹیاں شروع ہوئے کتنے دن ہو گئے؟" چمپکا آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "تین مہینے۔"

اسی دن دو پہر کو راگھپا تانگہ کر کے اُسے سرکاری اسپتال لے گیا وہاں لیڈی ڈاکٹر کو دکھا کر اس سے مشورہ کیا۔ معلوم ہوا تقریباً تین مہینے چڑھ گئے ہیں۔ یہ سن کر راگھپا نے دل ہی دل میں خوشی سے نعرہ لگایا "راگھو پا بھاری کی جے۔"

یہ خبر دیسائی جی کو پہونچائے بغیر راگھپا کو بھلا کیسے چین مل سکتا تھا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن وہ دیسائی جی کے گھر پہونچا۔ دیسائی جی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ بہر حال یہ سوچ کر کہ اگر اس نے ان کے بیٹے کے سلسلہ میں کچھ کہا تو وہ بھی اُسے مزا چکھا دیں گے انھوں نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر احترام سے گدے پر بٹھایا۔ اسے پان پیش کیا اور مزاج پرسی کی۔ اس کے بعد اس کی بات سننے کے لیے تیار ہوئے۔ راگھپا بڑے ادب کے ساتھ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور دیسائی جی کی جانب منہ کر کے بڑے رازدارانہ انداز میں بات شروع کی "رائے صاحب، آپ لوگوں کی مہربانی سے ویسے تو سب خیریت ہے لیکن بدقسمتی چین نہیں لینے دیتی۔ مجھے اس فکر کے مارے رات کو نیند نہیں آتی کہ آپ کے سامنے جھوٹا نہ بننا پڑے کیونکہ آدمی کی ساکھ اس کی زبان سے ہے۔ ایک بار زبان دینے کے بعد جھوٹا نہیں بننا چاہیے۔ یہی اصلی دھرم ہے۔ لیکن بھگوان ہی اگر دیے ہوئے وچن کو جھوٹا کرنے پر اتر آئیں تو انسان کیا کرے۔ ایسے حالات میں بڑا کٹھن اخلاقی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں تو بھگوان سے ہاتھ جوڑ کر ہر وقت یہی پرارتھنا کرتا ہوں کہ میرا وچن جھوٹا نہ ہو۔۔۔ لیکن جب بھگوان ہی اس پر کمر کس لے تو۔۔۔" دیسائی جی خاموش مسکراہٹ کے ساتھ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں مسکراتے دیکھ کر راگھپا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا "ارے دیسائی۔ تم میری بات پر ہنس رہے ہو۔۔۔" پھر اس تمہید کو ختم کر کے تھوک نگلتے ہوئے بولا "بھگوان کی قدرت تو دیکھیے دیسائی جی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس ڈھلتی ہوئی عمر میں اولاد پیدا کرنے کے قابل بھی رہ سکتا ہوں۔ اگر کوئی ہوشیار جوتشی بھی یہ بتاتا تو میں ہنس دیتا۔ لیکن کیا اسی کو سچ ہونا تھا۔" دیسائی جی کی مسکراہٹ ختم ہوتے ہوئے

دیکھ کر راگھپا نے اپنے دل میں کہا " اب آئے راستے پر دیسائی "۔ دیسائی جی خاموش رہے۔ راگھپا نے جیب سے ایک پرچہ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا " دیکھیے ابھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھا کر آ رہا ہوں "۔ دیسائی جی نے اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا۔

" دیسائی جی، آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن میری بھگوان سے یہی التجا ہے کہ بھگوان مجھے بیٹا نہ دے۔ آپ پوچھیں گے کیوں ؟ کیا ہمارا اکٹی میرے لیے غیر ہے۔ بھانجا بھی ہے اور داماد بھی۔ میں نے جب سے اُسے دیکھا ہے برابر اسے اپنے بیٹے کی طرح مانتا چلا آ رہا ہوں۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے ۔۔ وہ چاہے زیادہ ہو یا کم ۔۔ چاہے پوری ریاست ہی کیوں نہ ہوتی ۔۔ اُسی کے ہاتھوں میں سونپ کر آنکھیں بند کرنا چاہتا ہوں۔ پرماتما بہت مہربان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری اس خواہش کی تکمیل میں روڑے نہیں اٹکائے گا ۔۔ دیکھیے دیسائی جی بھگوان کیا کھیل کھیلے گا، یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا ۔۔ آخر میں یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں۔ اس لیے کہ کل لوگ بھلے ہی مجھے جھوٹا کہیں لیکن آپ جیسے بزرگوں کو صحیح صورت حال معلوم ہو جانی چاہیے ۔۔ یہی ہماری صفائی ہو گی۔"

دیسائی جی مسکراتے ہوئے بولے " آپ کے یہاں اگر لڑکا پیدا ہوا تو میں پڑے باتو نگا راگھپا جی۔ آپ اس متبنیٰ کے چکر کو چھوڑیے۔ اگر آپ کی دولت خدا نے کرشن کے نصیب میں لکھ دی ہے تو کوئی کچھ بھی کرے اس سے چھین نہیں سکتا۔ اگر اس کے نصیب میں نہیں ہے تو وہ لاکھ کوشش کرے اُسے مل نہیں سکتی۔ اس لیے ایسی باتوں پر اگر آپ جیسے سمجھدار لوگ یہ کہنے لگیں کہ مجھے لڑکے کی ضرورت نہیں میں تو متبنیٰ ہی کروں گا تو بھگوان کو یہ بات پسند نہ آئے گی۔ دنیا کی ریت کے مطابق آپ کو چاہیے کہ آپ بھگوان سے یہی پرارتھنا کریں کہ مجھے لڑکا دے کر خاندان کی نجات فرمائے۔ بھگوان کی یہی مرضی ہے۔ اسے کون جانتا ہے۔"

راگھپا نے دل میں کہا " ہاں بھیا تم بڑے ہوشیار ہو " اور اپنی رام کہانی جاری رکھی۔ " لڑکی ہو یا لڑکا۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ آپ کے کہنے کے مطابق مجھے دنیا کی ریت کو سامنے رکھتے ہوئے بھگوان سے لڑکا ہی مانگنا چاہیے لیکن اُس سے مجھے راحت نہ ملے گی۔ میری بیوی بہت کمزور ہے۔ مجھے اس بات سے تشویش ہے کہ پتہ نہیں وہ کیا کر ڈالے "!

" کچھ بھی نہیں ہو گا جی، آپ ڈر چھوڑیے۔ بھگوان پر یقین رکھیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

راگھپا کو ایسا محسوس ہوا کہ دیسائی جی اس کی بات سے اختلاف ظاہر کیے بغیر اس کی

ہر بات کو تسلیم کر کے اُس کے چنگل سے صاف نکل گئے۔ دیسائی جی کے غصہ نہ ہونے پر اُسے بڑا طیش آیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر پہلے جیسی طاقت ہوتی تو کسی نہ کسی طرح دیسائی کو غصہ دلا ہی دیتا اس کی تمام چالیں بیکار ہوتی چلی گئیں۔ بغیر جوش کے شعر لکھنے والے شاعر کی طرح راگھپا جلد ہی تھکن محسوس کرنے لگا۔ ایک گلاس پانی پی کر وہ چلنے کو تیار ہوا کہ اس کی نظر امرود پر چڑھے ہوئے وسنت راؤ پر پڑی۔" دیسائی جی اور اُس کی اپنی سماجی سطح میں جو فرق تھا اس کے پیشِ نظر اس بات کی تو کوئی توقع تھی نہیں کہ دیسائی جی بیٹے کو بلا کر اس کا تعارف راگھپا سے کرائیں گے اس کے ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی آیا کہ اس نے اپنی لچھے دار باتوں سے وسنت راؤ کے اوپر جو رنگ چڑھایا تھا وہ اس خرانٹ دیسائی جی نے دھو دیا ہوگا۔ لہٰذا اس نے وہیں سے آواز لگائی۔

"اے وسنت راؤ۔ وسنت راؤ۔"

وسنت کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے کون آواز دے رہا ہے۔ وہ پیڑ سے اُتر آیا۔

آپ کا ہمارے وسنت سے تعارف ہے؟ کہاں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ سوالات دیسائی جی اس سے کریں گے۔ یہ سوچ کر راگھپا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اگر دیسائی جی نے یہ سوالات پوچھے تو وہ وسنت کی ناٹک میں راجا کا رول کرنے کی خواہش، ناٹک کمپنی کے لیے پردوں وغیرہ کی تیاری کے سلسلہ میں بات چیت، سندر رسائی کے گھر جا کر وسنت کا گانا سننا وغیرہ تمام باتیں نمک مرچ لگا کر ان کو بتائے گا اور ان کا سر نیچا کر دے گا۔ لیکن دیسائی جی نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ وہ چپ چاپ ایسے بیٹھے رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وسنت راؤ کمرے میں آتے ہی راگھپا کو دیکھ کر منہ لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے کچھ کہنے کا موقع نہ دیتے ہوئے راگھپا نے اس کی طرف بڑھ کر تیزی سے بولنا شروع کر دیا" ارے وسنت، کیا ہمیں بھول گئے؟ گاؤں میں جانوروں کے میلے میں ایک جوڑی بیل دکھائے تھے اس وقت آپ نے کہا تھا دھارواڑ آ کر ملوں گا۔ کتنے دن ہو گئے۔ یہیں لین بازار میں ہمارا گھر ہے۔ ایک بار آئیے اپنا وعدہ بھولیے گا نہیں؟ کیوں، کیا پتا جی منع کرتے ہیں؟ میں ان سے بھی کہے دیتا ہوں اپنے بیٹے کے مبارک قدم ایک دن ہمارے یہاں بھی پڑنے دیجیے۔ کل ہمارے گھر آئیے۔" یہ کہہ کر دیسائی جی کی طرف رخ کر کے زور سے ہنسا اور" اچھا اب میں چلتا ہوں" کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

دیسائی جی خاموش رہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی انھوں نے وسنت سے کچھ نہ کہا۔ گھر واپس جاتے ہوئے راگھپا کو اپنے باتونی پن پر بڑی شرم آئی۔" ارے میں راگھو پا بھاری ہوں! ایسا

سفید جھوٹ بولنا میں نے کب سے سیکھا؟ یہاں جھوٹ بولنے کی کیا بات تھی؟ ــ صرف گھر آنے کو ہی کہا ہوتا تو کیا کام نہ چلتا۔ ایسا چھچھورا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔"

راگھپا ہر ہر قدم پر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اس کے دن بدلتے جا رہے ہیں۔ دیسائی جی جیسے شخص سے لڑنے کے لیے اور ہی قسم کے جھوٹ کا سہارا درکار تھا۔ ایسا ہلکا اور اوچھا جھوٹ بولنے پر راگھپا کو اپنے آپ پر غصہ آیا اور اس کے منہ سے مایوسی میں "اُف" نکل گیا۔

31

علاج

دوسرے دن دوپہر کے کھانے کے بعد سونے کا بہانہ کرکے وسنت نے اپنے کمرے میں جا کر استری کلف کے کپڑے پہنے اور تین بجے کے قریب خوب بن ٹھن کر اور یہ سوچ کر کہ پتا جی سو گئے ہوں گے وہ آہستہ سے آنگن کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ دیسائی جی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ ابھی تک ان کے اس دن کے تھپڑ کو نہیں بھولا تھا۔ ان کی ہیبت اس کے دل میں بڑھ گئی تھی ان کو دیکھتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ دیسائی جی نے قریب آتے ہی اس سے پوچھا "راگھپا کے گھر جا رہے ہو؟" گھبراہٹ کے مارے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ کوئی جھوٹا بہانہ بنانے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ اُسے اور گھبراہٹ کا موقع نہ دیتے ہوئے دیسائی جی بولے "اگر جا رہے ہو تو یہ خط راگھپا کو دے دینا اگر تم کہیں اور جا رہے ہو تو میں بھرما کو بھیج دوں"۔ باپ کی خدمت کرنے کا موقع پا کر خوشی سے جھوٹ کا سہارا لیتا ہوا بولا "جی، اسی راستے سے جاؤں گا، واپسی پر خط دیدوں گا۔"

دیسائی جی نے تہہ کیا ہوا بغیر لفافے کا ایک خط اس کے ہاتھ میں دیدیا اور کہا "کہہ دینا پتا جی نے دیا ہے۔"

وسنت کے لیے یہ خط گویا راگھپا کے گھر جانے کا اجازت نامہ تھا۔ راستہ میں اس نے ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر اس خیال سے وہ خط پڑھا کہ کہیں اس میں اس کے اپنے بارے میں تو کچھ تحریر نہیں تھا لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اُن میں کہیں اس کا نام تک نہیں تھا۔

وہ خط اصل میں وینکٹ کے ہبہ نامے کی نقل تھی جو اچیوت نے دیسائی جی کو بھیجی تھی۔

دلیپاائی صبح سے اس کی نقل تیار کرکے وسنت کے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ اسے وسنت کے ہاتھ ہی راگھپا کے پاس بھیجا جائے۔ اس لیے جب وسنت غسل خانے میں منھ دھونے آیا تھا تب وہ جاگ گئے اور جب وہ چوروں کی طرح گھر سے باہر جانا چاہتا تھا تو انھوں نے وہ خط اسے پکڑا دیا تھا۔ اس طرح راگھپا پر وہ ایک ہوائی فیر چلانا چاہتے تھے۔

وسنت راؤ خوشی خوشی راگھپا کے گھر پہونچا۔ راگھپا نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کے پہونچتے ہی رسوئی میں جاکر عمدہ قسم کا کاجو کا حلوا تیار کرنے کے لیے کہا۔ راگھپا نے اسے گدے پر بٹھا کر مذاق میں کہا "اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ باپ اور بیٹے کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ تمہیں حصہ دلانے کے چکر میں ہم مفت میں بدنام ہوئے۔ آپ لوگ تو پھر ایک ہو گئے۔ اور ہمیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔" اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ راگھپا نے اس کے تھپیڑ کھانے کی بات کو چھوڑ کر باقی سب ہی باتیں کیں۔ آخر میں ناٹک کی بات چلی۔ ناٹک کے دھندے میں کس کس کمپنی نے کتنا کتنا کمایا اور کون کون سی کمپنیاں اُجڑ گئیں، یہ تمام باتیں خوب مزے لے لے کر سنائیں اور کہا "ویسے تمہاری کمپنی تو جنم لینے سے پہلے ہی مر گئی، ہے نا؟"

وسنت بولا "راگھپا جی، کچھ بھی ہو جائے، آج نہیں تو کل میں ایک کمپنی ضرور کھولوں گا۔"

"اچھی بات ہے بھیا، ضرور کھولو، پر تمہاری کمپنی کھلتے کھلتے ہم جیسے بڈھے گدھ اس دنیا سے سدھار جائیں گے — خیر۔ اس وقت تمہیں کوئی اور گرو مل جائیں گے۔ آج کل گرو لوگوں کی کیا کمی ہے۔"

"آپ سے کیا کہوں راگھپا جی، اس دن کام بگاڑنے والے آپ ہی ہیں۔ اب آپ الٹا میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس دن اپ پتا بھٹ کے بدلے آپ چلتے: ......"

"چلتا تو مجھے بھی ایک مٹھی جوار کا فائدہ ہو جاتا۔"

"آپ کی ہمارے پتا جی بڑی عزت کرتے ہیں۔ کل آپ کو جس نرم گدے پر بٹھایا تھا اس پر وہ کسی کو بھی نہیں بٹھاتے۔ صرف بہت بڑے یا بہت قریبی لوگوں کو ہی بٹھاتے ہیں۔"

"تمہارے پتا جی تمام باتیں مان سکتے ہیں لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں حصہ دینے کو تیار نہ ہوں گے۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ہر بات کے لیے بھوک یا خواہش کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواہش کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ تم ابھی چھوٹے ہو۔ ابھی یہ بات تمہارے دل کو نہیں لگی ہے۔ کل جب دو ایک بچے ہو جائیں گے اس وقت عاقبت کھلے گی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ باپ

پر انحصار کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی وقت صحیح طور پر اپنا حصہ طلب کرسکو گے۔ سچی ضرورت میں ہی مانگنے پر حصہ مل سکتا ہے۔ بیکار کمپنی کھولنے کے لیے اوپری جوش میں آکر حصہ مانگو گے تو کیسے ملے گا۔"

وسنت راؤ نے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھا کہ اس کے دل میں حصہ مانگنے کی کچھ تڑپ موجود ہے کہ نہیں۔ اُسے راگھپا کی بات صحیح معلوم ہوئی لیکن باپ کا تھپڑ ابھی اُسے بھولا نہیں تھا اس لیے وسنت نے اس معاملہ کو آگے بڑھانا پسند نہ کیا۔ اس نے بات بدل دی، اِدھر اُدھر کی گپیں شروع ہوگئیں، حلوا کھا کر اور چائے پی کر وسنت گھر چلنے کے لیے تیار رہوا۔ اتنے میں اُسے باپ کا دیا ہوا خط یاد آیا۔ خط جیب سے نکال کر راگھپا کو دیتے ہوئے اس نے کہا "یہ چٹھی پتا جی نے آپ کو دی ہے"
"تمہارے پتاجی نے مجھے چٹھی بھیجی ہے؟ وہ کیوں بھیا" کہتے ہوئے اس نے خط کھول کر پڑھا۔ "ارے" کہہ کر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس خط کو پڑھنے لگا اور دل میں کہا "اوہ تو یہ دیسائی میرے قابو میں نہیں آئے گا۔" اس کے بعد اس نے وسنت کو رخصت کیا۔
بعد میں بھی وسنت راؤ راگھپا کے گھر آتا جاتا رہا۔ ہر بار اس کی خوب خاطر تواضع کی جاتی لیکن اُسے اب کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا۔ راگھپا کی باتوں میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔

راگھپا ناٹک کی بات ہی نہ کرتا تھا۔ اب رہی حصہ کی بات! اگر کبھی وسنت اس موضوع کو درمیان میں لاتا تو راگھپا اس سے بچنے کی کوشش کرتا۔ وسنت کو حیرت تھی کہ راگھپا کیوں اس طرح بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے وسنت کے دل میں راگھپا کا احترام کم ہونے لگا۔ کھلانے پلانے میں تو کوئی کمی نہیں کرتا ہے لیکن اس کی باتوں میں وہ پہلے کی سی کشش کیوں نہیں باقی ہے؟ اس کی باتیں کیوں کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں، ایسا کیوں ہے؟ بہت سوچنے کے بعد وسنت راؤ اس نتیجے پر پہونچا کہ شاید راگھپا اس کے باپ سے خوفزدہ ہوگیا ہے۔ یہ سوچ کر باپ کا احترام اس کے دل میں اور بھی بڑھ گیا۔ راگھپا کے اس طرح گریز کرنے کی وجہ سے وسنت راؤ اب حصہ کی بات ماں تک سے نہیں کرتا تھا۔ اس نے گاؤں جانے کی خواہش کا بھی اظہار نہیں کیا۔ سینما کے لیے بھی ماں جو کچھ دے دیتی وہی لے لیتا اور نچلے درجے میں بیٹھ کر بجائے ایک کے اُتنے ہی پیسوں میں دو فلمیں دیکھ لیتا۔ گاؤں میں اس نے تما کو کھانا شروع کر دیا تھا اس لیے چائے پانی کا اس کا خرچ بھی کم ہوگیا تھا۔ اب وہ صرف یا تو گھر میں، یا راگھپا کے یہاں یا پھر دوستوں

میں بیٹھ کر ہی چائے پیتا تھا۔ اکیلے چائے پینے دوکان پر بہت کم جاتا تھا۔

دیسائی جی نے وینکا سے کہہ رکھا تھا "وسنت اب حصہ مانگنے کی بات شاید نہیں کرے گا۔ اگر وہ یہ کہے کہ مجھے حصہ دلاؤ یا میں گاؤں جاؤں گا، تو مجھے بتانا۔ میں اسے ماروں پیٹوں گا نہیں میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ تمہارا اُسے راگھپا کے گھر جانے سے منع کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ منع کروگی تو وہ ہم سے چھپ کر جائے گا۔ اتنے بڑے بچے کی کہاں تک رکھوالی کی جا سکتی ہے۔ میں نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ وہ وہاں جا کر بھی نہ بگڑنے پائے۔ وسنت کے پیٹ کا درد کا علاج میں نے راگھپا کو اجوائن کھلا کر کیا ہے۔ اس کا اثر ابھی دیکھنا ہے۔ اسے راگھپا کے گھر جانے سے منع نہ کرنا البتہ اگر پہلے کی طرح حصہ وغیرہ کے سلسلہ میں جھگڑا کرے تو مجھے بتا دینا۔"

پندرہ دن گزر جانے پر بھی جب وسنت کی کسی بات کی ان کو اطلاع نہ پہونچی تو دیسائی جی سمجھ گئے کہ ان کے نسخے نے اثر کرنا شروع کر دیا ہے۔

حقیقت میں دوا کا اثر ہوا تھا لیکن درد دوسری طرف سے ظاہر ہونے لگا۔ راگھپا نے وسنت سے چھوٹے موٹے فائدے حاصل کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور اب یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ وسنت جب شہر میں رہنے لگا تھا تو اناج بیچتا ہی کون؟ اس کے بجائے اس نے وسنت کو ہی قبضہ میں کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چائے ناشتے اور خاطر تواضع کا انتظام حسب معمول رہا اور اس نے کسی قسم کی کمی وسنت کی خاطر مدارت میں نہیں آنے دی۔ ایک دو بار وہ وسنت کے ساتھ سینما بھی گیا۔ ہر بار چائے لانے کا کام شانتا ہی کے سپرد تھا۔ راگھپا چائے پیتے وقت شانتا کے چائے بنانے کی تعریف کرتا۔ ایک دن اچھا موقع دیکھ کر راگھپا نے ایک پھلجھڑی اور چھوڑی۔

"وسنت ہماری شانتا اب سیانی ہوگئی ہے۔ اس کی شادی کے بارے میں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ ابھی حال ہی میں اسے ایک لڑکا دکھایا ہے۔ لڑکے نے تو شانتا کو پسند کر لیا ہے۔ مجھے لڑکا پسند ہے لیکن عجیب بات ہے کہ شانتا اسے پسند نہیں کرتی۔ دیکھو، ہماری بڑی لڑکی رتنا بغیر چون وچرا کے ہمارے پسند کیے ہوئے لڑکے سے شادی کرنے کو تیار ہوگئی تھی۔ رتنا کو حالانکہ میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ تمہیں ساس کے گھر تکلیف ہوگی۔ تمہاری ساس ڈنک مارتی ہے۔ تمہیں اذیت دے گی، تمہیں یہ سب برداشت کرنا ہوگا لیکن لڑکا ہمیں پسند ہے۔ تمہاری کیا مرضی ہے؟

یہ بھی پوچھا تھا۔ اس کا اس نے کیا جواب دیا، تمہیں معلوم ہے' اس نے کہا" میری شادی کرنے والے آپ ہیں تو پھر مجھے اس میں کیا سوچ بچار ہو سکتا ہے — شانتا بھی ہماری ہی بیٹی ہے۔ رتنا اور شانتا میں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سال کا فرق ہے لیکن شانتا آج کل کی وطن پرستی کی تحریکوں کی رہنما رہ چکی ہے۔ کہتی ہے مجھے کھادی پہننے والا لڑکا چاہیے۔ سرکاری نوکر نہیں چاہیے وہ لڑکا میں نے سرکاری نوکر دیکھ کر ہی چنا تھا لیکن شانتا نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن میں اسے غلط نہیں سمجھتا۔ رتنا کا طرز عمل بھی ٹھیک تھا شانتا کا طرزِ عمل بھی ٹھیک ہے۔ اصل میں زمانے کے ساتھ ساتھ خیالات بھی بدلتے ہیں۔ آج کے زمانے میں وطن پرستی کی بھی ضرورت ہے!۔ تمہاری کیا رائے ہے وسنت ؟"

"جی ہاں، ہے تو" کہہ کر وسنت راؤ نے دل میں سوچا کہ وہ کل ہی سے گاندھی ٹوپی پہننا شروع کر دے گا۔

"میں نے تم سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ تمہارے بہت سے دوست ہیں۔ کوئی اچھے گھرانے کا ایسا لڑکا جس کے تھوڑی بہت جائداد ہو اور وطن پرستانہ خیالات رکھتا ہو، اگر تمہاری نظر میں ہو تو بتانا۔ میں نے بھی ویسے ایک لڑکا دیکھ رکھا ہے۔ وہ بھی اچھا ہے۔ چار جوڑی ہل کی کھیتی ہے۔ صرافے کی دوکان بھی ہے۔ لیکن بردکشنا کافی دینی ہوگی خیر، اس سے بھی میں نہیں گھبراتا چاہے جتنی بردکشنا مانگنے والا لڑکا کیوں نہ ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ شانتا کو دیکھتے ہی سب بھول جائے گا بہرحال، اس کی شادی ہو جائے تو ہماری فکر کم ہو اس لیے تمہاری جان پہچان کا کوئی اچھا لڑکا ہو تو مجھے بتانا۔ میرا شاگرد ہونے کے ناتے اگر میری اتنی سی خدمت کر دو گے تو کوئی بڑی بات نہیں ؟ بھگوان تمہارا بھلا کر کے جلد ہی تمہاری شادی بھی کرا دے گا"— اتنا کہہ کر راگھپا زور سے ہنس پڑا۔

اس کے ایک ہفتہ کے بعد ہی وسنت نے گاندھی ٹوپی اور نہرو جیکٹ پہننا شروع کر دیا۔ اُسے اس حلیے میں دیکھ کر دینو بائی کو خیال ہوا کہ شاید یہ بھی اپنے بڑے بھائی کی اچھوت کی راہ پر چلنے لگا ہے — راگھپا کو اس سے بہت خوشی ہوئی، اس نے دل ہی دل میں کہا" ویسائی تم میری زد سے باہر نہیں ہو۔ میں تمہیں کچل کر رکھ دوں گا"

32

نجات

شالگ رام کی پوجا سے گھر میں جو سکون پیدا ہوا تھا وہ زیادہ دن تک نہ رہا۔ گھر میں پھر سے لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ گنگوا نے بہت دن تک دینکا سے ان باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ وہ یہ سوچ کر تمام باتیں برداشت کرتی رہی کہ ایسی باتیں سبھی جانتے ہیں۔ لیکن وینکا بے چاری اس کے ساتھ کیا ہمدردی کرتی۔ وہ یہ جانتی تھی۔ پھر ایک ہی راگ سنتے سنتے آدمی اکتا بھی جاتا ہے۔ معلوم نہیں کب اور کس وقت وینکا اس کی باتوں سے اکتا جائے۔ گنگوا یہی سوچ کر چپ رہتی اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ دیسائی جی نے درمیان میں پڑ کر یہ شادی کرائی تھی اور اس معاملے میں بار بار شکایت کرنے کا مطلب ان پر ہی گویا الزام لگانا ہوتا۔ گنگوا ڈرتی تھی کہ اس طرح انہیں کوئی افسوس نہ ہو۔ اُدھر وینکا کو بھی معلوم تھا کہ سب کے چولہے مٹی کے ہی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ گنگوا کے گھریلو معاملات میں بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی اور خاموش رہتی تھی۔ کبھی کبھار اتنا ضرور پوچھ لیتی ”گھر میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟“ گنگوا یہ سمجھ کر کہ سب کی خیریت معلوم کر رہی ہیں کہہ دیتی ”ٹھیک ہے......کل کٹی کو ذرا زکام ہو گیا تھا“ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ گھر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بتا دینا کتنا مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ گنگوا جب اسے اپنے دکھ سکھ بتاتی تو وینکا کو اپنے ہی دکھ اُس سے زیادہ معلوم ہوتے۔ وہ زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ ایک طرف اسے فاقہ کشی، جلا وطنی اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے والے اچھوت کا غم تھا دوسری طرف اپنا حصہ طلب کرنے والا، تاش اور سینما کا رسیا وسنت تھا۔ وہ جتنا سوچتی اتنا ہی زیادہ اُسے محسوس ہوتا کہ امیر لوگوں کو جو دکھ ہوتے ہیں وہ تمام کے تمام اکیلے اس کے حصے میں آ گئے ہیں۔ اس طرح گنگوا اور دینکا میں گویا ایک خاموش سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے سے زیادہ نہیں کہیں گی۔

ان دنوں گنگوا کو جو واقعات پیش آئے وہ اس کی قوت برداشت سے باہر تھے۔ شالگ رام کی مہربانی سے گھر میں جو سکون پیدا ہوا تھا وہ کٹی کے دیسائی جی سے بر دکشنا کا

روپیہ طلب کرنے پر نامراد اور رسوا ہو کر لوٹنے کے بعد قایم نہ رہ سکا۔ وینکا کی زبانی یہ معلوم ہو کر کہ دیسائی جی نے گنگوا کی کتنی زوردار حمایت کی تھی اُسے یک گونہ تسلی ہوئی لیکن اس نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ کٹی دیسائی جی کا غصہ اس پر اتارے گا۔ راگھیا اور کٹی کی کارستانی سے دیسائی جی کو جو نقصان پہونچا تھا وہ انھوں نے اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ وسنت کے ہاتھوں راگھیا کو اناج فروخت کیے جانے کی بات وینکا کو معلوم تھی لیکن گنگوا کے سامنے اس کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ وینکا سوچتی تھی کہ شادی ہم نے کرائی ہے اس لیے ہم کو ہی بھگتنا پڑے گا۔ گنگوا ہمیشہ کی طرح بے تکلف ہو کر دیسائی جی کے یہاں آتی جاتی رہی۔ شانک رام کے واقعہ کے بعد پندرہ بیس دن تک کٹی پابندی سے ماں کی مزاج پرسی کرتا رہا۔ اس کی اس حرکت سے جل کر زنتا اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ کچھ دن بعد بردکشنا والا معاملہ پیش آ گیا۔ اس کا غصہ اتارنے کے لیے کٹی نے ماں کی توہین کرنا شروع کر دی۔ ایک آدھ بار تو آپے سے باہر ہو کر وہ اس پر چیخا چلایا بھی۔

راگھیا کی حرکتوں سے دیسائی جی کو نقصان پہونچانے میں مدد دے کر کٹی کو کوئی ذاتی خوشی حاصل نہ ہوئی۔ وہ تو دنیا کی ریت سمجھ کر اس کام کے لیے تیار ہوا تھا لیکن اس کا ضمیر اسے بری طرح ملامت کر رہا تھا۔ اس کا قرض ادا نہیں ہوا تھا۔ سود کی ادائیگی سے وہ چھٹکارا نہ پا سکا تھا ایک دن گنگوا جب بھگوان کے سامنے پوتھی کھولے بیٹھی تھی تو کٹی غصہ میں جلا بھنا آیا اور اس کے سامنے دس روپیہ کی ریزگاری ڈالتے ہوئے نہایت غصہ میں بولا "تمہاری جان کو رو کر یہ بیاج بھر رہا ہوں۔"

گنگوا اداس ہو کر بولی "تم یہ عورتوں جیسی باتیں چھوڑ دو۔ ان تین چار سال میں سود کے علاوہ اصل کا سود اور سو روپیہ بھی کیا تم نہیں ادا کر سکتے تھے۔ اتنا ادا کر کے اگر تم مجھ سے کہتے کہ ماں میں نے اتنا قرض ادا کر دیا ہے اتنا باقی ہے اور مجھ سے اگر روپیہ مانگتے تو کیا میں منع کر دیتی۔ کمائی پوری نہیں پڑتی کہہ کر روتے ہو۔ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں تھا لیکن کیا میں نے گھر نہیں چلایا؟ پوچھو چار آدمیوں سے لڑائی کے زمانے میں جب روپیہ کی ایک سیر جوار تھی تب بھی میں نے تمہیں پیٹ بھر کر کھلایا، تمہیں اسکول بھی بھیجا ـــــ تم تنخواہ پاتے ہو پھر بھی تمھارا پورا نہیں پڑتا۔ کون سا ایسا بوجھ تم پر آن پڑا ہے جسے تم سنبھال نہیں سکتے۔ وہ اکیلی ہی تو ہے"۔۔۔۔

گنگوا کی باتوں کے دو دو مطلب نکالنے والی زنتا اور کٹی کو یہ باتیں بہت ناگوار معلوم ہوئیں خصوصاً اُس کا آخری جملہ تو نشتر کی طرح دل کے پار ہو گیا۔ کٹی نے یہی سمجھا کہ ماں نے اس کی دل آزاری

کے لیے یہ بات کہی ہے۔ اس کے لاولد ہونے پر طنز کیا ہے۔ اس لیے اس نے بھی گنگوا کو دکھ پہنچانے کے لیے کہا " تمھارا سب کا پیٹ بھرنے میں ہی اڑجاتا ہے۔"

گنگوا گرج کر بولی " چھوڑو میرے پیٹ بھرنے کی بات۔ مجھے تیرا کھانا نہیں چاہیے۔ آج سے تم اپنی نوکری چھوڑ دو۔ میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو بٹھا کر کھلا سکتی ہوں" گنگوا کو اتنی سی بات کہنے کے لیے بڑا زور لگانا پڑا۔ اس کا دل چاہا وہ کہہ دے " میرے لتے باہر پھینک دے، میں تیرے گھر میں نہیں رہوں گی، گانا پور چلی جاؤں گی" لیکن اس نے اپنے دل پر جبر کر لیا اور خاموش رہی۔ اُسے اپنا عہد یاد آیا" کچھ بھی ہو جائے، یہ گھر نہیں چھوڑنا ہے"۔

اس دن گنگوا نے کھانا نہیں کھایا۔ کٹی بھی غصے میں دفتر چلا گیا۔ شام تک گنگوا نے کھانا نہیں کھایا۔ رتنا نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ ان کے روز روز کے جھگڑے دیکھ کر سارا محلہ دنگ تھا۔ جب کٹی شام کو گھر واپس آیا تو اس نے ماں کو بھگوان کی تصویر کے سامنے چٹائی بچھائے لیٹے دیکھا۔ اس کی بیوی بولی " انھوں نے کھانا نہیں کھایا ہے اس لیے میں نے بھی نہیں کھایا ہے۔ کیا مجھے برت رکھنا نہیں آتا؟" کٹی گھبرا کر ماں کے پاس گیا لیکن رتنا ساس کی باتیں نہیں بھولی تھی۔ روز اپنی کی کھٹ پٹ سے رتنا کے دل سے گنگوا کا رہا سہا رعب بھی جاتا رہا تھا۔ رتنا کے دل میں اس کی نفرت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ سوچتی میرے شوہر کو اس نے پالا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں ہمیشہ اس سے ڈرتی رہوں۔ اتنا دکھ اٹھا کر جس ساس نے انہیں پالا ہے آج وہ ایسی باتیں کیوں کرتی ہے جس سے ان کی عزت گھٹتی ہے۔ میرے اولاد نہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس کے لیے بھی مجھے ہی طعنے دیتی ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن سے رتنا اور بھی زور سے ساس کی مخالفت کرنے لگی۔ گھر میں کٹی کی جیب میں رکھے ہوئے پیسے غایب ہونے لگے۔ کٹی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس سے پوچھے اور کس سے کہے۔ پاس پڑوسیوں کے ساتھ رتنا کھل کر گھر کی تمام باتیں کرتی۔ اس نے یہ بات بھی مشہور کر دی کہ ساس نے ٹونے ٹوٹکے کرا کر اس کی کوکھ باندھ دی ہے۔ پڑوسیوں کو یہ باتیں سن کر بڑا مزا آتا تھا۔ وہ رتنا کو دوپہر میں بلا کر اس سے ہمدردی جتا کر یہ باتیں سنتے۔ گنگوا کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے کٹی کی موجودگی میں رتنا کو سامنے بٹھا کر پوچھا۔ کس سیانے سے میں نے ٹوٹکا کرایا تھا۔ کٹی دونوں میں سے کسی کو بھی کچھ سمجھا نہ سکا۔ رتنا نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے یہ بات نہیں کہی۔ اس پر گواہ کی ضرورت پڑی۔ گنگوا اپنی گواہی کے لیے کاشی کی ماں کو بلا لائی۔ کاشی کی ماں نے اس ڈرامے کو مزے سے دیکھا اور کسی کی حمایت

لیے بغیر ہی دوسروں کو سارا تماشا سنانے کے لیے چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔ اب تک رتنا شوہر کے حکم کی تعمیل میں اپنی غلطی نہ ہونے پر بھی رفع شر کے لیے "غلطی ہو گئی" کہہ دیا کرتی تھی لیکن آج اس نے یہ بات کہنے سے صاف انکار کر دیا۔

ایک دن کٹی ڈھائی سیر گڑ گھر کے لیے لایا۔ شام تک اس میں سے ایک بڑا ٹکڑا غائب ہو گیا بہو کا دعویٰ تھا کہ ساس گھر کا سامان کسی کے ہاتھ فروخت کر دیتی ہے۔ ساس کا کہنا تھا کہ بہو تھیلے میں چھپا چھپا کر تمام سامان اپنے باپ کے گھر پہونچا دیتی ہے۔ جب کچھ دیر اس طرح ایک دوسر پر الزام تراشی ہولی تو رتنا نے آہستہ سے شوہر کے کان میں یہ شبہ ظاہر کیا کہ ساس کے تہہ کیے ہوئے کپڑوں کے بنڈل کے نیچے کچھ ابھرا ابھرا سا دکھائی دے رہا ہے۔ اٹھا کر دیکھا تو واقعی کپڑوں کے نیچے ایک بڑا سا گڑ کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا، گنگوا بولی "مجھے بدنام کرنے کے لیے بہو نے یہ حرکت کی ہے۔" اس پر رتنا بولی "بانجھ ہو کر میں کپڑے کیوں چھونے جاؤں گی، مجھے تو پہلے ہی اچھوت بنا رکھا ہے۔" گنگوا بولی "اگر چھوا چھوت کا اتنا خیال ہوتا تو پھر ایسا کیوں کرتی؟" یہ سن کر رتنا چیخ پڑی "آپ تو چھوا چھوت کا بہت دھیان رکھتی ہیں لیکن رات آپ نے باسی "ٹِک کری" کیسے کھا لی۔"

اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جھوٹ بولا جا سکتا ہے لیکن رتنا کی آخری بات ناقابل برداشت تھی۔ گنگوا اس جھوٹے الزام کو سن کر تڑپ گئی۔ اس نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن کھانا چھوڑ کر بیٹھ گئی۔ کٹی نے پہلے تو رتنا سے معذرت کرانے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب بات صحیح ثابت ہوئی ہے تو میں کیوں معافی مانگوں۔ جب بیوی پر بس نہیں چلا تو کٹی نے ماں کو منانے کی کوشش کی۔ اس نے ماں کو کھانا کھانے کا "نوٹس" سا دے دیا۔ بیوی سے تو اس نے پیار سے باتیں کی تھیں لیکن ماں پر حکم چلا رہا تھا۔ گنگوا بھلا یہ بات کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ بولی "مجھ پر حکم چلانے والا تو ہوتا کون ہے۔ بہت دن ہو گئے خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتے کرتے۔ اب میں چپ نہیں رہ سکتی۔ گو بنا سے پوچھتی ہوں اب کیا کرنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ سیدھی دیبانی جی کے گھر پہونچی۔ اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔

"گو بنا تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اگر آج میں کٹی کا ساتھ چھوڑ دوں تو رانگھیا اسے رتچھ بنا کر نچائے گا۔ اسی وجہ سے میں اب تک اس کے ساتھ رہی۔ اس کے ٹھکرانے پر بھی گھر کی دہلیز نہیں چھوڑی۔ تم ہی بتاؤ اب مجھے زندہ رہ کر کیا کرنا ہے۔ بیٹے کو بڑا کیا، شادی کر دی، پوتے

پوتیوں کو دیکھنے کی آرزو تھی۔۔۔۔۔ لیکن بھگوان کو منظور نہیں تھا۔ خیر، اس بات کو چھوڑو۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے جیسے مجھے کاشی لے گئے تھے ویسے ہی ایک بار بدری ناتھ لے چلنا بھیا، بھگوان کے درشن کروں گی۔ گنگا مائی وہیں بہتی ہے۔ وہیں کسی پہاڑ سے اس میں کود کر اس ناری جنم سے چھٹکارا پا جاؤں گی۔ اب اس زندگی سے میرا دل بھر گیا ہے۔" یہ کہہ کر گنگوا رونے لگی۔

گنگوا کو یہ معلوم تھا کہ کٹی اب دیسائی جی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا ہے۔ دیسائی جی کے بلانے پر اگر نہ آیا تو ان کی کیا عزت رہ جائے گی اس لیے اس نے اپنے دل پر قابو پا لیا۔ گزشتہ دو سال کے تجربات اور اس آخری واقعہ کو تفصیل سے بیان کر کے وہ بولی: "اتنے دن سے سب باتیں چھپائے تھی۔ آج تمہیں بتانے کو جی چاہا تو کہہ دیا۔ تم کچھ خیال نہ کرنا بھیا۔ اس کے علاوہ میرا ہے بھی اور کون؟ میں واپس جا رہی ہوں۔ چاہے بھوکا رکھے یا بن باس کر دے، میں گھر ہی جا رہی ہوں۔" لیکن دیسائی جی نے اسے جانے نہ دیا۔ وہ بولے: "گنگوا تم ڈرو نہیں۔ یہیں نہا لو اور تھوڑا سا کچھ کھا لو۔ میں ایسا بندوبست کرتا ہوں کہ کل تمہارا بیٹا اور بہو تمہارے پاؤں پر پڑ کر تمہیں گھر لے جائیں گے۔"

گنگوا کو یقین نہ آیا۔ اس نے سوچا آج میں یہاں رہ جاؤں لیکن اس بات کا کیا بھروسہ کہ بیٹا کل آ کر لے ہی جائے گا۔ اگر وہ نہ آیا اور کل مجھے خود ہی وہاں جانا پڑا تو اور بھی بے عزتی ہوگی" یہ سوچ کر وہ دیسائی جی سے بولی "رہنے دو بھیا، استری جنم ہے، بھوگوں گی" دیسائی جی نے اسے جانے نہ دیا۔ اصرار کر کے روک لیا۔ شام کو وسنت کے ذریعہ راگھیا کو یہ پیغام بھیجا۔ "گنگوا ہمارے گھر ہے۔ کل صبح بہو اور بیٹا آ کر اسے گھر لوا لے جائیں"۔ دیسائی جی کا نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ اگلے دن بہو بیٹا دونوں آئے اور گنگوا سے معافی مانگی۔ گنگوا کی سمجھ میں یہ راز نہ آیا۔ بہو کو اپنے پاؤں پڑتے دیکھ کر وہ اور بھی حیران ہوئی۔ اتنے میں دیسائی جی ہنستے ہوئے بولے: "اب غصہ تھوک دو۔ تم نے چائے پی لی یا نہیں۔ اب سب کو خوش ہونا چاہیے کیونکہ ایک خوش خبری سنا رہا ہوں۔"

کٹی کی طرف متوجہ ہو کر ہنستے ہوئے انھوں نے پوچھا "کرشنا، تمہارے ماما نے تم کو یہاں آ کر ماں کو گھر لے جانے کے لیے کیا بہت اصرار کیا ہے؟"

کٹی اس گومگو ہی میں تھا کہ ہاں کہے یا نہیں کہ اتنے میں دیسائی جی نے ایک اور قہقہہ لگایا اور بولے "اب تمہیں اپنے ماما کو سلام کرنے یا اس کی خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب

اس کے لیے تمہاری حیثیت محض داماد کی ہے۔ اب اس نے تمہیں متبنیٰ کرنے کا ارادہ ترک کردیا ہے لہٰذا اب کیوں اس کی خوشامد کی جائے۔"

گنگوا اور رتنا کے منھ سے ایک ساتھ نکلا "کیا کہا؟"

دیباجی پھر ہنس پڑے۔

گنگوا نے پوچھا "مذاق کر رہے ہو کیا؟"

وہ بولے "مجھے مذاق کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ راگھپا خود ہی پندرہ بیس دن پہلے آکر کہہ گیا تھا۔"

"تو کس کو گود لے گا" گنگوا نے پوچھا۔

"متبنیٰ کرنے پر سے راگھپا کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ پُراسرار طور پر خاموش ہو گئے۔۔۔۔ پھر کچھ رُک کر انھوں نے بتایا "جب اپنا ہی بیٹا ہونے والا ہو تو متبنیٰ کرنے کی کیا ضرورت ہے راگھپا نے یہ خود کہا ہے"۔۔ اتنے میں دبنو بائی کی آواز آئی "چمپکا بائی کو تین پورے ہو کر چوتھا مہینہ لگا ہے۔"

رتنا کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں گذشتہ تین چار مہینے میں ہر ہفتہ میں دو تین بار میکے جاتی رہی ہوں لیکن کسی نے بھی مجھ سے کوئی ذکر نہ کیا۔ کیا شانتا کو بھی معلوم نہیں ہے۔

جسمانی کمزوری کی وجہ سے حاملہ ہونے کے باوجود چمپکا میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔ شانتا کو یہ بات معلوم تھی لیکن چمپکا نے شانتا سے یہ کہہ دیا تھا کہ رتنا کو نہ بتائے ورنہ وہ رنجیدہ ہو جائے گی۔ اس لیے شانتا نے بھی اس سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ تقدیر اس کے ساتھ ایسا مذاق کرے گی۔ راگھپا کے یہاں اس عمر میں اولاد ہونا ویسے بھی ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ ناممکن ہی نہیں مضحکہ خیز بھی۔ لیکن اب رتنا کی قیمت ایک دم سے گھٹ گئی تھی۔ سماجی اور اقتصادی دونوں حیثیت سے ۔۔ باپ کے طرزِ عمل سے اُسے بہت دکھ ہوا ۔۔ یہ اس کے لیے ایک بڑا ہی تلخ تجربہ تھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا "بھگوان ہی رحم کریں"۔۔ اگر یہی حمل بھگوان نے اُسے دیا ہوتا۔۔۔۔ یہ سوچ کر اس کے دل میں حسد پیدا ہوا۔ اس احمقانہ جذبے پر اُسے اپنے اوپر غصہ بھی آیا۔

کٹی کو اس بات پر کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ ہنسی بھی۔ اس نے متبنیٰ والی بات کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی تھی وہ تو لڑکی پر ریجھا تھا۔ لیکن اس کی طرف سے جو جائداد اُسے ملنے والی تھی اور

جس کی وجہ سے اس نے اپنی بیوی پر محبت کے جو کچھ زیادہ ہی پھول چڑھا دیے تھے وہ آج نیچے گر گئے تھے...... راگھپا کی بات سن کر وہ ہنسا بھی۔

گنگوا کو واقعی بہت دکھ ہوا۔ لیکن اس پر لطف محفل میں وہ بھی کڑوی کسیلی بات نہ کہہ سکتی تھی — بہرحال بظاہر خوش لیکن اندر سے غمزدہ، یہ چھوٹا سا کنبہ، اس پُر لطف موضوع پر کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا اپنے گھر روانہ ہوا۔

اگلے دن رتنا پھر میکے گئی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ جھگڑا کس بات پر شروع کرے۔ اس کو رنج تھا تو بس اس بات کا کہ اُسے آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا تھا۔ اگر ان اوچھی باتوں کو بنیاد بنا کر جھگڑا کھڑا کیا جائے تو سمجھ دار لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اور مقصد کار فرما ہے۔

بہرحال رتنا بہت غصہ میں بھری ہوئی تھی۔ گھر پہونچتے ہی وہ برس پڑی "مجھے یہ بات کیوں نہیں بتائی گئی۔ اگر بتا دیتے تو کیا میں چھین لیتی۔ اپنے گھر کی بات مجھے دوسروں سے معلوم ہو۔ کیا یہ بڑے فخر کی بات ہے۔ کیا میں اس گھر کی نہیں ہوں..... ماں باپ نے کیا مجھے دور کر دیا ہے کیا مجھ سے اپنا پنڈ چھڑانے کے لیے ہی میری شادی کی تھی۔ میری بہن نے بھی مجھے دھوکے میں رکھا ؟ ساس کے گھر میں دکھ جھیلتی تھی لیکن اب تک میکے کا سہارا تھا ؟ کیا ہم میکے کی دولت کے سہارے جی رہے ہیں کیا بھائی کی پیدائش سے مجھے خوشی نہیں ہوگی۔ کیا میں لڈو بانٹنے میں شریک نہیں ہوں گی" ہر بات کے ساتھ اس کی آواز تیز ہوتی جاتی تھی۔ اس کو طیش میں دیکھ کر راگھپا بھی اُسے تسلی نہ دے سکا۔ رتنا چیخ چلا کر، چائے کا پیالہ لڑھکا کر اور یہ عہد کر کے کہ دوبارہ اس گھر میں پاؤں نہ رکھے گی، وہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ ان لوگوں کو بھی اس نے قسم دلائی کہ اگر لڑکی پیدا ہو تب بھی اس کے شوہر کو متنبی نہ کیا جائے، اگر کیا گیا تو میرے بدن کے ٹکڑے کر کے کھانے کے برابر ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے وہاں سے چلدی اور گھر آگئی۔

ایسا نہیں ہے کہ اس دن سے کٹی کے جھگڑے ختم ہو گئے۔ لیکن رتنا کا میکے کا گھمنڈ ٹوٹ چکا تھا اور سسرال کو ہی اپنا گھر سمجھنے اور اس پر فخر کرنے کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہونے لگا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ شوہر کے سوا میرا اور کوئی نہیں ہے۔ شوہر پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔ ماں باپ اپنے نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گنگوا کو بھی اُس نے

گھر کا ایک ناگزیر حصہ تسلیم کر لیا۔

33

اچھوت کا دوسرا خط

اچھوت کا دوسرا خط آتے آتے ایک مہینہ گزر گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وینکٹ رائے سے اس کی کہانی اگلوانا ایک مشکل کام تھا۔ اس مشکل کو آسان بنانے میں اچھوت کو تقریباً پندرہ بیس دن لگ گئے۔ باہر سے رکھ رکھاؤ دکھائی دینے پر بھی وینکٹ رائے بہت شکّی اور ضدی تھا۔ اس میں تھوڑا سا کمینہ پن بھی تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جب اچھوت اس سے کوئی لمبا سوال کرتا تو وہ جواب دیتا "ہمیں اس طرح تنگ نہ کیجیے۔ نہ کیجیے۔ نہ کیجیے" کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی بات زور سے کہنے کے بعد ہاتھ گھما گھما کر کہنے لگتا "یہ تو جھوٹ ہے، جھوٹ ہے" کئی بار وہ اچھوت کو یہ کہہ کر چھیڑتا "کیوں دیسائی جی، دیسائیوں والا کاروبار کر رہے ہو"۔ بہر حال اچھوت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اس نے وینکٹ رائے کو یہ لالچ دیا کہ "میرے پتا جی تمہارا حصہ تمہیں دلا دیں گے" اس طرح اور کچھ دوسرے طریقے اختیار کر کے اچھوت مختلف اوقات میں تھوڑی تھوڑی معلومات اس سے حاصل کر کے نوٹ کرتا رہتا تھا۔ ایک مہینہ میں جس قدر تفصیلات اُسے حاصل ہوئیں انہیں ترتیب دے کر دیسائی جی کو خط میں لکھ کر بھیج دیا۔

از بمبئی

محترم والد صاحب کی خدمت میں آداب۔ آپ کا خط ملا جس سے شری وینکٹ رائے کے جعل سازی کے معاملے میں ماخوذ ہو جانے کا حال معلوم ہوا میں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے یہ کہہ کر گھبرا دیا "تم نے جعلی دستخط بنائے تھے نا؟ وہ بہت سچا آدمی ہے بھگوان اور ماں باپ کی قسم کھا کر کہنے لگا "میں نے ایسا نہیں کیا" —— وقتاً فوقتاً جو تفصیلات اس سے معلوم ہوئی ہیں انہیں ذیل میں درج کر رہا ہوں۔ یہ تفصیلات نامکمل ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جو باتیں مذکور کی جا رہی ہیں ان میں سے اکثر ٹھیک ہیں۔

پندرہ بیس سال پہلے وینکٹ رائے، پونا میں سیٹھ تخت مل بیوپاری کے وہاں ملازم

تھا سیٹھ کے گھر میں جتنے ملازم تھے ان میں وینکٹ رائے ہی جنوبی ہند کا برہمن تھا اور اس وجہ سے سیٹھ کو اس پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ سیٹھ نے اپنے گھر کے پچھواڑے اس کو رہنے کے لیے ایک کمرہ بھی دے رکھا تھا۔ یہ تو آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ دیوانہ ہونے کے باوجود وینکٹ رائے نہایت ایماندار شخص ہے۔ ایماندار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ضرورت پڑنے پر ہوشیار بھی بن سکتا ہے۔ سیٹھ کے گھر میں پوجا پاٹ وینکٹ رائے ہی کرتا تھا۔ شرادھ وغیرہ کی انجام دہی بھی اُسی کے سپرد تھی۔ سیٹھانی وینکٹ رائے کے طرزِ عمل سے اتنی متاثر تھیں کہ اسے بھگوان کا اوتار تسلیم کرتی تھیں۔ وہ اس کی خوب خاطر تواضع کرتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں۔ بعد میں اس پر مزید اعتماد ہو جانے کے سبب سیٹھ نے بنک سے پیسہ لانے لے جانے کا کام بھی وینکٹ رائے کو ہی سونپ دیا تھا۔ بنک میں یہ قاتلوں جیسی آنکھوں اور ٹوٹی پھوٹی مراٹھی اور ہندی بولنے والا بے باک دیوانہ سا شخص بہت جلد بڑا مقبول ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ کام سے بنک جاتا تھا تو وہاں کے کلرک اُسے چھیڑتے تھے "کیوں، آج سیٹھانی نے کیا کھلایا، کچوری یا لڈو؟" یہ ان کو جواب دیتا "کھایا میں نے ہے، تمھارے پیٹ میں کیوں درد ہو رہا ہے؟"

ایک دن چیک بھنانے کے لیے لائن میں کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں سیٹھ کے ڈرائیور نعظیم الدین نے تیزی سے موٹر لا کر بنک کے سامنے کھڑی کی اور وینکٹ رائے کو اپنے پاس بلا کر دو ہزار روپیہ کا چیک اسے دیتے ہوئے کہا "سیٹھ جی نے موٹر کے پرانے پرزے بدلوانے کے لیے یہ چیک دیا ہے لیکن میرے پاس چیک کیش کرانے کے لیے وقت نہیں ہے۔ مجھے لائن کے آخر میں سب سے پیچھے کھڑا ہونا پڑے گا تم نے تو نمبر لگا ہی رکھا ہے۔ یہ چیک بھی کیش کرا لینا اور روپیہ مجھے دے دینا۔" وینکٹ رائے اس چیک کو لے کر پھر سے لائن میں اپنی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا اس وقت اس سے اگلا آدمی کسی بات پر بنک کے کلرک سے جھگڑا کر رہا تھا۔ وینکٹ رائے کی باری آنے میں ابھی دیر تھی۔ تعظیم الدین کو جلدی تھی۔ وہ موٹر سے اتر کر آیا اور وینکٹ رائے کے کان میں چپکے سے کہا "تم یہ چیک کیش کروا کر یہیں میرا انتظار کرنا۔ میں سیٹھ جی کو دوکان پہونچا کر ابھی پندرہ بیس منٹ میں آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

وینکٹ رائے کو کسی دقت کے بغیر پیسے مل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی سے جھگڑا ہو جانے کی گرمی میں بنک کلرک نے اس جانے پہچانے وینکٹ رائے کے چیک کی اچھی طرح جانچ کیے بغیر ہی اسے پاس کر دیا۔ تین چار منٹ بعد دوسری کھڑکی سے وینکٹ رائے کو

پیسے مل گئے۔ دو ہزار روپیہ لے کر وہ بنک کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تعظیم الدین کا انتظار کرنے لگا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد بھی تعظیم الدین نہ آیا تو وینکٹ رائے کو تشویش ہوئی۔ وہ ڈرا کہ کہیں اس طرح روپیہ لے کر باہر بیٹھے دیکھ کر کوئی اس سے روپیہ چھین نہ لے جائے اس لیے مزید انتظار کیے بغیر وہ گھر واپس چلا آیا۔ اس نے وہ روپیہ اپنے ٹرنک میں حفاظت سے رکھ دیا اور اپنے بھائی راگھپا کو تاکید کر کے کہ ٹرنک کا دھیان رکھے اور اسے چھوڑ کر کہیں اور نہ جائے وہ اپنے کام پر چل دیا۔ راگھپا ان دنوں نوکری کی تلاش میں پونا آیا ہوا تھا۔

سیٹھ کے بڑے لڑکے بابو بھائی نے وینکٹ راؤ کو دیکھ کر اُسے اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں پہونچتے ہی وینکٹ رائے سے پوچھا "تعظیم الدین تم سے ملا تھا" وینکٹ رائے کے دل میں شک پیدا ہوا لیکن اس نے "ہاں" کہہ دیا۔ بابو بھائی نے مزید پوچھا: "اس نے تمہیں چیک دیا تھا" وینکٹ رائے نے پھر کہا "جی ہاں" بابو بھائی نے تیسرا سوال کیا "تم نے چیک بھنا کر روپیہ تعظیم الدین کو دے دیا" وینکٹ رائے نے مجبوراً جھوٹ بول دیا "جی ہاں"۔ جھوٹ بولنا وینکٹ رائے کے نزدیک بچھو کے کاٹنے کے برابر تھا لیکن اگر وہ سچ بول دیتا تو کیا بابو بھائی اسے چھوڑ دیتا۔ وہ روپیہ لے کر ہی اس کا پیچھا چھوڑتا اس نے یہ جھوٹ اس لیے بولا تھا کہ — تعظیم الدین کے سامنے اسے جھوٹا نہ بننا پڑے۔ اس قسم کی چالاکی وینکٹ رائے میں ہے۔ سارا دن گزر گیا لیکن تعظیم الدین اُدھر نہ آیا۔ سیٹھ جی شام کی گاڑی سے بمبئی چلے گئے۔ دوسرے دن صبح ہی صبح جب وینکٹ رائے سیٹھ کے گھر پوجا پر بیٹھ گیا تو راگھپا نے اُسے آکر بتایا کہ تعظیم الدین آیا ہے اور اسی وقت پیسہ مانگ رہا ہے۔ نہا دھو کر پوجا کے لیے بیٹھ جانے کے بعد وینکٹ رائے کے لیے اس وقت اٹھ کر ٹرنک چھونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے جنیو سے چابی نکالی اور راگھپا کو دے دی۔ راگھپا سے پیسہ لے کر جو تعظیم الدین گیا تو پھر کبھی نہ لوٹا۔ اگلے دس پندرہ دن میں حساب کتاب میں فرق نکلنے پر ممکن ہے کچھ شبہ ہونے پر سیٹھ نے پولیس میں رپورٹ لکھائی۔ دس بارہ دن بعد پولیس وینکٹ رائے کو پکڑ کر ہتھکڑی لگا کر لے گئی اس میں قصوروار کون تھا — تعظیم الدین یا کوئی اور! کچھ کہا نہیں جا سکتا! لیکن چونکہ چیک وینکٹ رائے نے کیش کرایا تھا اس لیے مصیبت اس پر ہی نازل ہوئی۔

اس اثناء میں راگھپا نوکری نہ ملنے کے سبب گھر واپس چلا گیا۔ وینکٹ رائے نے گھبرا کر راگھپا کو خط لکھا۔ راگھپا نے اپنے بہنوئی سوامی رائے کلکرنی سے ضمانت دلوا کر وینکٹ رائے

کو جیل جانے سے بچا لیا۔
پونا سے جب وہ تینوں دھارواڑ آرہے تھے تو ریل میں کلکرنی سوامی رائے اس سے بولے "میں نے تمہاری ضمانت لی ہے، تم اپنے حصہ کی زمین میرے نام لکھ دو۔ تمہارا کیا بھروسہ؟" سوامی نے جب اس کے لیے زیادہ اصرار کیا تو دھارواڑ آکر وہ ہبہ نامہ اس نے لکھ دیا۔ لکھنے کو تو اس نے ہبہ نامہ لکھ دیا لیکن بعد کو اُسے اس پر کچھ پچھتاوا ہوا۔ تحریر شدہ ہبہ نامہ کی نقل نہ تو وینکٹ رائے کے پاس تھی اور نہ ہی راگھپا کے پاس۔ ادھر راگھپا نے اس سے یہ کہا کہ تمہارے حصہ میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہمارے کھیتوں میں سے اگر دو اچھے کھیت بھی سوامی رائے نے لے لیے تو مجھے تو روٹیوں کے لالے پڑ جائیں گے۔ راگھپا نے اس کو تنگ کرنا شروع کیا کہ سوامی رائے سے ہبہ نامہ کی ایک نقل لے آئے۔ وہ دیوانہ تو تھا ہی ان باتوں سے اور بھی تنگ ہوا اور ایک دن سوامی رائے سے بولا "میں وکیل سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس ہبہ نامے کی ایک نقل مجھے دے دیجیے"، سوامی رائے ایک سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے وینکٹ رائے کی بات نہ مانی۔ اس سے وینکٹ رائے کو اور بھی زیادہ پریشانی ہوئی۔ وہ سوامی رائے سے برابر تقاضا کرتا رہا ایک روز اس کے تقاضوں سے عاجز آکر اس دستاویز کی نقل سوامی رائے نے اس کے منھ پر یہ کہتے ہوئے پھینک ماری "میں نے پانچ ہزار روپیہ دے کر تمہاری ضمانت لی ہے اگر کوئی کہہ دے کہ میں نے تم سے غلط لکھوا لیا ہے تو میں کوئی بھی سزا بھگتنے کو تیار رہوں"، وینکٹ رائے اُس نقل کو لے کر راگھپا کے گھر آیا۔ اگلے دن صبح وکیل سے مل کر مشورہ کرنا تھا۔ اس لیے وینکٹ رائے کھانا کھا کر راگھپا کے گھر پر ہی سو گیا۔ اسی رات گیارہ بجے کے قریب پولیس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پولیس کی گھبراہٹ سے بچنے کے لیے وینکٹ رائے پچھواڑے کے دروازے سے بھاگ کر اسٹیشن پہنچا اور وہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر بمبئی آگیا۔ اس واقعہ کو جس طرح وینکٹ رائے نے بیان کیا تھا اُسی طرح جوں کا توں آپ کو لکھ رہا ہوں لیکن اس معاملے میں مجھے کچھ شبہات ہیں۔
بمبئی آنے کے کچھ دن بعد وہ اس آٹے کی چکی کے مالک کے گھر پر ملازم ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب یہ چکی اس کے مالک نے کھولی تو وہ چکی پر کام کرنے لگا۔ اس دن سے وہ اسی طرح گمنامی کی حالت میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اس ہبہ نامے کو پڑھنے والے لوگوں میں میں پہلا شخص ہوں جس نے اُسے یہ یقین دلایا ہے کہ اس کا حصہ اُسے واپس مل جائے گا۔ اس معاملے میں جس ترتیب سے وینکٹ رائے نے واقعات بتائے تھے اسی ترتیب سے میں نے

لکھ دیے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کی دیوانگی کے سبب بہت سی باتیں ٹھیک طرح سمجھ میں نہ آتی ہوں اس لیے بہت سی باتوں میں مجھے کچھ شک سا لگتا ہے۔ آپ بھی اگر وینکٹ رائے کی زبانی یہ باتیں سنتے تو آپ کے دل میں بھی یہی شبہات سر اٹھاتے۔ میں نے جو باتیں نوٹ کی تھیں ان کی بنیاد پر پورے واقعات واضح ہو کر سامنے نہیں آتے ہیں اس سلسلے میں میرے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے ان کو ذیل میں لکھتا ہوں:

پہلی بات: وینکٹ رائے کے پاس ہبہ نامہ کی جو نقل ہے وہ اس کو اصل ہبہ نامہ کی نقل تسلیم کرتا ہے لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پہلے خط میں آپ کو لکھا تھا کہ مجھے وہ اصل ہبہ نامہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اس پر رجسٹری کی مہر نہیں ہے اور اس کی روشنائی ہلکی پڑ چکی ہے اس لیے وہ نقل معلوم ہوتی ہے۔ میری اس بات کی تصدیق ایک اور بات سے بھی ہوتی ہے۔ سوامی رائے نے طیش میں وہ کاغذ وینکٹ رائے کے منھ پر کھینچ مارا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ غصہ میں اس نے نقل کے بجائے اصل کاغذ ہی پھینک دیا ہو لیکن وینکٹ رائے چونکہ نیم پاگل ہے اس لیے یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہی اصل دستاویز ہے۔ دونوں نقلیں ایک ہی جگہ رکھی ہوں تو غصہ میں ایسا ہو جانا کوئی بعید نہیں ہے۔

دوسری بات: جب اس کی ضمانت ہو چکی تھی تو پولیس کیوں آتی؟ سمن آنا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس رات کوئی اور آیا ہو۔ وینکٹ رائے کے دل میں جو ڈر بیٹھا ہوا تھا اس کی بنا پر وہ یہ فرض کر کے کہ پولیس آئی ہے فرار ہو گیا!

تیسری بات: وینکٹ رائے کے بھاگ جانے کے بعد سوامی رائے کی کیا حالت ہوئی؟ صرف اسی ڈر سے کہ کہیں یہ بھاگ نہ جائے اس نے مضبوطی کے لیے جائداد اپنے نام لکھا لی تھی تاکہ اگر یہ واقعی بھاگ جائے تو ضمانت کا اس کا جو پیسہ ڈوبے گا اس کے بدلے اسے یہ جائداد مل جائے گی ایسا جھوٹا سہارا اسے رہا ہوگا۔ لیکن غور سے دیکھنے پر جب اسے پتہ چلا ہوگا کہ اصل کاغذ ہی اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو وہ ضرور گھبرا گیا ہوگا لیکن یہ بات وینکٹ رائے کے ذہن میں نہیں آئی ہے اس کا یہی خیال ہے کہ اب بھی اس کی جائداد سوامی رائے کے پاس چلی گئی ہوگی اور وہ مزے سے ہوگا۔ اگر اس کو صحیح حالات کا علم ہو جائے تو اس کو بہت دُکھ ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے دماغ کا توازن اور بھی بگڑ جائے اس لیے اس معاملات میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

ان باتوں کے بعد بھی اصل راز پوری طرح نہیں کھلتا۔ جعلی چیک کا دینے والا کون تھا؟

وینکٹ رائے کے فرار ہو جانے کے بعد پولیس نے اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی یا نہیں ؟ اس کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلتا رہا یا نہیں ؟ یہ سوالات بہت اہم ہیں اور ان کا جواب دوسرے ذرائع سے معلوم کرنا ضروری ہے۔ میں اس سلسلہ میں پوری چھان بین کرنا چاہتا ہوں یہاں پر میں کچھ اور معلومات حاصل کرنے کی اور عدالت کے پرانے فیصلوں کی فائلیں منگوانے کی بھی کوشش کروں گا۔

اگر یہ کہانی پوری طرح معلوم ہو جائے تو اسے ہمارے اخبار میں سلسلہ وار "چھدم" کے نام سے چھپوایا جا سکتا ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں اخبار کے ایڈیٹر صاحب سے گفتگو کی ہے اُنھیں میں نے کچھ واقعات بتائے تو وہ بہت خوش ہوئے اور بولے "ہندوستان میں ایسے دلخراش واقعات کو لکھنے والے کتنے ہیں ؟ کامک بھی ہمیں باہر سے خریدنے پڑتے ہیں کہانیاں بھی دوسرے ملکوں سے منگواتے ہیں حالانکہ یہ کہانیاں دوسرے ملکوں کے پس منظر میں لکھی جاتی ہیں ان وجوہات کی بنا پر وہ اسے سلسلہ وار فیچر کے طور پر چھاپنے کے لیے تیار ہیں۔ پونا جانے کے لیے کچھ روپیہ بھجوا دیجیے۔

میری پڑھائی ٹھیک چل رہی ہے۔ صحت بھی ٹھیک ہے۔ ماتا جی کو نمسکار۔ بھائیوں کو دعا۔ فقط

آپ کا

اچیوت راؤ

34

آگ سے کھیل

دیسائی جی کی طرف سے گنگوا کو منانے کے لیے بیٹی اور داماد کو بھیجنے کا پیغام پا کر راگھپا نے بڑبڑاتے ہوئے اس کی تعمیل کی تھی اور دل میں کہا تھا "کر لو دیسائی جی جو تمھیں کرنا ہے۔ وقت آنے پر میں بھی تمہاری گردن ناپوں گا"۔ چنانچہ اس نے بیٹی اور داماد کو اپنے گھر بلا کر سمجھایا۔

"آپ لوگوں کو مل جل کر رہنا چاہیے۔ میری بہن نے بہت دکھ اُٹھائے ہیں اُسے مزید دکھ نہیں دینا چاہیے۔"

رتنا کے بیاہ کے بعد بھی راگھپا نے بہن کے گھر قدم نہیں رکھا تھا۔ گنگوا ابھی اُس کے گھر نہیں

گئی تھی رنجش کی وجہ سے اگر گنگوا کے لیے راگھپا گناہ کا جیتا جاگتا مجسمہ تھا تو راگھپا کے لیے بھی گنگوا ایک ایسی حیثیت کی طاقت رکھتی تھی جس سے وہ ڈرتا تھا اور جو اپنی قوت سے اُسے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گنگوا کا ذکر سن کر اس کا دل رحم سے بھر جاتا۔ جب شادی طے ہوئی تھی اس وقت بھی راگھپا کے دل کی یہی کیفیت ہوئی تھی۔ آج بھی جب اسے معلوم ہوا کہ گنگوا کھانا کھائے بغیر گھر چھوڑ کر چلی گئی اور دیسائی جی کے گھر میں ہے تو اس کا دل پگھل گیا اس وجہ سے بیٹی اور داماد دونوں مان گئے۔ اس نے اپنے دل کی کیفیت کو چھپا کر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ دیسائی جی کی بات کو رکھنے کے لیے ایسا کر رہا ہے چنانچہ اس نے بیٹی اور داماد کو اگلے دن ہی وہاں جانے کے لیے مجبور کیا۔ گمراہی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں وہ کبھی راہ راست کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کے لیے جواز بھی خود ہی تراشتی ہے۔

لیکن اس کا نتیجہ کچھ اور ہی نکلا۔ راگھپا نے یہ نہ سوچا تھا کہ اس نے دیسائی جی کو اپنی بیوی کے حاملہ ہونے کی جو خوشخبری دی تھی وہ اسے باپ بیٹی میں اختلاف پیدا کرانے کے لیے استعمال کریں گے۔ رتنا جو ہر دوسرے تیسرے روز میکے آتی تھی اس دن ایسی لڑ کر گئی کہ پندرہ دن گزر جانے پر بھی اس کی شکل نہ دکھائی دی۔ کٹی سے البتہ راستہ میں اس کی دو تین بار ملاقات ہو گئی تھی۔ اس سے وہ بیٹی کے بارے میں کیا پوچھتا۔ رتنا کی صورت اتنے دن نہ دکھائی دی تو دل تڑپنے لگا۔ لیکن وہ یہ کہہ کر اپنی تسلی کر لیتا ” شوہر کے گھر سُکھ سے رہے، یہی ہماری آرزو ہے“۔ پھر وہ سوچتا ” راون کی طرح میری بربادی کا وقت بھی شاید آ گیا ہے۔ ایک ایک کر کے کھو رہا ہوں۔ اچھی بات ہے دیسائی۔ ایک معاملے میں تجھے بھی جھکا کر رہوں گا۔“

دو آرزوئیں اس کے دل میں دن بدن شدید ہوتی جا رہی تھی۔ ایک تو یہ کہ اس کے ہاں لڑکا ہی پیدا ہو، اس کے لیے اس نے ستیہ نارائن کی پوجا کرائی، منت مانی، بمبئی کے ایک مشہور جوتشی کو پانچ روپیہ بھیج کر اس سے دریافت کیا۔ اس کا بھی یہی جواب آیا کہ لڑکا ہوگا۔ پانچ آنے اور پانچ سپاری چڑھا کر شہر کی ایک مشہور جوگن سے بھی پوچھا۔ اس کا جواب بھی یہی تھا کہ لڑکا ہوگا چنانچہ اس طرف سے راگھپا مطمئن ہو گیا اس کی دوسری آرزو یہ تھی کہ شانتا کی شادی وسنت راؤ سے ہو جائے۔ دیسائی جی پر اپنی برتری دکھا سکنے کے لیے بھی یہ ضروری تھا۔ اس لیے وہ وسنت کو اپنے گھر آنے کے لیے برابر جوش دلاتا رہتا تھا۔ ہمیشہ شانتا ہی وسنت کو چائے پلاتی تھی لیکن وسنت کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ اُسے اس سلسلہ میں پس و پیش تھا۔ وہ یہ سوچتا تھا کہ جب راگھپا کو صرا

کی دوکان کرنے والا لڑکا مل رہا ہے تو وہ میری طرف کیوں دھیان دینے لگا۔ صرف کھادی کے کپڑے پہننے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ مجھے اپنی بیٹی دینا چاہتا ہے تو صاف صاف کیوں نہیں کہتا۔ فوراً ہر کام کے نتیجہ کی تمنا رکھنے والا وسنت اصل معاملے کی طرف سے غافل مزیدار پکوانوں، گپوں اور تاش کے کھیل سے مطمئن تھا۔

وسنت کے دل میں ایک خیال تھا: شاید شانتا مجھے پسند کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے گھر سے نکلتے ہی باغیچے سے پھول توڑنے کے بہانے پیچھے پیچھے کیوں آتی۔ وسنت جب ناٹک کمپنی کھولنے کے چکر میں تھا تو اس نے اپنے لیے نقلی موتیوں کا ایک ہار بنوایا تھا۔ اس نے اس ہار کو کھلوا کر دوبارہ زنانے ڈیزائن کا بنوالیا تھا اور کافی عرصے سے اپنی جیب میں لیے پھر رہا تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی دن شانتا اسے تنہا مل جائے تو یہ ہار اس کی نذر کر دے۔ آخر ایک دن اُسے موقع مل گیا لیکن جگہ ٹھیک نہ تھی۔ راستے کا معاملہ تھا۔ گھر میں شانتا اسے کبھی تنہا نہ ملتی تھی۔ چمپکا ہر وقت اس پر نظر رکھتی تھی۔ ایک دن سہیلی کے گھر سے لوٹتے ہوئے شانتا کی راستہ میں وسنت سے ملاقات ہوگئی۔ شانتا نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ راستے میں روک کر اس سے باتیں کرے گا لیکن ایسا ہی ہوا۔ وسنت اس کے سامنے ایک ستون کی طرح اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا راگھپا جی شہر میں نہیں ہیں؟"

"ہیں تو"

"گھر میں نہیں تھے۔"

"باہر گئے ہوں گے۔"

"ذرا یہ دیکھو" کہہ کر وسنت نے جیب سے ہار نکال کر شانتا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ ہار کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے اس کے موتیوں پر اپنی نازک نازک انگلیاں پھیرنے لگی۔ وسنت کو اس کی انگلیاں بھی موتیوں جیسی حسین معلوم ہوئیں۔ وہ جوش میں بولا "یہ موتی سچے نہیں ہیں۔ کلچرڈ ہیں"

شانتا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے اس لیے ذرا حیران ہو کر پوچھا:

"آپ کی ماتا جی کا ہے کیا؟"

"نہیں، میرا ہی ہے۔ گاؤں میں ناٹک کھیلنے کے زمانے میں راجہ کا پارٹ کرتے وقت

پہننے کے لیے بنوایا تھا۔ تمہیں پسند ہے تو لے لو۔"

یہ سن کر شانتا اور بھی حیران ہوئی۔ ادھر ادھر نظریں دوڑانے پر اس نے دیکھا کہ گلی کی عورتیں اپنے دروازوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ عورتیں آپس میں کھسر پسر بھی کر رہی تھیں لیکن دور ہونے کی وجہ سے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ شانتا کو یہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ پہلے جب وہ جلسے جلوسوں میں حصہ لیتی تھی تو کچھ بڈھے کھرانٹ لوگوں نے کہا تھا "اوہ، یہ تو چمپا کی لڑکی ہے! اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے"۔ وہ اہانت آمیز باتیں اُسے یاد آئیں۔ اس نے سوچا اگر میں ہار کو لینے سے انکار کرتی ہوں تو یہ حضرت یہیں کھڑے کھڑے تکرار شروع کر دیں گے۔ لہٰذا یہ کہہ کر " یہ موتی کتنے پیارے ہیں، سہیلیوں کو آپ کا ہار دکھا دوں، بعد میں واپس کر دونگی" ہار ہاتھ میں اچھالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

وسنت نے محسوس کیا کہ جیسے وہ لٹ گیا ہو! بہرحال اس نے اپنے کو خوش نصیب ہی تصور کیا۔

دن گزرنے کے ساتھ راگھپا کو اپنے آپ پر قابو رکھنا مشکل ہوتا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ وسنت کے سامنے صاف طور پر یہ ذکر کر بیٹھ گیا۔

" وسنت میں نے اپنی شانتا کے بارے میں کافی سوچا ہے۔ اس صراف گوبند رائے کے لڑکے سے اگر آج کہدوں تو وہ ناچتا ہوا آئے گا اور شانتا سے شادی کرے گا لیکن ان کے گھرانے کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔ دیکھنے میں تو سبھی مالدار نظر آتے ہیں لیکن ان صرافوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ سونا کاٹنے والا ہاتھ قصائی کی طرح ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی بڑی بڑی خواہشیں ہوتی ہیں۔ گھر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی جھگڑا چلتا رہتا ہے۔ زہر کھلا دینے کے واقعات بھی آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ ان کے خاندان ہی ملزم ہوتے ہیں۔ ان کے بچے پگلے اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میری ہمت وہاں شادی کرنے کی نہیں پڑتی اس لیے میں نے ایک بات سوچی ہے۔"

"کیا"

" ہماری تمہاری دوستی کو دو سال ہو گئے۔ تمہاری طبیعت مجھے پسند ہے۔ تمہارے والد کی عقیدت روز بروز میرے دل میں بڑھتی جا رہی ہے۔ تمہارا قد، تمہاری شکل وصورت، تمہارا

مزاج سولہ آنے ہماری شانتا کے شایان شان ہے۔ اگر میں تمہیں اپنی شانتا دے دوں تو میں ہی نہیں، تم، تمہارے والد اور تمہارا کنبہ خوش نصیب ہو گا۔ مجھے اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں ہے دو تین دن سے یہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ آج اپنے پر قابو نہ رکھ سکا اس لیے تم سے کہہ دیا"

وسنت پھولا نہ سمایا۔ اس نے کہا "میرے لیے آپ کی بات سے انکار کرنا ممکن نہیں پتاجی کو منا لیجیے۔ میں کل ہی تیار ہوں۔"

راگھپا کو اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اس لیے اس کا جواب بھی تیار تھا اُسے معلوم تھا کہ دیسائی جی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے ہیں۔ وہ اس شادی کی بات کو مان لیں، یہ ممکن ہی نہ تھا۔ اس کے علاوہ اگر ایک بار ان کے منھ سے "نہیں" نکل جائے تو پھر ان کو منوانا ناممکن ہے۔ پھر پہلے اچیوت کی شادی ہونی چاہیے۔ بعد میں وسنت کے متعلق سوچا جائے گا دیسائی جی یہ بہانہ بھی کر سکتے تھے۔ راگھپا کو یہ تمام باتیں پسند نہ تھیں۔ اس کا منصوبہ کچھ اور تھا وسنت کو اپنے باپ سے خود کہنا چاہیے۔ اس معاملے میں ان سے لڑنا چاہیے۔ ضرورت ہو تو اپنا گھر چھوڑ کر اس کے گھر آکر رہنے لگے۔ پھر اس کی بیٹی سے شادی کرنے کے بعد باپ کے خلاف دعویٰ دائر کر کے حصہ لے کر آزادی سے راگھپا کے کہنے کے مطابق چلنا چاہیے۔ اتنا ہو جائے تو دیسائی جی کا دماغ ٹھیک ہو جائے یہ سب سوچ کر راگھپا بولا "تمہیں منظور ہے یا نہیں؟ ویسے خون کا رشتہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ پہلے تم اپنا دل پکا کر لو۔ بعد میں بتاؤں گا۔"

"میرا دل بالکل پکا ہے۔ آپ اگلی بات بتائیے۔"

"اب ہماری شانتا پندرہ برس پورے کر کے سولہویں میں چل رہی ہے۔ کیا ہم اور دو تین سال ٹھہرے رہیں؟ پہلے یہ بات بتا دو۔"

"میں ایسا کب کہہ رہا ہوں۔"

"تم نہیں، تمہارے پتا تو کہہ سکتے ہیں۔ پتاجی کو منانے کی بات تم نے کہی تھی نا..... یہ سچ ہے تمہارے پتاجی میری بات رد نہیں کریں گے..... لیکن بڑا لڑکا ابھی پڑھ رہا ہے۔ اس کی پڑھائی ختم ہو جائے۔ بعد میں وسنت کی بات سوچیں گے یہ بات تمہارے پتاجی کہیں گے اور ٹھیک ہی کہیں گے۔ سب کام سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ بزرگوں کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ اگر وہ ایسا کہہ دیں تو میں تو تین چار سال تک رک نہیں سکتا.......

سولہ سال کی ہوتے ہوتے شانتا کی شادی ہوجانی چاہیے میری یہی خواہش ہے۔"

"تو پھر کیا ہو" وسنت نے پریشان ہوکر اس طرح گال سہلاتے ہوئے پوچھا جیسے اُسے باپ کا وہ تھپیڑ یاد آگیا ہو۔

"یہ تمہارا کام ہے۔ اگر واقعی تم میری لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو یہ بات پتا جی کو صاف صاف بتا دینی ہوگی۔ اگر تمہارے دل میں سچی خواہش ہے تو تم اپنے آپ کہہ دوگے میرا اس معاملے میں کچھ کہنا سننا ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھو میری عمر بھی کافی ہوگئی ہے۔ چار آدمیوں میں معزز مانا جاتا ہوں۔ ایک بیٹی کی شادی بھی کر چکا ہوں۔ میں تمہارے پتا سے اگر یہ کہوں کہ بڑے بھائی سے پہلے چھوٹے بھائی کی شادی کر دو تو جو سنے گا وہ یہ کہہ کر میری ہنسی نہ اڑائے گا کہ اس بڈھے کو بڑھاپے میں بھی عقل نہ آئی۔ ویسے اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ہماری شانتا تمہارے شایانِ شان لڑکی ہے اس شادی سے تمہارا نصیب جاگ اٹھے گا، میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں۔ باقی تمہارے عزم اور حوصلے پر منحصر ہے!"

وسنت اور بھی گومگو میں پڑ گیا۔ بہت سوچ کر بولا "آپ جیسا کہیں گے میں ویسا کرنے کو تیار ہوں۔"

"میں ایک ہی بات کہتا ہوں۔ اپنے پتا کو منانے کا کام تمہارا ہے۔ ہم اس میں دخل نہیں دے سکتے بس اب تم سمجھ جاؤ۔ تم کوئی بے وقوف یا احمق نہیں ہو۔ سب کچھ سمجھتے ہو۔ ہماری شانتا کو بھی تم نے دیکھا ہے۔ میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ مرد کا مستقبل اس کی شادی پر منحصر ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملے میں کبھی کبھی چھوٹوں کو بھی اپنے بزرگوں کو عقل سکھانی پڑتی ہے۔"

وسنت اس بات کا ذکر کرنے کی ایک ہی جگہ ہمت کر سکتا تھا۔ اپنی ماں سے۔ ان سے وہ ضد بھی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ غرض اسی گومگو کی حالت میں راگھپا سے رخصت ہوکر وہ گھر پہنچا۔

پندرہ دن تک ماں کے ساتھ رسوئی میں کھسر پھسر کرنے پر بھی ماں اس بات کو دیسائی جی کے سامنے لے جانے کو تیار نہ ہوئیں۔ وہ بڑے گھرانے کی لڑکی تھیں۔ ایسی باتیں ان کے لیے بالکل نئی تھیں۔ انھیں خود کو جب دیسائی جی کو دکھانے کے لیے لے جایا گیا تھا تو ان کے ساتھ تیس ہنڈے والے، بیس ننگی تلواریں لیے پہرہ دار، دو بندوقچی، بینڈ باجے والے اور بہت سے رشتہ دار تھے۔ اب دولھا خود کہے کہ مجھے اُسی لڑکی سے شادی کرنا ہے اور وہ بھی راگھپا کی لڑکی

ے جو بیٹی کی شادی پر ہزار روپیہ بردکشنا بھی نہیں دے سکتا تھا، ایسے شخص کو اپنا سمدھی بنانا۔ پھر اچھوت کا نمبر پیچھے ڈال کر وسنت کی شادی کرنا۔ یہ باتیں دینو بائی کے لیے سوچنا بھی مشکل تھیں۔ اسکی روز روز کی کھسر پھسر سے تنگ آکر ایک دن اس نے صاف صاف کہہ دیا " اگر تمہارا اتنا ہی دل ہے تو جاکر خود کیوں نہیں کہہ دیتے۔ اس راگھپا کی بات میں سننا نہیں چاہتی "

ماں صرف ایک بار بات چھیڑ دیتی تو وہ آگے بات بڑھا سکتا تھا لیکن خود آگے بڑھ کر باپ سے بات کرنے کی ہمت اس میں کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ دوہری پریشانی میں پھنس گیا تھا۔ ادھر گھر میں بات آگے نہیں بڑھ رہی تھی اور ادھر وہ راگھپا کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہ گیا تھا اس طرح کسی فیصلے پر پہونچ نہ پانے کے سبب اس نے راگھپا کے گھر جانا ہی بند کر دیا۔

دیسائی جی کو سب باتیں بیوی سے معلوم ہوگئی تھیں۔ انھوں نے ایک بار اچھوت کے پاس سے آیا ہوا دوسرا خط نوکر کے ہاتھ راگھپا کو بھجوایا اور کہلوایا کہ پڑھ کر واپس کر دے۔

ایک دن شانتا جب سج دھج کر کسی سہیلی سے ملنے جا رہی تھی تو چمپکا پہلے تو اسے گھور گھور کر دیکھتی رہی پھر اُسے آواز دی " شانتا، ادھر آنا "، اُسے پاس بٹھا کر اس کے بلاؤز میں چھپے ہوئے موتیوں کے ہار کو باہر نکال کر پوچھا۔

" یہ کس نے دیا "

" میری سہیلی کا ہے "

" سچ بولو "

" سچ سچ، سہیلی کا ہی ہے "

" کون سی سہیلی کا "

" پدما کا "

" اس نے تمھیں کیوں دیا "

" ماں کیا پاگل ہوگئی ہو۔ اس نے دو تین دن کے لیے مجھے پہننے کو دیا تھا "

" شانتا، سچ سچ بتاؤ ___ تمھاری شادی کی فکر کے مارے مجھے رات کو نیند نہیں آتی ہے۔ اگر تم نے ابھی سے جھوٹ بولنا شروع کیا تو کبھی سکھ نہ پا سکوگی "

" ماں، جھوٹ کیوں بولوں گی، تم پدما کو بلا کر پوچھ لو۔ کیا تم مجھ پر شبہ کرنے لگی ہو کہ

میں چوری کرنے لگی ہوں۔"

چمپکا کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہے۔ اُس میں غصہ کرنے کی طاقت بھی نہ تھی۔ اگر شوہر سے شکایت کرتی ہے تو پتہ نہیں کیا حشر کریں۔ شانتا نے اُسے ایسا جواب دیا تھا کہ اس کا منہ بند ہو جائے۔ پہلے جیسی طاقت اگر اس میں ہوتی تو وہ شانتا کے منہ پر دو چانٹے رسید کرتی لیکن اب وہ ایسا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہر حال اپنے چھپے ہوئے غصہ کو دکھانے کے لیے چمپکا کھسکتی ہوئی شانتا کے پاس آئی اور اس کے زور زور سے دو تین چٹکیاں کاٹ لیں۔

"ماں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں دھیرے دھیرے پاگل ہوتے جا رہے ہو۔ پتا جی اپنے آپ سے باتیں کرتے رہتے ہیں اور تم چھوٹی بچیوں کی طرح چٹکیاں کاٹ رہی ہو۔"

"کچھ نہیں بیٹا، غلطی ہوئی۔ جاؤ تم اپنی سہیلی کے گھر جاؤ۔"

چمپکا کے دل کو اطمینان نہیں ہوا۔ شانتا کے چلے جانے کے بعد اس کے دل میں ایک دم خیال آیا۔ "اگر وہ ہار سہیلی کا تھا تو اسے بلاؤز میں چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ . . . . اچھا آئندہ اس کی نگرانی اور زیادہ کرنا پڑے گی۔" یہ سوچ کر وہ چپ ہو گئی۔

اس کی خوش قسمتی سے وسنت کا آنا جانا بھی اب کم ہو گیا تھا۔

35

بُری خبر

چمپکا کو آٹھویں مہینے میں ہی درد شروع ہو گئے۔ گھر پر اُسے جو ڈاکٹر دیکھنے آیا تھا اس نے چمپکا کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اُسے اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ راگھپا ایمبولینس منگوا کر بیوی کو اسپتال لے گیا۔ ماں کے گھر چھوڑ کر جاتے وقت شانتا غم سے رونے لگی۔ اس کو روتا دیکھ چمپکا درد کی حالت میں ہی بولی "میری واپسی تک کرشن کی ماں کے گھر میں رہنا" لیکن شانتا اس کے لیے تیار نہ ہوئی وہ بولی "مجھے کوئی ڈر نہیں۔ میں گھر میں ہی رہوں گی" چمپکا گزشتہ پانچ چھ سال میں پہلی بار گھر سے نکلی تھی۔ پڑوسی کے لڑکے بھیم سین کے ساتھ راگھپا بیوی کو اسپتال لے گیا۔ چمپکا کی چیخیں سن سن کر راگھپا کا دل ہل گیا۔ یہ دلخراش اور قابل رحم منظر دیکھ کر اس کا رواں رواں

کانپ اٹھا۔ اسپتال کے باہر غمزدہ ہو کر بیٹھ گیا اور بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگا۔

چمپکا کا درد اب ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ درد کو برداشت کرنے کی طاقت اس کے بدن میں بالکل نہ تھی۔ بے ہوشی کی دوا دینے کے لیے ڈاکٹروں نے آپس میں مشورہ کیا لیکن کمزوری میں کوئی غلط اثر نہ ہو جائے اس ڈر سے یہ خیال ترک کر دیا۔ زچہ خانے کے کمرے میں ڈیوٹی پر تعینات ڈاکٹر بھی چمپکا کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

اس درد کی حالت میں بھی اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، ایک نرس اُسے دیکھ کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس گئی اور اسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی لیکن چمپکا پھر اٹھتی ہوئی بولی "وہ کہاں ہیں" نرس نے جواب دیا "وہ باہر ہیں آپ فکر نہ کریں۔" چمپکا نے کہا "صرف ایک بار ملنا چاہتی ہوں، ذرا اندر بلائیے۔ ایک بات کہنی ہے" یہ کہہ کر پھر چیخیں مارنے لگی۔ حالانکہ یہ بات اصول کے خلاف تھی لیکن اس کی حالت کے پیش نظر نرس ڈاکٹر سے اجازت لے کر راگھپا کے پاس گئی اور اس سے کہا "ابھی دیر ہے، اندر آپ کو بلا رہی ہیں۔ آپ اندر جا سکتے ہیں۔"

راگھپا کو رونا آ گیا۔ وہ یہ سوچتے ہوئے اندر آ گیا کہ شاید آخری ملاقات کے لیے بلایا ہے۔ سسکیاں لیتے ہوئے اس نے پوچھا "کیا بات ہے.... کیسی ہو؟"

اس کی آواز سن کر چمپکا نے اس کے غم کی طرف دھیان نہ دیتے ہوئے درد سے تڑپتے ہوئے اس نے پوچھا "آپ یہیں بیٹھے ہیں...."

"ہاں...."

"آپ کی عقل ٹھکانے ہے یا نہیں؟ گھر میں ننانتا کو اکیلے چھوڑ آئے ہیں بھیم کو یہاں چھوڑ کر آپ گھر جائیے۔ مجھے کچھ نہیں ہونے والا.... آپ آنا ہی چاہتے ہیں تو اسے ساتھ لے آئیے.... اگر آپ نہیں جائیں گے تو میرا گوشت کھانے کے برابر ہوگا" غصہ میں اتنا کہہ کر وہ بستر سے ٹک گئی اور پھر درد سے تڑپنے لگی۔

راگھپا انگوچھا منہ پر ڈال کر ہوں ہوں کر کے رونے لگا۔ نرس نے اس کا کرتا پکڑ کر کھینچا تو وہ آنکھیں پونچھتا ہوا باہر نکلا۔

"بھیما تم یہیں رہو۔ میں تمہارا کھانا بھجوا دوں گا۔ اگر کچھ معلوم ہو تو مجھے بتا جانا۔ سائیکل پر آ جانا۔ میں دو ایک گھنٹے میں آتا ہوں۔" بھیم سین سے اتنا کہہ کر وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں ننانتا کچھ دیر تک اکیلی بیٹھی روتی رہی۔ بعد میں تنہائی سے اُسے ڈر لگنے لگا۔ گھر کا باہری دروازہ بند کیا۔

کسی دوسرے کے گھر جا کر بیٹھنے کو اس کا جی نہ چاہا۔ سبھی پاس پڑوسیوں کو وہ حقارت سے دیکھتی تھی اپنے گھر میں اکیلا بیٹھ کر کانپتے رہنے پر بھی اسے فکر نہ تھی پڑوس کی کرشن کی ماں کے گھر بھی قدم نہیں رکھوں گی۔ یہ سوچ کر وقت گزاری کے لیے وہ ایک ناول پڑھنے لگی لیکن اس کا دل نہ لگا۔ پچھلی بار کرشن کی ماں کے گھر جا کر اس کی بڑی توہین ہوئی تھی۔

راستہ میں اس کی وسنت سے جو ملاقات ہوئی تھی وہ ایک افسانے کی طرح سارے محلے میں مشہور ہو گئی تھی۔ شانتا کی سہیلیاں جب تجاہل عارفانہ سے یہ پوچھتیں "موتیوں کی یہ مالا کہاں سے آئی؟" تو وہ جذبات سے عاری چہرہ بنا کر یہ کہہ دیتی "پتاجی نے میرے جنم دن پر بنوا دی ہے" شانتا سے اس کی سہیلیاں جلتی بھنتیں لیکن اس نے اصلی بات کی ان کو ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ سوال اس سے سب ہی نے پوچھا تھا۔ اس نے بھی سب کو ایک ہی جواب دیا۔ ان خوبصورت موتیوں کو دیکھ کر اس کی بہت سی سہیلیاں اس سے جلنے لگیں۔ بات بہت پھیل گئی لیکن شانتا کو پتہ نہ چلا وہ پرسکون رہی۔ اس کی یہ بے نیازی بڑی بوڑھیوں کو بڑی کھلتی تھی انہوں نے اپنی لڑکیوں کو نصیحت کی۔ سارا بائی کے منھ سے یہ کلمات نکلے: "ارے وہ چمپا کی بیٹی ہے، اور کوئی نہیں ہے" کرشن کی ماں کی لڑکی مندا کنی سے شانتا کی بہت دوستی تھی، کرشن کی ماں نے ان دونوں کی دوستی ختم کرانا چاہی لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے ایک اور راستہ نکالا۔

ایک دن کرشن کی ماں کے گھر پھول اور پان سپاری دینے کی رسم ہوئی۔ کرشن کی ماں نے اسے کچھ دیر پہلے ہی بلایا اور کافی کام بھی کرایا۔ گوری کا منڈپ سجانے میں شانتا نے تین گھنٹے جان کھپائی۔ جب گھر لوگوں سے بھر گیا تو شانتا نے بلاؤز میں چھپایا ہوا ہار نکالا اور اسے اس طرح پہنا کر سب کو دکھائی دے۔ اُسے دیکھ کر کرشن کی ماں اپنے آس پاس کی عورتوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے منڈپ کے پاس بیٹھی ہوئی شانتا کے پاس آئی اور بولی "اب اچھی لگ رہی ہو، گوری ماں منڈپ میں ہے یا باہر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ان موتیوں کا رنگ تمہارے رنگ جیسا ہے۔ ہے نا بہنو!" عورتیں بولیں "ہاں ہماری چمپا کی لڑکیوں کا رنگ ہی ایسا ہے" شانتا شرماتی ہوئی مصنوعی انکساری سے بولی "ارے چھوڑیے، یہ تو جھوٹے موتی ہیں کوئی سچے تھوڑی ہیں۔"

عورتوں کے جھنڈ میں سے ایک آدھ کی ہنسی نکل پڑی۔ کچھ بولیں "اب ہم چلتے ہیں زیادہ تر عورتوں نے مذاق کی اس بات کو سنا لیکن ڈر کے مارے چپ سادھے رہیں۔ کچھ نے اپنے منھ لٹکا لیے۔

ثانتا وہاں سے تیزی سے اٹھی اور گھر چلی آئی۔ اس نے عہد کیا کہ پاس پڑوس کے کسی گھر میں اب نہ جائے گی۔ وہ بازار سے اون اور ریشم خرید لائی اور اپنے آنے والے بھائی کے لیے موزے اور سوئیٹر بن کر اور کہانیاں پڑھ کر وقت کاٹنے لگی۔ اس کی ان تمام بدبختیوں کی جڑ وسنت تھا۔ اس نے بھی اب آنا بند کر دیا تھا۔ ثانتا نے اسے دل ہی دل میں کوسا۔ یہ فیصلہ کر کے کہ اگر کبھی اس سے ملاقات ہوگئی تو ہار کو اس کے منہ پر مار دے گی وہ اس کا پندرہ دن تک انتظار کرتی رہی۔ ان حالات میں گلے میں پڑا ہوا وہ ہار اُسے کانٹوں کی طرح چبھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک مہینہ گذر گیا وسنت اُدھر نہ آیا۔۔۔

لیکن اس دن اچانک وسنت وہاں آدھمکا۔

ثانتا کو دیکھے بہت دن ہوگئے تھے اور اس کا خیال اُسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ شادی کے معاملے میں باپ سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکنے کے باعث وسنت نے راگھیا کے گھر آنا بند کر دیا تھا۔ چمپکا کی بیماری کی خبر سنی تو اس بہانے ایک بار ثانتا کو دیکھنے کی تمنا میں دوڑا ہوا آیا۔۔۔ دروازہ بند تھا اندر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ یہ سوچ کر کہ شاید سب لوگ چمپکا کے کمرے میں ہوں گے وہ دروازہ کھول کر بیچ کے کمرے میں پہنچا۔ چپکے سے اندر آنے والے وسنت کو دیکھ کر پہلے تو ثانتا گھبرائی پھر چمپکا کے اسپتال چلے جانے کی بات اُسے بتا کر اس کے ہار دینے سے جو تلخ تجربات ہوئے تھے ان کا ذکر کر کے غصہ دکھانا شروع کیا۔ اپنے فیصلے کے مطابق گلے کا ہار اتار کر واپس کرنا چاہا۔ وسنت معافی مانگتے ہوئے اس کے پاؤں پڑنے لگا۔ وہ اس کے سامنے اس طرح گڑگڑا رہا تھا جیسے اس کی شادی ثانتا سے ہو چکی ہو۔ ۔ ۔ بھگوان پر چڑھنے والا پھول اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اسپتال سے گھر کی طرف آتا ہوا راگھیا ابھی گھر سے تقریباً ایک فرلانگ دور تھا کہ اسے اپنے گھر سے وسنت نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دوپہر کے ایک بجے کی چلچلاتی دھوپ میں گھر پہونچا۔ وہ بھاگتا ہوا گھر میں گھسا اور فوراً بیچ کے کمرے میں پہنچا کمرے میں تھکی سی، ڈری سی، خالی آنکھوں سے دیوار کو تکتی ہوئی بیٹی کو دیکھتے ہی وہ زور سے چیخا "رنڈی" اور اسے زمین پر گرا کر اس کے گالوں اور پیٹھ پر اندھا دھند گھونسے اور تھپڑ برسانے لگا۔ جب تھک گیا تو یہ کہہ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "رنڈی، تو نے مجھے مار ہی ڈالا"۔۔۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ آنے والا بھیم سین تھا۔ راگھپا کو دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولا "ماما جلدی" یہ سنتے ہی راگھپا تانگہ لے کر اسپتال پہنچا معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کی جان بچہ پیدا ہوتے وقت ہی نکل گئی تھی نبض چھوٹ جانے کے بعد بچہ ہوا تھا۔ مرا ہوا لڑکا۔

راگھپا نے بیوی اور بچے کی آخری رسومات خود اپنے سامنے انجام دلائیں۔ جو لوگ میت میں شرکت کے لیے جمع ہوگئے تھے ان کے یہ کہنے کے باوجود کہ "ہم سب آپ کے ساتھ ہیں"۔ اس نے کسی نہ سنی۔ بچے کی میت کو اسپتال سے شمشان تک بیوی کی میت کے پیچھے خود لے کر گیا۔ دیسائی جی سارے انتظامات کرنے کے لیے خود آ پہونچے تھے لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی راگھپا نے ارتھی وغیرہ کا انتظام کر لیا تھا۔ جن لوگوں کو اطلاع دینا تھی اس کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ اس لیے دیسائی جی کا کام صرف ارتھی کو کندھا دینے کا ہی رہ گیا تھا۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکنے پر وسنت چمپکا کے آخری دیدار کے لیے اسپتال گیا۔ رتنا اور شانتا ماں کی وفات پر بہت روئیں۔ ان کو ڈھارس دینے کے لیے آئی ہوئی وینو بائی بھی رو پڑی۔ گنگوا نے ہمت کر کے آگے آتے ہوئے انھیں سینہ سے لگایا اور تسلی دیتے ہوئے کہا "مجھے اپنی ماں سمجھو"۔ اس وقت گنگوا اس غمزدہ گھر میں ہی ٹھہر گئی۔ بھائی کو بھی بہت دیر تک تسلی دیتی رہی۔ راگھپا خاموشی سے سنتا رہا، اب اسے تسلی کی ضرورت نہیں تھی۔

36

دیسائی جی کے نام ایک خط

دوسرے دن رات کے دس بجے جب کٹی راگھپا کے گھر سے اپنے گھر سونے کے لیے جانے لگا تو راگھپا نے کٹی کو آواز دی۔ وہ بہت دیر سے اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ کٹی اس کے پاس پہونچا تو اس نے کہا "یہ خط کل صبح دیسائی جی کو ضرور پہونچا دینا۔ اس وقت وہ سو رہے ہوں گے انھیں مت جگانا کل صبح جا کر دے دینا۔"

کٹی کو اس رات جلدی نیند نہیں آئی۔ سب لوگ راگھپا کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ کٹی کے دل میں

بھی اس کی عزت کم ہوگئی تھی۔ اس کے بجائے، اس کے دل میں ایک قسم کا خوف گھر کر گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ انسان کو اپنے کیے کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے وہ بے چین سا ہو جاتا تھا۔ اتنا کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو جانے کے بعد کیا ڈر پیدا ہو جانا قدرتی نہ تھا؟ دوسرے دن صبح گنگی کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ اٹھتے ہی ہاتھ منھ دھو کر دیسائی جی کو راگھپا کا خط دے کر وہ تیزی سے اپنی سسرال کی طرف چل دیا۔ وہ ابھی راستہ میں تھا کہ پیچھے سے دیسائی جی کا تانگہ تیزی سے آیا۔ دیسائی جی نے تانگہ روک کر کہا "میں بھی وہیں چل رہا ہوں، تم بھی تانگہ پر آجاؤ"۔ گنگی حیرت زدہ ہو کر تانگے پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں راگھپا کے گھر پہونچے تو اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ گھر کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ اندر سے عورتوں کے رونے پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔ دروازہ پر ایک پولیس والا پہرہ دے رہا تھا۔

رات کو دو ایک بار کراہنے کی سی آواز رتنا کے کانوں میں پڑی تھی لیکن وہ اپنی ساس کے نیند میں بڑبڑانے کی آواز سننے کی خوگر ہو چکی تھی پھر گھر میں سوگ تھا اس لیے وہ ڈر کر پڑی رہی اور پھر سو گئی۔ دوسرے دن لوگ تھکن کی وجہ سے بے خبر سو رہے تھے۔ گنگو احسب معمول چھ بجے اٹھی۔ اس نے اپنے بھائی کے کمرے کا دروازہ بند دیکھا لیکن یہ سمجھ کر کہ ممکن ہے رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے آنکھ نہ کھلی ہو، وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ آٹھ بجے تک بھی جب راگھپا باہر نہ آیا تو اس نے رتنا سے کہا کہ وہ راگھپا کو جگا دے۔ کمرے میں اندر سے چٹخنی بند تھی۔ بہت کھٹکھٹانے پر بھی دروازہ نہ کھلا تو بھیم سین کو بلا کر پچھواڑے سے کھڑکی پر چڑھ کر اندر دیکھنے کو کہا گیا۔ کھڑکی کے شیشے سرخ رنگ کے تھے اس لیے کچھ دکھائی نہ دیا۔ شیشہ توڑ کر اندر دیکھا تو راگھپا کی لاش گرڈر سے لٹکی ہوئی نظر آئی۔ یہ منظر دیکھ کر بھیم سین چیخ مار کر وہیں سے نیچے گر پڑا۔ محلے میں خبر ہوتے ہی سب لوگ جمع ہوگئے۔

پولیس نے آکر اسی وقت پنچایت نامہ شروع کر دیا۔ لاش کی تلاشی لی گئی تو جیب میں سے ایک چٹھی ملی۔

"تمام متعلقہ لوگوں کو میں راگھو بندر بامن بند گوڑہ یہ مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی بیوی کی موت کے غم اور کچھ دوسری پریشانیوں سے تنگ آکر پاپ پن کا خیال نہ کرتے ہوئے میں اپنی خوشی سے اپنے کمرے کے گرڈر میں رسی باندھ کر گلے میں پھندا ڈال کر مر رہا ہوں، میں ایسا اپنی مرضی سے کر رہا ہوں۔ اس کی ذمہ داری کسی اور پر نہیں ہے اور نہ کسی پر ڈالی جائے کوئی بھی

میری موت کا غم نہ کرے۔ اپنے سنسکار کے لیے میں نے گلی کے کونے والی لکڑی کی ٹال کے مالک کو روپے دے دیے ہیں اور اس کی رسید اس خط کے ساتھ رکھ دی ہے کچھ دن سے مجھے یہ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں اس لیے تین ماہ قبل میں نے ایک وصیت تیار کرائی تھی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں یہ میری باقاعدہ وصیت ہے اور اسی کو میرا قانونی وصیت نامہ تصور کیا جائے۔ وصیت نامہ تجوری میں رکھا ہوا ہے۔ تجوری کی چابی اس خط کے ساتھ ہے۔ تجوری میں ایک سو پچھتر روپیہ آٹھ آنے چھ پیسے کی کل رقم بھی ہے۔ تجوری، وصیت نامہ اور مذکورہ رقم کو میرے داماد عزیزی کرشن جی سوامی رائے کلکرنی اپنے قبضہ میں لے لیں۔ اس رقم سے میری اہلیہ کا کریا کرم کرایا جائے ہر قسم کے تمام اختیارات اُسی کو حاصل ہوں گے۔ یہ تحریر لکھتے وقت میں اپنے پورے ہوش و حواس میں ہوں اور میں نے کسی نشہ آور چیز کا استعمال نہیں کیا ہے۔"

تحریر کے نیچے راگھپا کے دستخط تھے اور گزشتہ دن کی تاریخ پڑی تھی۔ وہی تاریخ لکڑی کی ٹال کی رسید پر بھی پڑی تھی۔ لکڑی کی ٹال والے نے بتایا "راگھپا جی نے روپیہ دے کر کہا کل دو گاڑی لکڑی چاہیے ہم سمجھے سال بھر کے استعمال کے لیے چاہیے ہوگی اس لیے ان کے کہلواتے ہی لکڑی بھیج دی جائے گی۔"

راگھپا کی اس تحریر کی وجہ سے پولیس والوں نے زیادہ تفتیش نہیں کی۔ کمرہ کا دروازہ اندر سے بند ہونے کی وجہ سے پولیس کو اندر داخل ہونے کے لیے دروازہ توڑ دینا پڑا تھا اس لیے انھوں نے کسی قسم کے شک اور شبہ کا اظہار نہیں کیا۔

کٹی نے دیسائی جی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ دیسائی جی بولے "تم نے جو خط لا کر دیا تھا وہ میں تمہیں دکھا دوں گا لیکن اس کا ذکر یہاں نہ چھیڑنا۔ اس سے آگے اور آفت کھڑی ہو سکتی ہے۔"

پولیس والوں نے "سبب" کے کالم میں بیوی کی موت اور دوسری پریشانیاں تحریر کر دیا اور لاش کو اس کے وارث کٹی کے حوالے کر دیا۔ لاش کو دیکھ کر دیسائی جی نے کہا "کسی لڑکی کو لاش نہ دکھائی جائے۔" کٹی نے بھی ڈرتے ڈرتے ایک ہی نظر ڈالی تھی۔ خوبصورت چہرہ پر بھنچے ہوئے ہونٹ ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ کسی سے جھگڑا کرنے کو تیار ہو۔ ایک آنکھ دوسری کے مقابلے میں ذرا زیادہ باہر نکل آئی تھی۔

دیسائی جی نے کٹی کو تاکید کی کہ کسی کو لاش کے قریب نہ آنے دے اور وہ خود دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک گھنٹے کے اندر لاش شمشان پہونچ گئی۔ راگھپا کی موت کے بارہ دن

بعد کٹی کو دیسائی جی نے اپنے گھر بلاکر راگھپا کا بھیجا ہوا یہ خط دکھایا:

شریمان بہادر دیسائی جی کی خدمت میں راگھپا کا مؤدبانہ آداب۔ آپ کی محبت اور شفقت کی وجہ سے دو باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ مجھے شکست سے ڈر لگتا ہے۔ میں یہاں آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں کہ میں آپ سے ہارا نہیں ہوں۔ آپ نے اپنے بیٹے اچیوت کے خط میرے پاس بھیج کر مجھے ڈرانے کی کوشش کی لیکن اگر آپ سوچتے ہیں کہ میں ان سے ڈر گیا تو آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے میں اسے ثابت کرکے دکھاتا ہوں۔ آپ کو اگر میں کمینہ نظر آتا ہوں تو مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے میں ہمیشہ اپنے ہی اصولوں پر چلا ہوں۔ میں آج کسی پچھتاوے کے بغیر پاپ پن سے بلند ہوکر غیر جانبداری سے اپنے افعال کا محاسبہ کر رہا ہوں۔ آج زندگی کے متعلق اپنے پہلے نقطۂ نظر کا زیاں مجھے دُکھ دیتا ہے۔ جب سے ضمیر نے مجھے ستانا شروع کیا ہے تب سے گویا میری طاقت گھٹ کر آدھی رہ گئی ہے۔ اگر مجھ میں پہلے کی طرح نڈر ہوکر کام کرنے کی طاقت ہوتی تو آگے جو واقعات پیش آئے وہ سامنے نہ آتے۔ جب میرا ضمیر بیدار ہوا تبھی آپ نے اپنے بیٹے اچیوت کا خط بھیج کر مجھے ماضی کی یاد دلاکر نیچے گرانے کی کوشش کی۔ اگر میں پہلے جیسا راگھپا ہوتا تو میں ان خطوط سے کبھی نہ گھبراتا۔ خیر گھبرایا تو اب بھی نہیں۔ ان خطوط میں میں اپنے آپ کو دیکھ کر پچھتایا ضرور۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ویسے ان خطوط کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں ہے۔ مثال کے لیے آپ چاہیں تو پونا جاکر دس سال تک تلاش کریں لیکن مجھے نقصان پہنچانے والی کوئی بھی چیز آپ وہاں ڈھونڈھ نہ پائیں گے۔ یہ بات میں خود ہی آپ کو لکھے دیتا ہوں اس سے آپ کو حقیقت حال کا علم ہوجائے گا اور یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ مجھے آپ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس سے آپ کو میری خامیوں کے ساتھ ساتھ میری خوبیوں کا بھی پتہ چل جائے گا ہماری آبائی زمین ساری کی ساری گروی پڑی تھی۔ ہم لوگوں نے کسی طرح دھارواڑ میں چار جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ یہاں نوکری نہ ملنے کی وجہ سے میرا دینکائی کے پاس پونا جانا آپ کو اپنے بیٹے کے خطوط سے معلوم ہی ہوچکا ہے۔ اس وقت میری شادی کو دو سال ہوچکے تھے۔ کئی باتوں کی وجہ سے (شاید وہ بھی آپ کے علم میں ہوں) نوکری لگنے سے پہلے ہی مجھے شادی کرنی پڑی تھی۔ شادی کے سال ہی میں ہماری رتنا پیدا ہوئی۔ آمدنی بہت کم تھی۔ اس طرح انتہائی افلاس کی حالت میں نوکری ڈھونڈھنے میں پونا پہونچا۔ پونا میں نوکری کے لیے دفتروں، بنکوں وغیرہ کے چکر کاٹے اخباروں میں اشتہارات دیکھتا رہا۔ اس طرح وہاں ایک ہفتہ گزر گیا۔ نوکری ملنے کی کوئی

امید پیدا نہیں ہوئی۔ وینکاٹی کی طرح چوکیدار بننا میرے بس کی بات نہ تھی۔

وینکاٹی کے چیک تڑوا کر لانے کے اگلے دن صبح میں نے اخبار میں تعظیم الدین ڈرائیور کے بارے میں ایک خبر پڑھی۔ اخبار کے کونے میں چھپا تھا کہ اس نے گزشتہ دن لکشمی روڈ پر ایک بڈھے پر موٹر چڑھا دی تھی اور اسے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ وینکٹ رائے اخبار پڑھنے والا آدمی نہ تھا۔ اگر بھولے بھٹکے کبھی پڑھ بھی لیتا تو کونے میں چھپی ہوئی خبروں کو پڑھ لینا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے اس حادثہ کا وینکاٹی کو پتہ چل جانا ناممکن تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اس اچھے موقع کو اپنے پیٹ کی خاطر ضایع نہ ہونے دیا۔ وینکاٹی جب پوجا پر بیٹھا تھا تب اسے یہ بتایا کہ تعظیم الدین آیا ہے اور اس سے چابی لے کر دو ہزار روپیہ میں نے اٹھا لیے بھگوان آپ پر ایسا وقت نہ ڈالے کہ آپ اپنی بیوی اور بچوں کو فاقہ کرتے ہوئے دیکھیں لیکن ایسی حالت میں اس قسم کی حرکتیں کرنے والے کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے بہرحال اس بات کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ چیک جعلی ہو سکتا ہے۔ وینکٹ رائے اس کے متعلق تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ میں واپس دھارواڑ آیا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی مجھے وینکاٹی کا خط ملا۔ خط سے معلوم ہوا چیک جعلی تھا اس لیے پولیس نے حراست میں اسے لے رکھا ہے۔ پونا جا کر کسی طرح وینکاٹی کو جیل سے بچانے کے لیے وکیل سے مشورہ کر کے تمام ضروری کاغذات تیار کرائے۔ میرا بہنوئی ہمت کر کے ضمانت دینے آگے آیا۔ میں ضمانت نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میری زمین گروی پڑی تھی۔ وہ دو ہزار روپیہ میرے پاس ویسے کے ویسے ہی پڑے تھے۔ سوامی رائے کو ساتھ لے کر میں پونا گیا وہاں جا کر وینکٹ رائے کو چھڑایا۔ سوامی رائے نے اس کی پانچ ہزار روپیہ کی ضمانت دی تینوں دھارواڑ واپس آئے۔ وینکاٹی سوامی رائے کی نگرانی میں انھیں کے گھر رہنے لگا۔ اوپر سے ہمت دکھانے والا سوامی رائے وینکاٹی کا دیوانہ پن دیکھ کر اندر ہی اندر ڈرا ہوگا کیونکہ اس نے مجھے بتائے بغیر وینکاٹی سے کہا تھا "میں نے تمہاری ذمہ داری لی ہے تم اپنے حصہ کی جائداد میرے نام لکھ دو" آپ کو جو ہبہ نامہ ملا ہے وہ تیار کرا کے سوامی رائے نے وینکاٹی سے دستخط کرنے کو کہا لیکن وینکٹ رائے ضد پکڑ گیا کہ اگر میرا بھائی دستخط کرے گا تو میں بھی دستخط کر دوں گا ورنہ نہیں، اب سوامی رائے مجھے بلا کر بولے "تمہاری جائداد کے لالچ میں نہیں بلکہ اس کی ذہنی کیفیت کی وجہ سے میں ہبہ نامہ چاہتا ہوں" پانچ ہزار کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ مجھے بھی بات صحیح لگی میں نے اس پر دستخط کر دیے۔ میرے دستخط کرنے کے بعد وینکاٹی نے بھی دستخط کر دیے۔

اس پر بھی وینکا ٹی کی چیر پھاڑ بند نہ ہوئی۔ وینکا ٹی عجیب و غریب شخص تھا۔ پتہ نہیں کیوں اُسے جائداد کا لالچ ہو گیا تھا۔ "مجھے دھوکا دے دیا، ہائے میری جائداد" یہ کہہ کہہ کر دن رات لڑتا تھا جیسا کہ آپ کے بیٹے نے اندازہ لگایا ہے میں نے وینکا ٹی سے ہبہ نامہ واپس لینے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ غصہ میں آکر خود سوامی رائے نے اصل کو نقل سمجھ کر ایک دن وہ ہبہ نامہ اس کے منھ پر کھینچ مارا تھا۔ وینکٹ رائے اُسے لے کر میرے گھر پہنچا اور میرا دماغ کھانے لگا کہ اسے وکیل کو دکھا کر کسی طرح میری جائداد واپس دلاؤ۔ میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی "کل وکیل کے پاس چلیں گے"۔ اس کاغذ کو دیکھتے ہی میں پہچان گیا تھا کہ یہ نقل نہیں ہے بلکہ اصل کاغذ ہے۔ حیرت کے مارے یا وینکا ٹی کی بک بک سے تنگ آکر میرے منھ سے یہ بات نکل گئی "تم کیوں فکر کر رہے ہو۔ یہ تو انھوں نے اصلی ہبہ نامہ ہی دے دیا ہے۔ تم اسے واپس نہ کرنا، تمہارے جائداد تمہیں مل جائے گی"۔ ایسا لگا کہ اس دیوانے کو یہ بات سن کر کسی قدر تسلی ہوئی۔ اس کے بعد رات کا کھانا کھایا۔ میری بدقسمتی کہ میں نے اُسے کھانا کھلا کر اپنے ہی گھر سلا لیا۔ اسی رات گاؤں کے کسی آدمی نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ وینکا ٹی چلایا۔ پولیس آگئی مجھے پکڑلے گی اور پچھواڑے کی طرف بھاگا۔ . . . . میں یہ سوچ کر کہ یہ کہاں جائے گا، آنے والوں کے استقبال میں لگ گیا لیکن اس دن کے بعد وینکا ٹی کی خبر دوبارہ آپ کے خط ہی سے ملی۔

وینکا ٹی کے یہاں تصور اور حقیقت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اصل ہبہ نامہ مل جانے سے یا پولیس کے ڈر سے وہ بھاگ نکلا، یہ میں آج تک نہیں سمجھ پایا۔ دونوں ہی باتیں ممکن ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری بہن کا گھر اجڑ گیا۔ بہن بیوہ ہو گئی اور اس سب کی بدنامی میرے اوپر آئی۔ اگر میں نے خود اپنے بہنوئی کو اجاڑا ہوتا تو مجھے دُکھ نہ ہوتا۔ آپ نے وہ مشہور کہانی سنی ہی ہوگی کہ بچے کے منھ میں دودھ دے کر سوئی ہوئی ماں جب جاگی تو دیکھا کہ بچہ دم گھٹ جانے سے مر چکا تھا. . . . میری پوزیشن بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ جس زمانے میں یہ واقعات رونما ہوئے اس وقت میں ہر طرح سے کمزور تھا —— ان دو ہزار روپیوں کا عذاب مجھ پر پڑ گیا۔ سوامی رائے کی دوستی ایک مہینہ کے اندر ہی اندر ختم ہو گئی۔ وہ گھل گھل کر مر گیا۔ گھر پہلے ہی اجڑ چکا تھا۔ ان دو ہزار روپیہ سے میں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن گنگوا مجھے کتے کی طرح دھتکارتی رہی۔ میرے گھر سے وینکا ٹی کا فرار ہو جانا ہی مجھ سے اس کی نفرت کا سبب بن گیا۔

بہن سے منھ چھپا کر میں گاؤں میں رہنے لگا۔ کھیتوں کو چھوڑ کر کام شروع کیا۔ گھر کی

حالت سدھر گئی۔ میں بھی ٹھیک سے زندگی گزارنے لگا۔ اب میں نے زندگی کا یہ اصول بنایا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی مات نہیں کھاؤں گا۔ جس کام کو ہاتھ میں لوں گا، چاہے وہ جیسا بھی کام ہو، اُسے دل سے اور پوری قوت سے کروں گا۔ کامیابی کے لیے ہار جیت کا احساس، ڈر اور شرم سبھی کمزوریوں سے دور رہوں گا۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر میں نے ہر کام میں جائز اور ناجائز کے سوال کو ہمیشہ اپنے سے دور رکھا۔ غیر جذباتی ہو کر کام کو پورا کرنا ہی میری زندگی کا اصول بن گیا تھا اسی لیے میرا نام "بھاری" پڑ گیا۔

دوبارہ دھارواڑ آنے کے بعد میں نے پوری کوشش کر کے عزیزی کرشن کو اپنی بیٹی دی۔ میرے بے شمار مقاصد میں پرانی رنجش کو ختم کر کے گنگوا کے ساتھ دیرینہ تعلقات کی بحالی بھی شامل تھی لیکن اس کی ضد اور گھمنڈ میرے کمینہ پن کے لیے تازیانہ ثابت ہوئے۔ اس کی حقارت نے میرے اندر ضد کو جنم دیا۔ میں نے اس کی بات کو کاٹ کر یہ شادی کرائی۔ اس معاملہ میں آپ کو بھی درمیان میں ڈالا۔ کیا آپ نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اس میں آپ دھوکا کھا گئے۔

اب رہی میری دوسری شکست کی بات۔ مجھے معلوم تھا کہ بردکشنا کے لیے روپیہ کم ہو جائیں گے۔ عزیزی کرشن کے روپیہ آپ کے پاس جمع ہیں۔ یہ جان لینے کے بعد میں نے سوچا کہ پانچ سو روپیہ آپ سے پورے کرالوں لیکن آپ اس چکر میں نہ پھنس سکے، پھر بھی آپ میری ذہانت کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے ـــــ لیکن کرنا کچھ چاہتا تھا ہو کچھ گیا! میری محبوبہ، میری نادانستگی ہی میں ان پانچ سو روپیوں کو پورا کرنے کی کوشش میں موت کا نوالہ بن گئی۔ مجھے اس کی موت کا اب بھی غم ہے۔ میرے زوال کے زمانے کی اس دوسری شکست نے میری کمر توڑ دی۔ میں کچھ اور بھی کر سکتا تھا۔ محبوب کی موت کا جتنا غم مجھے ہوا ہے اُسے آپ جیسے معزز حضرات سمجھ نہیں سکتے لیکن مجھے تو اس غم نے تین مہینے میں ہی بوڑھا کر دیا۔ کام پر میری گرفت ہی ڈھیلی پڑ گئی میں ایک مختلف راگھیا بن گیا۔ میری مٹھی ڈھیلی پڑ گئی۔

پانی میں پتھر پھینک کر اگر ہم چاہیں کہ لہریں ہماری جانب چلی آئیں تو کیا لہریں ہماری بات سنیں گی میری اس بات کو آپ شاعری نہ سمجھیں لیکن میرے اپنے تجربات کے نتیجہ میں اور میں نے جو کچھ کیا ہے اس کا جو پھل مجھے ملا ہے اس کی روشنی میں بار بار یہ سوال میرے سامنے آتا ہے۔ کچھ کرنا چاہو اور کچھ ہو جائے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا بھگتنے والا کون ہے؟ میں تجربہ کی بات کر رہا ہوں فلسفہ نہیں بگھار رہا۔ البتہ تجربہ سے ہی علم کی طرف رسائی ہوتی ہے۔ میرا دل جو

اب نرم پڑ چکا ہے ساری پرانی باتوں کو یاد کر کے رنجیدہ ہو رہا ہے میں بے سکت ہو چکا ہوں میرا بدن ابھی کمزور نہیں ہوا ہے لیکن اگلے زمانے کی وہ 'دُھن'، اور 'لگن'، جو میرے کام کرنے کی خصوصیت تھی برابر گھٹتی جا رہی ہے۔ اب ایک بات اور سنیے ــ مجھے کام کرنے میں کوئی تساہل نہیں ہوتا لیکن ہر کام سے ایک ڈر سا لگنے لگا ہے۔ کوئی کام کرنے جاؤں اور کچھ ہو جائے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ دل میں اس وسوسے کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اگر کسی کام کا نتیجہ منشا کے خلاف نکلا تو؟ لیکن مقدر سے کس کو رستگاری ہے؟ اسی واسطے اب پہلے سے سوچ سمجھ کر کوئی کام قبول کرنے کی عادت میں نے چھوڑ دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دل میں نہ چاہتے ہوئے بھی نئی نئی خواہشات جنم لینے لگیں۔ میرے ڈر نے ایک شکل یہ بھی اختیار کی کہ میری بہن کو میری دولت نہ ملنے پائے۔ اس مقصد سے بیوی کی جان کو ہلاکت میں ڈال کر بیٹا حاصل کرنے کی کوشش کی میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن قسمت نے جیسے میری کاٹ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ لہٰذا اب کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔

آپ نے وہ خط بھی مجھے ایک بہت برے وقت پر بھجوائے۔ پرانی یادیں اور واضح شکل میں سامنے آئیں تو میں ڈرپوک سا ہو گیا۔ کاموں کے نتائج حسب خواہش نہ نکلنے کی وجہ سے میں خوفزدہ ہو گیا۔ میری بہن جس دن اپنے گھر سے آپ کے گھر بھوکی پیاسی پہونچی تو میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں بیٹی کو اسے منانے کے لیے نہیں بھیجا بلکہ اس وجہ سے کہ گنگوا کے لیے میرے دل میں بھی رحم ہے۔ میں اس کا بھوکا پیاسا رہنا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میری آخری ہار ــ میری بیوی کی موت ــ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی بھگوان گمراہی کے وسیلہ سے ہدایت کی طرف لے جاتا ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے ہزار ڈھنگ سے پیار کیا آپ کو اس کا تجربہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب مجھے پتہ چلا کہ اس سے بھی ہزاروں گنا زیادہ پیار ہو سکتا ہے جب میں نے اس کے ساتھ ناانصافی کی، جب اس نے درد سہے۔ لیکن یہ سب اس نے کتنی خاموشی سے برداشت کیا اور آخر کار چل بسی۔ تب میرے جیسے شخص کا دل بھی رحم، ممتا، شفقت سے بھر گیا سمندر کی لہروں سے اٹھنے والا رحم۔ بے کنار! مجھے یقین ہے کہ سادھو ؤں سنتوں نے بھی اسی طرح بھگوان سے پیار کیا ہوگا۔ کتنے ہی آنسو بہہ جائیں یہ دریا ختم نہیں ہوتی۔ جسم ایک ہو جائے لیکن یہ ممتا ختم نہیں ہوتی میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرے دل میں اپنی بیوی کے لیے بے پناہ اور شدید پیار پیدا ہو جائے گا۔ ویسے میری شادی لمحاتی لذت کوشی کے نتیجہ میں ہوئی تھی۔

اب میں آخری بات پر آتا ہوں۔ آپ کا بیٹا وسنت جراءت اور استقامت سے بالکل محروم ہے۔ مار سے ڈر گیا۔ آپ کو چھوٹے چھوٹے نقصانات پہنچا کر مجھے اطمینان نہیں ہوا لیکن وسنت میں ہمت ہی نہیں۔ اگر اس میں ذرا بھی جراءت ہوتی تب آپ میرے اصلی ہاتھ دیکھتے آپ کی نظروں کے سامنے میں اپنی بیٹی کی اس سے شادی کرتا اور پھر اس کا حصہ دلانے کے لیے آپ کو عدالت کے کٹھرے میں لا کھڑا کرتا لیکن آپ کے وسنت جیسے ڈرپوک حریف کو لے کر اکھاڑے میں اتارنا میری حماقت تھی۔

آپ کے وسنت کو میں اپنی بیٹی دینا چاہتا تھا لیکن جس وقت میں اپنی بیوی کو لے کر اسپتال گیا ہوا تھا اس وقت وسنت نے اس کی عصمت لوٹ لی۔ کچھ دن میں ہی اس بات کا چرچا ہر طرف ہو جائے گا، اس میں مطلق شبہ نہیں ہے۔ لیکن اس معاملہ میں آپ سے میں کوئی درخواست نہیں کروں گا۔ اتنے دن میں نے آپ سے نفرت کی ہے۔ اب آپ کو بھی ایک موقع ہاتھ آجائے گا۔ پھر یہ شانتا کی اپنی غلطی بھی ہے۔ میں نے بھی اپنی بیوی کی عصمت لوٹ لی تھی لیکن میری بیوی نے مجھ سے پیار کیا تھا۔ میری بیٹی اور میری بیوی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اب اسے اپنی بے وقوفی کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ وہ جب چاہے میرے پاس آسکتی ہے۔ میں اس کے لیے عملی نمونہ چھوڑے جا رہا ہوں۔

میں آج رات ڈھائی بجے تمام کاموں سے فارغ ہو جاؤں گا۔ اس سے پہلے اگر میں کہیں ہارا ہوں تو آپ سے نہیں۔ یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ میرا آخری کام ہے۔ آپ کی مہربانیاں میرے اوپر رہیں اسی طرح! فقط

آپ کا پرانا حریف
راگھپا

37

خانمہ اور اچھوت کا تیسرا خط

راگھپا کی موت کے چھ مہینے کے اندر ہی کٹی کے گھر کا ماحول بدل گیا۔ راگھپا کے وصیت نامے میں یہ بات واضح طور پر تحریر تھی کہ "اگر میرے یہاں لڑکا پیدا ہو تو خیر لیکن اگر لڑکی پیدا ہو تو

میں کٹی کو متبنیٰ کروں یا نہ کروں میری ساری جائداد کٹی کو ہی ملے گی کیونکہ اسی کو گود لینے کا خیال ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں پاگل نہ ہو جاؤں اگر ایسا ہو جائے اور میں اسے گود نہ لے سکوں تو بھی میری جائداد کا مالک وہی ہوگا" اس کے علاوہ یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اگر وینکٹ رائے اپنا حصہ مانگے تو دے دیا جائے۔ شانتا کی شادی کر دی جائے اور جو بچہ پیدا ہو اس کی پرورش کی جائے اگر بیوی زندہ بچ جائے تو اس کی بھی کفالت کی جائے۔"

برہمنوں کے مشورہ کے مطابق کٹی راگھپا کا گھر چھوڑ کر شانتا کو ساتھ لے کر اپنے ہی گھر میں رہا۔ اس کے بعد راگھپا کے گھر میں پوجا وغیرہ کرا کر وہیں منتقل ہو گیا۔ اس کے دل پر ان تمام واقعات نے ہتھوڑے کی طرح ضرب لگائی تھی اور اس کا ذہن پراگندہ سا ہو گیا تھا، اب وہ کافی فعال ہو گیا۔ پوجا پاٹ کے سلسلہ میں بھائیں بھائیں کرتے ہوئے گھر میں پڑھے گئے منتروں سے سکون قایم ہوا۔ اسے بھی اس سے بہت سکون محسوس ہوا۔ وہ بہت زیادہ گہرائی سے سوچنے والا آدمی نہ تھا۔ بہرحال اب اس کے معمولات بدل گئے تھے۔ اس میں ایک مذہبیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سینما کے بجائے کیرتنوں اور دھارمک کتھاؤں میں جانے لگا۔ ہر مہینے دو مہینے بعد ستیہ نارائن کی کتھا پابندی سے ہونے لگی۔ چائے کی دوکان پر جانا اس نے قطعی بند کر دیا۔ جارج کے ساتھ دوستی بھی برائے نام رہ گئی۔ اس نے ان کے گھر چائے پینا بھی بند کر دیا۔ بال ہلکے کرا لیے اور چوٹی بڑھالی "شالگ رام کی مہیما" نامی مراٹھی کتاب چھ پیسے میں خریدی اور روزانہ اُسے پڑھ کر شالگ رام پر پانی چڑھانے لگا۔ وہ روزانہ آدھا گھنٹہ 'سندھیا وندن' بھی کرنے لگا۔ اس سے اس میں چستی پیدا ہوئی۔ گھر میں اُسے منتر پڑھتے دیکھ کر سب اس کی عزت کرنے لگے۔ کچہری میں گپ بازی بند ہو جانے کی وجہ سے کام بھی ٹھیک ہونے لگا۔ کام کی طرف ساری توجہ ہونے سے بہت سی باتیں جو پہلے اس کی سمجھ میں نہ آتی تھیں وہ آسانی سے سمجھ میں آنے لگیں۔ ہاتھ میں پیسہ بھی رہنے لگا۔ چہرہ بھی پوجا کی وجہ سے چمکنے لگا، جسم بھی گداز ہو گیا۔ کٹی کی زندگی میں ایک توازن پیدا ہو گیا۔

کٹی نے اپنی افتاد اور رجحان کو سمجھا۔ وہ ایک عام آدمی تھا۔ اس سے آگے بڑھنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ بیس سال گزر جانے پر بھی اس کی زندگی میں کسی تبدیلی کے پیدا ہونے کا امکان نہ تھا۔

رتنا کی قیمت اور گھٹ گئی۔ ماں باپ کے مرنے پر "میں تیری ماں نہیں ہوں کیا؟" کہنے والا بھی کوئی نہیں ہے، اس احساس سے اس میں نیازمندی پیدا ہو گئی۔ کبھی کبھی سوتے وقت ساس کو دودھ

کا کٹورا لے جا کر دیتی اور پینے پر اصرار کرتی۔ شوہر کا احترام سب کو کرتے دیکھ کر اس کے دل میں بھی شوہر کا احترام پیدا ہوا۔ اب کٹی اس کے لیے صرف شوہر نہ تھا گرو بھی تھا۔ کچھ دن میں رتنا بھی منھ پر ہلدی لگانے لگی اور تلسی کو پانی دینے لگی۔ لڑکا حاصل کرنے کے لیے گنگوا کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل شروع کر دیا۔ نیم ہو کر رہتی ہوئی رتنا شانتا گنگوا کو اپنے بچوں کی طرح ہی نظر آئیں۔ اس نے ان کی ذمہ داری لے لی۔ راگھپا کا ظالم وجود درمیان سے اٹھ جانے سے گنگوا کو سب سنسان سا لگنے لگا۔ کچھ دن تک اس کے دل میں یہ ڈر رہا کہ راگھپا بھوت بن کر اُسے دبوچنے لگا۔ چار پانچ دن تک اُسے ڈراؤنے خواب نظر آئے لیکن گنگوا نے راگھپا کی بیٹیوں سے پیار کر کے اس ڈر کو بھگانے کا جتن کیا۔ دیسائی جی نے جب اس سے کہا "گنگوا اب دل کو سچ مچ مہربان بنا لینا چاہیے" تو وہ بولی "گوپنا، ان میں سے کوئی بھی میرے لیے پرایا نہیں ہے"۔ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ گھر میں سب کی عزت ملنے سے اُسے ایک مہینے میں بہت سکون ملا۔ بدری ناتھ جانے والی گنگوا کا دل اب اس سکھ کو دیکھ کر دنیا کی طرف مائل ہو گیا۔ خوش قسمتی سے گنگا مائی اپنے آپ چل کر وہاں پہونچ گئی۔ کاشی میں یہ لوگ جن کے ہاں ٹھہرے تھے ان میں سے دو حضرات رامیشورم کی یاترا کرنے نکلے راستے میں اپنے مہمانوں کے یہاں قیام کرتے، دکشنا پاتے، دھارواڑ میں وارد ہوئے۔ وہاں وہ اپنے خصوصی مہمان دیسائی جی کا گھر تلاش کر کے ان کے یہاں پہونچے۔ دیسائی جی نے گنگوا کو بھی کہلا بھیجا۔ گنگوا کٹی کو ساتھ لے کر پہونچی اور ان لوگوں کو رات کے کھانے پر بلایا۔ دعوت کے بعد ایک روپیہ دکشنا بھی کٹی کے ہاتھ سے دلوائی۔ ان سے آٹھ آنے کا ایک بوتل گنگا جل لے کر بھگوان کی پوجا کے لیے رکھ لیا۔ اس طرح گنگا مائی خود ہی اس کے گھر پہونچ گئی۔

اچیوت راؤ دیسائی جی کا خط پا کر پونا جانے کے بجائے دھارواڑ آیا۔ اس نے اپنے سے پہلے وسنت کی شادی کرنے کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ وسنت نے شانتا سے شادی کرنے کی دیسائی جی کی تجویز کو خوشی سے قبول کر لیا۔ راگھپا کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے دیسائی جی نے اُس کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لیا۔ اس سے لوگوں نے انھیں سچا انسان، مہان آدمی کہا۔ شادی کی تاریخ وغیرہ طے کرا کے اچیوت پونا چلا گیا۔ وینو بائی کو اس کا بڑا دکھ ہوا۔ اُسے یہ شادی اپنی توہین معلوم ہوتی تھی۔ دس ایکڑ کھیت کے مالک راگھپا کی بیٹی اور خودکشی کرنے والے شخص کی بیٹی اس کی بہو بنے! دو پیسے بر دکشنا بھی نہیں! پھر بڑے بیٹے اچیوت سے پہلے چھوٹے بیٹے کی شادی! یہ سب باتیں اس کے دل کو تڑپاتی تھیں۔ کبھی کبھی کھانا کھانے کے بعد جب وہ پان سپاری کھانے بیٹھتی تو یہ سب سوچ کر

روپڑتی ۔ دیسائی جی اسے دلاسا دینے کی کوشش ہی نہ کرتے کیونکہ یہ رونا کبھی ختم ہونے والا نہ تھا
شادی طے ہو جانے کے بعد شانتا گلے میں وسنت کا دیا ہوا موتیوں کا ہار اور محبوب جان کا دیا ہوا چندر ہار پہن کر محلے کی سہیلیوں سے ملنے گئی
دیسائی جی نے کٹی اور گنگوا دونوں کو بٹھا کر ان کا حساب پڑھ کر سنایا اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ 'اب میں اس پیسے کا بوجھ نہ اٹھا سکوں گا، کٹی نے اب تک جو ہوا تھا اُس کے لیے ان سے معافی مانگی اور پوچھا "اس پیسے کا کیا کیا جائے ؟ یہ بتا دیجیے ۔قرض میں خود ادا کر دوں گا" اس پر دیسائی جی نے اسے سمجھایا کہ قرض فوراً ادا کر دینا چاہیے اور باقی پیسہ گنگوا کے نام سے ڈاکخانے میں جمع کر دینا چاہیے ۔ ایسا ہی کیا گیا۔ گنگوا کے نام سے بارہ سو روپیہ ڈاکخانے میں جمع کر دیے گئے ۔کٹی کو بھی قرض سے نجات مل گئی۔
جوشی رام رائے، جارج واشنگٹن گمبارگنوی کی دیانت داری کے سبب کس طرح اپنے عہدے سے ہٹا یہ ایک طویل داستان ہے ۔ اس کے تبادلے کے بعد جارج پہلے ایکٹنگ ہیڈ کلرک بنا لیکن بعد میں اعلیٰ افسروں کی منظوری حاصل ہو جانے پر اس عہدے پر مستقل کر دیا گیا۔ اس کے یہاں اسٹیفن کے بعد ایک اور لڑکا پیدا ہوا ۔۔ سیموئل ! سارتما سے رتنا کی اکثر ملاقات ہو جاتی تھی اور رتنا اس کے بچوں کو گود میں لے کر خوب پیار کرتی تھی۔
پونا جا کر اچیوت نے دیسائی جی کو یہ خط بھیجا:
از پونا

محترم والد صاحب کی خدمت میں آداب ۔ اپنی حماقت پر مجھے ندامت ہوتی ہے ۔ اگر تھوڑی سی عقل سے کام لیتا تو آدھا معاملہ بمبئی میں بیٹھے بیٹھے حل ہو جاتا۔ بمبئی میں میرے کئی گجراتی اور مارواڑی دوست ہیں ۔ ان کے طور طریقوں اور رسم و رواج سے میں واقف ہوں ۔ یہ لوگ بہت دولت مند اور تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے قاعدے قانون سے بہت ڈرتے ہیں ۔ اس بات کو جانتے ہوئے بھی میں نے اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔
پونا میں سیٹھ تخت رام اب بھی ہیں ۔ ان سے ملاقات بھی ہوئی ۔ انھیں یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ اُن کے وہاں وینکٹ رائے نامی شخص ملازم تھا۔ چیک کی جعل سازی کے بارے میں دریافت کرنے پر انھوں نے اڑتا اڑتا سا جواب دیا۔ کہنے لگے "میں ہی بھول گیا۔ چیک تو ٹھیک تھا۔ اس لیے کیس واپس لے لیا تھا" سیٹھ جی کو میں نے آگے کی کہانی نہیں سنائی ۔ اگر

ضرورت پڑی تو سارے واقعات بتا کر ان کی گردن پکڑ لوں گا۔ میں نے سوچ لیا ہے۔

اس سلسلہ میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ حساب میں کمی بیشی کا پتہ چلتے ہی سیٹھ جی نے بغیر سوچے سمجھے پولیس میں رپورٹ کر دی۔ جب پولیس نے تفتیش شروع کی تو انہیں جب یہ احساس ہوا کہ سارا الزام ان کے بیٹے پر آرہا ہے تو انھوں نے کیس واپس لے لیا۔ سب ہی سیٹھوں کے لڑکے اپنے بچپن میں اس قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو اپنے باپ کے کاروبار کو ان سے بھی اچھی طرح سنبھال لیتے ہیں۔ ان لوگوں میں یہ ایک عام بات ہے۔ اب سیٹھ جی کی دوکان پر ان کے نام کے بورڈ کے ساتھ ساتھ ان کے بیٹے بابو بھائی کے نام کا بورڈ بھی لٹکا ہوا ہے۔ بیوپاری سیٹھ کو یہ منظور نہ تھا کہ اس کا بیٹا فوجداری عدالت کے کٹہرے میں صرف گواہی دینے کے لیے کھڑا ہو۔ یہ بات ان کے تاجرانہ مسلک کے خلاف تھی۔ اس سے تو ان کی ساکھ بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ کہہ کر کہ چیک صحیح تھا ان سے غلط فہمی ہو گئی یا کوئی اور راستہ اختیار کر کے مزید کسی جھنجھٹ کے بغیر اس قصّہ سے نجات پالی ہو گی۔ تعظیم الدین کو ڈرا دھمکا کر یا اس کی مٹھی گرم کر کے بھگا دیا ہو گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ کچھ دن تک مقدمے میں تاریخیں بڑھوانے کے بعد مقدمہ دائر کرنے کی وجہ کو غلط ثابت کر کے کیس کو وہیں ختم کرا دیا ہو گا۔

مجھے لڑکا سمجھ کر سیٹھ جی نے زیادہ بات نہیں کی۔ اپنی اس طرح توہین کیے جانے کے سبب میں نے بھی مزید واقعات نہیں بتائے اور بات وہیں ختم کر دی۔ اس لیے آپ کو ہی بمبئی آنا پڑے گا۔ سیٹھ "اچھے" آدمی ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ چیک کے اس معاملے میں کیسی بربادی ہوئی ہے تو وہ خود آگے بڑھ کر مدد کریں گے۔ ان سے کیس کا نمبر ہی معلوم ہو جائے، یہی بہت ہو گا۔ آگے کا راستہ ہم خود ڈھونڈھ لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ سوامی رائے کو جو نقصان ہوا ہے اُسے ہم حکومت سے پورا کرا سکتے ہیں کیونکہ سوامی رائے سے بحیثیت ضامن حکومت نے پانچ ہزار روپیہ وصول کیے۔ آگے چل کر وہی معاملہ جھوٹا ثابت ہو گیا اور کیس ختم ہو گیا لیکن چونکہ مقدمہ کا فیصلہ معلوم نہیں ہوا اور کسی نے اس رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا اس لیے یہ رقم اب بھی سرکار کے پاس جمع ہے۔ اس حالت میں سوامی رائے کے وارث کرشنا جی سے اب اس رقم کے ری فنڈ کے لیے درخواست دلائی جا سکتی ہے۔ ساتھ ہی وینکٹ رائے کو بھی اب روپوش رہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ پولیس سے بے خوف ہو کر آزادانہ طور پر گھوم پھر سکتا ہے۔

اس کام میں ہمیں سیٹھ تخت مل کی مدد درکار ہے۔ وہ میں حاصل نہ کر سکوں گا اس لیے

آپ کو ہی بمبئی آنے کی زحمت کرنا ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے آنے سے یہ کام بن جائے گا۔ آپ یہاں آجائیں تو میں آپ کو اپنے ایک نوجوان وکیل دوست سے ملادوں گا۔ اگر ضرورت ہو تو آپ اسے اپنے ساتھ پونا بھی لے جاسکتے ہیں۔

ماتاجی کی خدمت میں میرا دست بستہ آداب کہیے۔ انھوں نے مجھ سے اصرار کیا تھا کہ وسنت کی شادی کے موقع پر میں بھی اپنی شادی کرلوں۔ میں نے اس وقت سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس وجہ سے وہ مغموم ہوں گی۔ انھیں تسلی دے دیجیے گا۔ اپنے اگلے خط میں ان کے ہاتھ سے بھی چند سطریں لکھوا کر مجھے ضرور بھجوائیے گا۔ آپ سے یہ میری مؤدبانہ گزارش ہے۔ بھائیوں کو دعا۔ اپنے ساتھ عزیزی پرشوتم کو بھی بمبئی لیتے آئیے گا۔ فقط

آپ کا
اچیوت راؤ

مطبوعات نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

لہروں کی آواز

کلکمارا کرشنا مورتی

مترجم: راج نرائن راز

"کلکئی تمل زبان کے ایک مقبول ترین قلم کار تھے اور 'لہروں کی آواز' آپ کا ایک بے حد کامیاب ناول ہے۔ قومی تاریخ کے بعض اہم اجزا اس ناول کے پس منظر کا جزو خاص ہیں اور اس میں ہماری جدوجہد آزادی کا زمانہ بھی شامل ہے۔ یہ ناول اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں بھلے ہی طویل فاصلہ ہو لیکن وہ بندھے ہوئے ہندوستانیت کی زنجیر سے ہی ہیں۔ 'لہروں کی آواز' ایک ملک گیر ناول ہے اور اس کا مطالعہ تمام ہندوستانیوں کو کرنا چاہیے۔

ص: 361 قیمت: 19=50

راگ درباری

شری لال شکل

مترجم: راشد سہوانی

جدید ہندوستانی سماج پر بے حد تیکھا طنز، شکل جی کے نشتر دل میں چبھتے ہیں راگ درباری کو ہندی میں بامقصد طنز نگاری کی شروعات بھی کہا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ ادیب کے نئے اسلوب و انداز سے متعارف کراتا ہے۔

ص: 336 قیمت: 15=50

آدمی کے روپ

یش پال

مترجم: سہیل عظیم آبادی

یش پال نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے اسی لیے انھوں نے اپنے اس ناول میں آدمی کو اس کے ہر روپ میں پیش کر دیا ہے۔

ص 296 قیمت 12=00

تاشش کے محل

پتال رنگنایکما

مترجم: زینت ساجدہ

عورت ہر دور میں ہر سماج میں دبی رہی ہے، اس لیے یہ کہانی صرف آندھرا کی عورت کی نہیں بلکہ ہندوستان کی عورت کی ہے۔

ص 128

قیمت 5=50

سفید خون

نانک سنگھ

مترجم: رتن سنگھ

پنجابی زبان کے اس ناول میں زندگی کی تلخیاں اپنی پوری سچائیوں کے ساتھ پیش کردی گئی ہیں۔ کہانی اتنی تیزی سے آگے بڑھتی ہے کہ قاری کھو کر رہ جاتا ہے

ص 200

قیمت 8=00

مٹتی بنتی تصویریں

بھگوتی چرن شرما

مترجم: رضیہ سجاد ظہیر

ہندی زبان کا وہ شاہ کار ناول جس میں ہندوستانی سماج کے بدلتے ہوئے رجحانات کی عکاسی کی گئی ہے۔

ص 308

قیمت 5=00

سورٹھ تیرا بہتا پانی

جھویر چند میگھانی

مترجم: مظہر الحق علوی

سوراشٹر کے ایک خاص حصّے کو سورٹھ کہتے ہیں، اسی حصے کی یہ داستان ہے جو اپنے اندر زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ لیے ہوئے ہے۔

ص 308

قیمت 13=00

چک ویر راجندر

شری نواس

مترجم: راشد سہسوانی

کنر زبان کے ممتاز قلم کار شری نواس کا یہ ایک تاریخی ناول ہے جو جنوبی ہندوستان کی میسور ریاست کے ایک چھوٹے سے حصّے 'کوڈگو' کی تاریخ سے متعلق ہے۔ چک ویر راجندر کے زمانے میں ہی انگریزوں نے اس پر قبضہ جمایا تھا۔ اس ناول کے سب کردار تاریخی ہیں جو اس دور کی زندگی پیش کرتے ہیں۔

ص 400

قیمت 22=50





گنگوا گنگا مائی ایک گھریلو ناول ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں لکھی جانے والی یہ کنڑ زبان کی ایک لازوال تخلیق ہے۔ معاشرتی ناول کے انداز میں لکھی جانے والی اس تخلیق میں جدید ناول نگاری کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

یہ ناول تین خاندانوں کی زندگی اور ماحول پر مرکوز ہے جس میں گنگوا، راگھیا اور دیسائی خاص کردار ہیں۔

اس ناول کے مصنف ڈاکٹر شنکر موکاشی پُنیکر، شاعر اور نقاد بھی ہیں۔ گنگوا گنگا مائی آپ کا پہلا ناول ہے۔

قیمت 14-00

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا